0314-8250376

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

پاکستان (فی پرچہ)	50 روپے
پاکستان (سالانہ)	600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات

0300-8264242

جلد	39
شمارہ	11
اکتوبر	2015

aanchalpk.com

aanchalnovel.com

naeyufaqonlinemagzine

aanchalpk.com/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

نیکی کا دیا
ریاض بٹ
126
رشتہ خوں
138
روپ بہروپ
156
مختصر فن پارے
209
فیصلہ عوام کا
230
ذوق آگہی
سباس گل
256
خوشبوئے سخن
نوشین اقبال نوشی
260
ضرب عضب
زریں قمر
264
دلی کے بانکے
مشتاق احمد قریشی
289
خط وکتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں ایسے ہی ہر سیاسی پارٹی کو اور سیاست میں دلچسپی رکھنے والے امیدواروں کو ہر انتخاب سے پہلے حکومت ہتھیانے کے سہانے خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔ الیکشن کمیشن نے بلدیاتی الیکشن کے بارے میں ابھی اعلان ہی کیا ہے کہ چھوٹے بڑے سیاسی پہلوان خم ٹھونکنے لگے اور میدان مارنے کی بھرپور تیاریوں میں لگ رہے ہیں۔ ہر کوئی پرامید ہے وہ کسی بڑی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اسے اپنی کامیابی کی سو فیصد امید نظر آ رہی ہے۔ ان میں سے اکثر کا خیال ہے چونکہ متحدہ حکمرانوں کے زیر عتاب ہے اس لیے میدان صاف ہے اور سب سے بڑی بات یا بے ایمانی سراسر بدعنوانی دھاندلی کا بول بالا ہو اس کے طفیل تو سب کچھ ممکن ہے۔

اس بار تو ہمارے محلے میں صاف ستھرائی کرنے والے دلدار مسیح نے بھی اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صاحب جی مجھ سے زیادہ اہل تو پورے شہر میں کوئی امیدوار نہیں ہو سکتا جس طرح میں آپ کے گھروں اور محلے کی صفائی کرتا ہوں اس سے بڑھ کر اور بہتر طور پر ملک میں پھیلی گند کرپشن بدعنوانی صاف کر دوں گا ویسے بھی مجھے اقلیتی سیٹ کا ٹکٹ باآسانی مل جائے گا۔ ہر کوئی یہ بات اچھی طرح جانتا مانتا ہے کہ میں کیسی صفائی کرتا ہوں یعنی میں تو براہ راست ہر روز اپنے ہنر سے آپ کی خدمت آپ کے دروازے تک پہنچ کر کرتا ہوں مجھ سے بہتر امیدوار کون، ہو سکتا ہے میرے مقابلے میں آنے والے سیاسی غیر سیاسی امیدواروں کا آپ جائزہ لیں اور ان کا سابقہ ریکارڈ دیکھ لیں وہ سب کے سب الیکشن سے پہلے پہلے تو آپ کے گھروں کے چکر بھی لگائیں گے کیونکہ انہیں صرف آپ کا ووٹ لینا جو ہوتا ہے اس کے بعد تو ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ آپ اگر کسی مصیبت کے وقت یا کسی چھوٹے سے کام کے لیے بھی انہیں تلاش کرنا چاہیں تو ان کا ملنا دوبھر ہوتا ہے اور اگر مل بھی جاتے ہیں تو ان کی مصروفیت ان کے پاؤں روکے رکھتی ہے وہ آپ کے کسی کام نہیں آتے لیکن آپ کا یہ خادم کہنے کو تو خاکروب یا جمعدار کہلاتا ہے لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ کس طرح ہر روز آپ کی خدمت کی جھاڑو لے کر آپ کے در دولت پر حاضر رہتا ہے۔ نہ صرف حاضر ہوتا ہے بلکہ آپ کی گندگی کا بھی صفایا کرتا ہے یعنی ہر روز بغیر کسی مصلحت و ہچکچاہٹ کے

آپ کی خدمت پر مامور رہتا ہے اگر آپ میری حمایت کریں تو یقین مانیں میں جس طرح آپ کے محلے کی صفائی کرتا ہوں ویسے ہی سیاست کی بھی صفائی کرسکتا ہوں۔ آپ خود فیصلہ کریں کہ یہ سیاست دان معاشرے میں کس طرح اور کیسی گند پھیلاتے ہیں۔ انہیں ذرا شرم نہیں آتی انہوں نے تو شرم کو بھی شرمانے پر مجبور کررکھا ہے۔ سیاست کو خدمت خلق کے لیے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لیے استعمال کرتے ہیں انوسٹمنٹ ہوتا ہے پھر اگر کامیاب ہوجاتے ہیں تو اپنے لگائے ہوئے یعنی خرچ کیے ہوئے سرمائے کو وہ دس یا پچاس سے ضرب دے کر وصول کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ دراصل الیکشن میں حصہ اس لیے لیتے ہیں کہ اپنے حلقے میں عزت اور ناموری حاصل ہوسکے اور پھر اس ناموری کی سیڑھی پر سیاست کی بلندی پر چڑھتے چلے جائیں اور یہی ان تمام سیاسی کھلاڑیوں کا معمول اور نظریہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے حلقہ انتخاب کی بھلائی بہتری کے لیے الیکشن میں حصہ نہیں لیتے۔ انہیں اس سے قطعی غرض نہیں ہوتی کہ ان کے حلقہ کے لوگوں کے کیا مسائل و تکالیف ہیں انہیں تو بس اس سے دلچسپی ہوتی ہے کہ کب اور کس طرح سرکار دربار میں رسائی حاصل ہوتی ہے اور کس طرح وہ سرکاری تقاریب میں مدعو کیے جاتے ہیں اس سے انہیں اس لیے دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اپنے کام ان بڑے بڑے سیاسی لوگوں سے نکلوا سکیں۔ انہیں اس سے قطعی غرض نہیں ہوتی کہ ان کے حلقے میں کیا کیا مشکلات درپیش ہیں۔ جبکہ آپ کا یہ خاکروب خادم جو ہر روز آپ کے در دولت سے اور محلے سے صفائی ستھرائی کی اپنی ذمہ داری پوری طرح سے ادا کرتا ہے۔ بالکل ایسے ہی آپ کا ہر مسئلہ ہر تکلیف کو دور کرنے کے لیے اپنی جھاڑو کو بلند کرے گا اور آپ کی گندگی کی طرح آپ کے مسائل و تکالیف کا بھی صفایا کردے گا آپ ایک بار بظاہر ان چھوٹے اور ناکنندہ خراش لوگوں کو آزما کر تو دیکھیں پھر دیکھیں کیسا انقلاب برپا ہوتا ہے ان بڑے بڑے سیاست دانوں کی خود بخود میا مر جائے گی اور وہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ اس بار بلدیاتی الیکشن میں آپ سوچ سمجھ کر اپنے ووٹ کا استعمال کریں کسی بھی قسم کے دباؤ اور تعلق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری ادا کریں اور صاف ستھرے افراد کا انتخاب کریں سیاسی لوگوں کی باتوں میں آکر دھوکہ نہ کھائیں اپنے دل و دماغ کو آلودہ نہ ہونے دیں ورنہ معاشرہ آپ کو معاف نہیں کرے گا۔

⌘

گفتگو

عمران احمد

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں ہدیئے، تحفے دیا کرو، ہدیہ سینوں کی کدورت و رنجش کو دور کر دیتا ہے اور ایک پڑوسن دوسری پڑوسن کے ہدیہ کے لیے بکری کے کھر کے ایک ٹکڑے کو بھی حقیر اور کم تر نہ سمجھے۔'' (الترمذی)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

اکتوبر کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے امید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔

جب یہ پرچہ آپ تک پہنچے گا آپ عید قرباں کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ ملک بھر میں جہاں ایک طرف مویشیوں کی منڈیاں سجی ہوئی ہیں دوسری طرف گوشت کو مہینوں محفوظ کرنے کے لیے فریج اور ڈیپ فریزر کی خریداری بھی عروج پر پہنچ چکی ہے کمپنیاں دام بڑھا کر عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو دینی عبادات بھی فیشن اور نمود و نمائش کا شکار ہو چکی ہیں۔ ہم عبادت بھی اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے بجائے اپنی امارت کے اظہار کے طور پر کرتے ہیں۔ ہماری ہر عبادت اس کی اصل روح سے خالی ہو چکی ہے۔ بس ایک ریس ہے جو لگی ہوئی ہے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ریس، اللہ رب العزت ہمیں عقل سلیم دے۔

ہمارے بعض قاری پرچے پر تبصرہ کرتے ہوئے ذرا جذباتی ہو جاتے ہیں تنقید ہر قاری کا حق ہے۔ انہیں کوئی بھی تحریر پڑھ کر اس پر ضرور تبصرہ کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات دوست تحریر پر کم اور مصنفین کی ذات پر زیادہ بات چیت کرنے لگتے ہیں۔

ہماری تمام قارئین سے درخواست ہے کہ انہیں جو تحریر پسند نہ آئے اس پر تنقید ضرور کریں، اس طرح کہ لکھنے والے پر اس تحریر کی خامیاں اجاگر ہوں لیکن ایسے الفاظ استعمال نہ کریں جس سے لکھاری کی عزت نفس متاثر ہو، امید ہے قارئین آئندہ اس کا لحاظ کریں گے۔

اب آیئے اپنے محبت ناموں کی طرف۔

(اس ماہ کا انعام یافتہ خط)

ممتاز احمد...... سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ السلام علیکم اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے آپ یقیناً بخیریت ہوں گے میں گزشتہ پندرہ سال سے نئے افق کا قاری ہوں بلاشبہ یہ ایک بہترین اور معیاری شمارہ ہے۔ پہلی دفعہ حاضری کا شرف حاصل کر رہا ہوں اگر آپ نے ویلکم کیا تو اگلے ماہ ایک عدد کہانی کے ہمراہ حاضر ہوں گا اور ان شاء اللہ پھر باقاعدگی سے حاضری ہوا کرے گی۔ ماہ ستمبر کا شمارہ بیس اگست کو مارکیٹ میں آ گیا تھا دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے بہت تلخ حقائق پر قلم اٹھایا اور ارباب اختیار کو جھنجوڑنے کی بہترین سعی کی اب تو یوں لگتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں حج اور عمرہ کے لیے امریکن ایمبیسی سے ویزہ مانگنا پڑے گا۔ اس ضمن میں ماہ اگست کے شمارہ کی دستک کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں گا محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو کہا حق کہا اور سچ کہا مگر ستمبر کے شمارہ میں پرویز احمد وولو اور عبدالغفار عابد صاحبان اس بات پر بہت برہم نظر آئے تو میں اپنے ان قابل احترام دوستوں سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کیا کسی کے ڈر سے کہ کوئی ناراض نہ ہو جائے یا کسی دنیاوی مفاد کے پیش نظر سچ بولنا چھوڑ دیا جائے کیا جیالوں کی ناراضگی کے ڈر سے حق بات کو چھپا دیا جائے برادران محترم ذرا ساڑھے چودہ سو سال پیچھے مڑ کر دیکھیں جب ہم

سب کے آقا کریم رحمت دو عالم اللہ کے محبوب نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید اور اپنی نبوت کے اعلان سے پہلے تمام اہل مکہ سے اپنی ذات کے بارے میں پوچھا تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آپ صادق اور امین ہیں تو ذرا سوچیے کہ سچ بولنے کی کتنی اہمیت ہے کیا ہمارے سیاست دان صادق اور امین ہیں؟ دستک کے بعد گفتگو میں 9 ساتھیوں کے خوب صورت خطوط جگمگا رہے تھے سب سے پہلے طاہرہ جبیں تارا صاحبہ کو بہترین خط اور پانچ سو روپے انعام جیتنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ ایم ارشد وفا صاحب نے اپنی جس بات کے بعد ایک شعر لکھا تو سچ پوچھیے اس بات سے شعر کا ذرا اور معمولی سا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ سرگوشیاں ایک بہترین کہانی تھی پسند آئی۔ ”ساتواں قتل“ دستگیر شہزاد کی عمدہ کاوش تھی پولیس کی زیادتیوں اور ناانصافیوں سے تنگ آ کر ابوسفیان نے جو کیا بہت غلط کیا مگر اس کے سات قتل کے بعد عدالت نے پولیس پر سخت ریمارکس دیے مگر ہماری پولیس پر شاید ایسے ریمارکس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تیسرا راستہ میں ریاض بٹ نے ایک ایماندار اور ذہین پولیس آفیسر کی تفتیش کا خوب صورت انجام دیا۔ دلربا کا بہت مضبوط کردار پیش کیا جس کی وجہ سے دو گناہ گار راہ راست پر آ گئے اور دو بچھڑے خاندان دوبارہ مل گئے۔ کشاف اقبال کی کہانی ”زلیخا“ بہت زبردست تھی اور ایک بہت بڑا پیغام لیے ہوئے تھی کہانی کا انجام بہت خوب صورت تھا جو اللہ پاک نے فرمادیا ہے وہی حق سچ اور اٹل ہے۔ محترم سلیم اختر صاحب ایک منجھے ہوئے لکھاری ہیں ان کی ہر کہانی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ روپ بہروپ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے تو اس وجہ سے باقی کہانیوں پر تبصرہ کی معذرت خوشبوئے سخن میں عامر زمان عامر، ریحانہ سعیدہ اور طاہرہ جبیں تارا کا کلام بہت پسند آیا دل کو چھو گیا۔ فلک شیر رحیم یار خان نے بہت عمدہ غزل لکھی آخر میں تمام پڑھنے والوں کے لیے نیک تمنائیں نیک خواہشات اور ڈھیر ساری دعائیں۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر روح کا جسم سے ناتہ جڑا رہا تو...... اللہ نگہبان۔

☆ ممتاز جی! اللہ آپ کو ہمیشہ ممتاز رکھے۔ ہم آپ کو نئے افق کے صفحات پر تمام قارئین کی طرف سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

ظہور احمد صائم...... مانگا منڈی لاہور۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ہمیشہ کی طرح جذبات کا خون کرتا ہوا ستمبر کا نئے افق ملا، میں نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ صدائے احتجاج بلند نہیں کروں گا مگر آپ کے ادارے کی طرف سے ظلم وستم کے ایسے کوڑے برسائے گئے کہ میں چاہتے ہوئے بھی اپنی آہ و فغاں نہ روک سکا۔ ہجر و وصال میں نہ بدل سکا، کوئی بھی خواب تعبیر میں نہ ڈھل سکا۔ ایک بھی شعلہ خاکستر نہ جل سکا، کوئی خوشی کا آنسو نہ نکل سکا، ہزار زخموں میں بھی کوئی بھی نہ سل سکا۔ اگر آپ میرے ساتھ صبر و تحمل کا ورلڈ کپ کھیل رہے ہیں تو کم از کم مجھے بتادیں تا کہ میں ذہنی طور پر تیار ہو جاؤں، میرا تازہ کلام آپ کے دفتر میں پڑا ہوا باسی ہوتا جا رہا ہے اور اس کی سڑاند ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود مجھ تک پہنچ رہی ہے مگر آپ کے کانوں تک جوں تک نہیں رینگتی۔ ہر ماہ نجانے کتنے ہی لکھاری نئے افق کے آسمان پر جگمگا رہے ہوتے ہیں مگر میں ہی کسی نحوست کے مارے ستارے کی طرح بھٹکتا رہتا ہوں۔ دو زانو ہو کر درخواست کرتا ہوں کہ اگر میرے آباؤ اجداد نے انجانے میں آپ کے آباؤ اجداد سے کچھ برا بھلا کر دیا ہو تو برائے مہربانی مجھے معاف فرمادیں اور میرے بزرگوں کے کیے کی سزا مجھے نہ دیں۔ مجھے شکوہ ان دوستوں سے بھی ہے جنہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اس کے بعد بھول بھی گئے کہ کوئی نئے صاحب آئے تھے جو کہ مظلومیت کی وادیوں میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔ بہرحال میں ڈھیٹ پن کی تمام قیود کو بھلاتے ہوئے اپنی غزلیں ارسال کرتا رہوں گا چاہے آپ انہیں ردی والے کو بیچ کر دفتر کا بل ادا کرلیا کریں اس طرح کم از کم مجھے اتنا احساس تو ہوگا کہ میں بھی ادب کی خدمت میں چندہ دے رہا ہوں۔ فی الحال میں خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ دیکھتے ہیں آپ کی عدالت عظمیٰ سے میرے لیے کیا فیصلہ آتا ہے، والسلام۔

☆ظہور صاحب! دھیرج سے کام لیں۔ ہمارے پاس ہزاروں خطوط آتے ہیں ان میں سے کچھ اوپر نیچے بھی ہو جاتے ہیں۔ آپ ہمت نہ ہاریں ان شاء اللہ آپ کا کلام بھی نئے افق پر چمکے گا۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی سدا مسکراتے رہو، جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، السلام علیکم خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں چند دن ہوئے شہر گیا وہاں بک اسٹال پر نئے افق کا پرچہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا ایسا پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے سرورق بڑے کمال کا تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جوبہ پر بہتر ہیں مثلاً اقرا، گفتگو، خوشبوئے سخن کہانیاں وغیرہ، یہ ایک معیاری پرچہ ہے میں اس کا بہت پرانا قاری ہوں کافی عرصہ کے بعد آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں۔ معاف کرنا آپ کا وہ پہلے سا خلوص اور نظر عنایت نہیں رہی جو پہلے تھی، بات کیا ہے؟ خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے ہم آپ سے کافی دور ہیں مگر دل میں چھپائے رہتے ہیں مقررہ تاریخ پر نئے افق کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں بشرطیکہ آپ کا تعاون میرے ساتھ رہے، خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں ہمیشہ آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی۔

☆اسلم جاوید! جی آیاں نوں۔ یہ آپ نے کس بات سے اندازہ لگا لیا کہ ہم میں پہلے جیسا خلوص نہیں رہا۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام شوق امید ہے آپ مع اپنے عملہ کے بالکل خیریت سے ہوں گے بک اسٹال پر ایک میگزین پر نظر پڑی ٹائٹل دیکھ کر سمجھا شاید خوفناک ڈائجسٹ یا ڈر ڈائجسٹ کا شمارہ ہے۔ مگر یہ کیا غور سے دیکھا تو اپنا نئے افق تھا۔ مگر یہ ٹائٹل کو کیا ہو گیا۔ ٹائٹل کے لیے یہ یوٹرن کیسے لے لیا گیا کہ اسے مذکورہ بالا جرائد کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ سینگوں والی حسینہ اور چمگادڑ رنجانے اس ٹائٹل کو کیوں بدل دیا گیا جو نئے افق کی پہچان بن گیا تھا جناب مشتاق احمد قریشی صاحب وہ زیرک ہستی ہیں جو ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں پھر جس موضوع کو چنتے ہیں تو اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں اس بار بھی جس طرح انہوں نے یہود و نصاریٰ کی ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے اس سے بہت سوں کی آنکھیں کھل جانی چاہیے۔ مگر ہم تو من حیث القوم آنکھیں موندنے کے اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ بڑے سے بڑا جھٹکا ہماری آنکھیں نہیں کھول سکتا۔ ہم نے اتنی قربانیوں سے حاصل کیے ہوئے وطن عزیز کو دولخت کیا اور ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ ہمیں آج تک پتا نہیں چلا کہ اتنے بڑے سانحہ کا ذمہ دار کون ہے اور اسے اپنے کیے کی کیا سزا ملی۔ ہم اپنے ہر معاملے میں کفار کی طرف نظریں اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ کفار ایک ملت واحدہ ہیں اور وہ کسی طور پر مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے اور ہم ہیں کہ اپنے ازلی دشمنوں سے مشاورت کرتے ہیں اللہ رب العزت ہمیں ہدایت عطا فرمائے آمین۔ عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں آپ نے ایک بہت ہی پیاری حدیث بیان فرمائی ہے اور آپ نے اپنی بات میں بھی سچ فرمایا ہے۔ اس بار طاہرہ جبیں تارا صاحبہ پانچ سو روپے کا تاج پہنے کرسئ صدارت پر براجمان ہوئیں۔ وہ واقعی اس کی حقدار تھیں ان کا تبصرہ بڑا جاندار تھا ان کی تنقید بڑی مثبت تھی عمر فاروق ارشد بھیا تو گفتگو کی جان ہیں وہ جب تشریف لاتے ہیں تو آنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ عمر فاروق ارشد بھائی یاد فرمائی کا شکریہ۔ پیارے بھائی میں تو اپنا کلام تقریباً ہر ماہ بلا ناغہ بھیجتا ہوں مگر کتنا چھپتا ہے یہ آپ کے سامنے ہے اگر سابقہ ریکارڈ ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہو گیا تو میری بے شمار غزلیں ریکارڈ میں موجود ہوں گی آپ بھی اس بات کے گواہ ہوں گے کہ بعض شاعروں کو ہر ماہ بلا ناغہ چھاپا جاتا ہے ارشد بھائی اب تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میں شاعری نہیں کرتا صرف جھک مارتا ہوں میرا کلام شاید کہنے والی کوئی بات نہیں ہوتی میری شاعری غالباً بے وزن ہوتی ہے قافیہ ردیف نام کی کوئی چیز اس میں نہیں ہوتی خیر میں تو گلہ کرنے والی طبیعت کا مالک ہی نہیں ہوں۔ یہ تو صرف آپ نے اور گزشتہ ماہ ابن مقبول جاوید احمد

صدیقی صاحب نے پوچھا تو میں یہ سب کچھ جذبات کی رو میں بہہ کر کہہ گیا۔ہم تو نئے افق کے بے لوث قاری ہیں اوردن رات اس کی ترقی کے لیے دعائیں کرتے ہیں ہمارا ایک لفظ بھی اگر نئے افق کے صفحات کی زینت نہ بنے تو ہمارے پیار و محبت میں سر مو فرق نہیں آئے گا ان شاء اللہ۔ ارشد بھائی آپ کا خط تو ہمیشہ ہی جاندار ہوتا ہے۔ جناب پرویز احمد صاحب نے خط میں اپنے نیک خیالات کا اظہار فرمایا پرویز بھائی ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی چور اپنے قدموں کے نشان نہیں چھوڑتا جس سے کھوجی کو چور کی تلاش میں مدد مل سکے محترم سلیم اختر صاحب کا خط بہت پسند آیا خط کا انداز مجھے بہت بھایا۔خط میں دوستوں کے ساتھ والہانہ گفتگو دل کو بہت بھلی لگی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ آمین۔عبدالغفار عابد صاحب بڑے اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ان کی تحریر کردہ ساری باتیں دل کو لگتی ہیں۔ منعم اصغر پہلی دفعہ اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ گفتگو میں شریک ہوئے بھائی جان ”جی آیا نوں“ اب تشریف لاتے رہیے گا۔محترم ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب حسب روایت بہت اچھا تبصرہ لائے ہیں جاوید بھائی پچھلے ماہ بھی آپ نے پوچھا کہ خوشبوئے سخن سے غائب کیوں ہوں تو اس کا جواب میں خط کے شروع میں دے چکا ہوں۔اس بار محترم ریاض بٹ صاحب گفتگو میں شریک نہیں ہوئے لیکن ان کی اس کمی کو ان کی کہانی تیسرا راستہ نے پورا کر دیا۔ریاض بٹ صاحب آپ جب بھی کہانی لکھتے ہیں کمال کرتے ہیں تیسرا راستہ میں کہانی کے آخر تک سسپنس قائم رہا میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ فرمائے اور آپ کو ایسی سبق آموز کہانیاں لکھتے رہنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے آمین۔اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے اللہ رب العزت کی ذات اقدس کے بارے میں بیان فرما کر ہمارے ایمانوں کو تازگی بخشی ہے۔ذوق آگہی کا انتخاب لاجواب اور قابل ستائش ہے۔خدائے لم یزل نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

☆ریاض حسین قمر صاحب! آپ ہمارے ان قارئین میں سے ہیں جن سے ہمارا دل سے رشتہ ہے۔آپ کے شکوئے شکایت سر آنکھوں پر شکوہ بھی وہی کرتے ہیں جن کو کچھ لگاؤ ہوتا ہے۔تنقید اپنائیت کی نشانی ہوتی ہے۔بے فکر رہیں آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔

ریحان عامر...... بورے والا ضلع وہاڑی۔ محترم مشتاق احمد قریشی، عمران احمد، اقبال بھٹی اینڈ طاہر قریشی سمیت تمام اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کی خدمت میں پر خلوص سلام نئے افق سے دیرینہ وابستگی ہے۔ نئے افق ادبی افق پر سب سے تابندہ ستارہ ہے تو بے حد مناسب رہے گا مجھ سمیت تمام اہل قلم کے لیے یہ امر باعث صد افتخار ہے کہ نئے افق کی کمان انتہائی مضبوط ادبی ہاتھوں میں ہے آج پرچہ مقبولیت اور معیار کے جس مقام پر ہے یہ بلاشبہ اسٹاف کی شبانہ روز محنت اور ادب دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔سب سے خاص بات جو نئے افق کو دور حاضر کے مقبول ترین ادبی پرچوں میں ممتاز کرتی ہے وہ ہے نئے افق کے نامور رائٹرز کی تحاریر اور پرچے کے حسن ترتیب آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ احقر کی نگارشات (افسانے) پاکستان بھر کے ادبی جرائد میں سند اشاعت سے نوازے جا چکے ہیں۔ایک عرصہ سے نئے افق سے وابستگی رہی ہے اس کے باوجود اس سے قبل نئے افق میں قلم آزمائی سے محروم رہا ہوں پہلی حاضری کے ساتھ تازہ ترین کاوش افسانہ ”کشکول“ حاضر خدمت ہے قوی امید ہے کہ زیر تحریر نئے افق کے صفحات کی زینت بنے گی حوصلہ افزائی ہوئی تو خلوص دل سے نئے افق کے لیے قلمی و علمی تعاون جاری رہے گا۔دلی دعا ہے کہ نئے افق، آنچل دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے آمین۔حجاب کی اشاعت کے لیے ایڈوانس مبارکباد قبول کیجیے بہت جلد حجاب کے لیے نگارشات ارسال کروں گی۔میری جانب سے خلوص کے گلدستے تمام رائٹرز اور جملہ قارئین کی نذر۔

عامر زمان عامر...... ڈیرہ اسماعیل خان۔ گرامی قدر محترم مشتاق احمد قریشی، عمران احمد قابل قدر اقبال بھٹی اینڈ طاہر قریشی صاحب سلام خلوص۔محترم اقبال بھٹی صاحب سب سے پہلے تو آپ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون ہوں کہ آپ نے میری اولین تحریر ”کاغذی رشتے“ کو نئے افق میں سند اشاعت سے نوازا۔ادارہ کی جانب سے مجھے کامنی

آرڈر وصول ہوگیا ہے حوصلہ افزائی اور بندہ پروری کے لیے سپاس گزار ہوں امید ہے آپ نے جو مان دیا ہے وہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔ آپ کے تعاون اور محبتوں کا ہمیشہ مقروض رہوں گا۔ نئے افق کے عمدہ پلیٹ فارم سے بے شمار نوجوان رائٹرز ابھرے جن کا شمار پاکستان کے صف اول کے رائٹرز میں ہوتا ہے ہیرا جس قدر بھی بیش قیمت کیوں نہ ہوا سے تراشنے کے لیے ایک ماہر جوہری کا نظر فن اور فن تراشی اس کی مقبولیت وشہرت کو چار چاند لگا دیتی ہے آپ کے ادارہ سے وابستگی اور نئے افق کے معتبر رائٹرز میں مجھے شمار کرنا آپ کی بلند ظرفی اور ادب پروری کی واضح مثال ہے نئے افق کے قلم قبیلے میں شامل ہونا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں ہے نامور رائٹرز کی جانب سے مبارکباد وصول کرنے کے بعد میرا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے۔ میری ادبی صلاحیتیں کاوشیں تا زیست نئے افق کے بلند معیار، مقبولیت وترقی کیلئے وقف رہیں گی۔ حسب وعدہ نئے افق کیلئے ایک عدد تازہ ترین ناولٹ ”کاغذ کی کشتی“ اور افسانہ ”پاداش“ حاضر خدمت ہے۔ قوی امید ہے کہ حسب سابق حوصلہ افزائی اور محبتوں میں اضافے ہوں گے تمام اسٹاف کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام آپ کی محبتوں کا مقروض خیر اندیش۔

☆عامر! یاد کرنے کا شکریہ کہانی کا اشاعت پر شکریہ کی ضرورت نہیں ہر اچھی تحریر اپنی سفارش خود ہوتی ہے۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ محترم مشتاق احمد قریشی، عمران، طاہر، اقبال بھٹی سمیت نئے افق کے پورے اسٹاف اور محفل گفتگو کے تمام عزیز ساتھیوں کو عبدالغفار عابد کا پرخلوص سلام قبول ہو، اس بار بھی ستمبر کا پرچہ 24 اگست کو اخبار مارکیٹ لاہور سے خریدا۔ اس محفل میں دوستوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر دل خوش ہوگیا اگر ہم نے نئے افق کے منشور کو مدنظر رکھ کر ہر سو خوشیوں کا پرچار کیا تو یہ تعداد ماہ بہ ماہ بڑھتی ہی جائے گی۔ مہذب معاشروں میں لوگ ایک دوسرے کے خلاف سخت اور اشتعال انگیز الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ نرم اور شائستہ انداز سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں اسی صورت کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں سب نہیں کچھ ادب سے بے خبر اور نثر سے ناواقف لکھاری دور حاضر کے میچور رائٹرز پر تنقید برائے تنقید کر کے سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ شہرت ایسے نہیں بلکہ تنقید برائے اصلاح سے ملتی ہے۔ بے وقوفی اور دلیری کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جو زیادہ بے وقوف ہوگا وہ اتنی ہی دلیری سے کام لے گا جبکہ عقل مند پھونک، پھونک کر قدم رکھتا آنکھیں اور کان کھلے رکھتا اور اس سے آگاہ رہنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کہے یا لکھے ہوئے پر لوگ کیا کہیں گے۔ ادب اور نثر سے ناآشنا کچھ لوگ دلیری سے تنقید برائے تنقید تو کرتے ہیں مگر اس کی وضاحت کرنے میں بعضدمی دکھاتے ہیں مثل مشہور ہے کہ ایک مصور نے شاہکار تصویر تخلیق کر کے لوگوں کی رائے جاننے کے لیے کہ جہاں غلطی ہے نشاندہی کردیں تو تصویر کو چوک میں لٹکا دیا تصویر لوگوں کی لکیروں سے بھر گئی وہ بہت پریشان ہوا کہ ایک دوست کے مشورے سے اس نے وہی تصویر دوبارہ تخلیق کر کے چوک پر لٹکا دی الفاظ تبدیل کردیے کہ تصویر میں جہاں کہیں غلطی ہے نشاندہی کر کے درست کردیں۔ اگلے دن وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ تصویر پر ایک بھی نقطہ نہیں تھا۔ یہ ہے آج کی تنقید کا آنکھوں دیکھا حال۔ کسی کی قابلیت کو حسد کی نظر سے دیکھنا، شیطانیت کے زمرے میں آتا ہے۔ اشرف المخلوقات کا ثبوت یہ نہیں بلکہ یہ کہ اگر ہم کسی منزل تک نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم اس کی حوصلہ افزائی تو کریں اگر ہم لوگوں کے دلوں میں نئے افق کا مقام چاہتے ہیں تو اس کے منشور کی قدر کرنا ہوگی۔ ابھی وقت ہے سوچنے کا، اپنے آپ کو بدلنے کا اپنی غلطیوں کی تلافی کرنے اور یہ عہد کرنے کا کہ آئندہ آپ کی وجہ سے کسی کا اعتماد نہیں ٹوٹے گا۔ کسی کا دل نہیں دکھے گا کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں آئے گا کسی کی ہنسی یا مسکراہٹ نہیں چھنے گی اور کسی کی ذات کو دکھ نہیں پہنچے گا۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ یہی مقصد حیات ہے، محبت کا دروازہ ان لوگوں کے لیے کھلتا ہے جو اپنی انا اور نفس سے منہ موڑ لیتے ہیں کہانیوں پر تبصرہ اگلے ماہ، ان شاء اللہ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی، اب اجازت۔

☆عبدالغفار صاحب! ہم آپ کے خط کے جواب میں صرف اتنا کہیں گے خوب صورت جذبات اور خیالات کا شکریہ

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ستمبر کا نئے افق آسانی سے مل گیا، ورنہ پہلے تو

کافی ہاتھ پاؤں مارنا پڑتے تھے۔ سرورق کے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہمارے مصور صاحب آج کل انتہائی خوفناک قسم کے خواب دیکھ رہے ہیں اور پھر انہیں تصویری شکل دے کر نئے افق کا ٹائٹل بنا دیتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے ویسے بھی میں اس موضوع پر ڈھول بجتے ہوئے تنگ آ گیا ہوں مگر سننے والا کوئی نہیں، محترم قریشی صاحب آپ کی دستک تحقیق و جستجو پر مشتمل تھی۔ حجاج کرام کے ساتھ یہ سب کچھ آج سے نہیں ہو رہا یہ بہت پرانی باتیں ہیں جو آج تک جاری و ساری ہیں۔ اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا فرمائے، گفتگو میں کافی نئے ساتھی شامل تھے۔ ابتدائی صفحات پر ترجمہ شدہ کہانی ہمیشہ کی طرح بہتر تھی۔ کوشش ہونی چاہیے کہ ترجمہ شدہ کہانیاں ذرا مختصر ہوں، کیونکہ طوالت کی وجہ سے یہ بور ثابت ہوتی ہیں اور ایسا زبان و بیان کے فرق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ زریں قمر نے ہمیشہ کی طرح اسلامی آزادی کی تحریکوں کے پس منظر میں لکھا بہنا کے جذبات قابل قدر ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، خلیل جبار بڑے عرصے بعد تشریف لائے ویلکم جناب۔ سلیم اختر کا ناول بڑی اٹھان میں ہے سچ کہوں تو بہت دیر بعد اس طرح کے مزاج کا ناول پڑھنے کو ملا ہے۔ ورنہ روایتی مار دھاڑ والے ناولوں نے اپنی منڈی لگا رکھی ہے۔ ریاض بٹ بھی فہرست میں موجود تھے۔ پیارے بھیا آپ ساتھ تبصرہ بھی کیا کریں۔ بہر حال کہانی اچھی تھی۔ اب بڑھتے ہیں خوشبوئے سخن کی جانب۔ یہ سلسلہ درمیان میں کچھ بہتر ہوا تھا مگر اس دفعہ ایک بہت ہی پرانی غلطی دہرادی گئی جو کہ عمر اسرار کے زمانے میں ہوا کرتی تھی تب میں سمجھتا تھا کہ شاید یہ ان کی یادداشت کا مسئلہ ہے مگر اب نوشین صاحبہ نے بھی وہی کارنامہ انجام دیا تو مجھے اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی، ریحانہ سعیدہ کی پہلے سے شائع شدہ غزل پھر جلوہ افروز تھی۔ یہ میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ اب اس مسئلے کا کیا حل ہے یہ محترم مدیر صاحب پر چھوڑتا ہوں۔ دوسری مجھے جو شکایت ہے وہ یہ کہ میری کافی غزلیں آپ کے پاس جمع ہوتی ہیں مگر چھپ نہیں رہی ہوتیں۔ اب کنفیوژن یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنا نیا کلام ارسال کریں یا نہ۔ ٹھیک ہے آپ نئے لوگوں کو موقع دیتے ہیں مگر پرانے اور مستقل لکھنے والوں کو نمائندگی بھی مستقل بنیادوں پر ملنی چاہیے۔ آخری بات اپنے انعام کے بارے میں کرنا چاہوں گا جس کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ منی آرڈر کے ذریعے بھیج دیا گیا ہے مگر آپ کے پاس تو میرا ایڈریس ہی نہیں۔ پھر شاید بے چارہ انعام کوہ قاف کے کسی جن کی طرف ارسال ہو چکا ہے۔ ہمیں انعام کی قیمت یا ملیو سے کوئی غرض نہیں ہمیں تو بس یہ اعزاز چاہیے تھا کہ ہم بھی نئے افق سے انعام یافتہ ہیں خیر قسمت کی بات ہوتی ہے نہیں ملا تو صبر سہی۔ اللہ تعالیٰ نئے افق کو کامیاب و کامران کرے تمام ساتھیوں کو سلام۔

☆ محترم عمر ارشد! آپ نے جس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات دوست دوبارہ اپنی تحریریں بھیج دیتے ہیں۔ آپ کی تحریریں محفوظ ہیں جو وقتاً فوقتاً لگتی رہیں گی۔ آپ اپنا مکمل پتا ارسال کردیں۔

پرویز احمد دولو...... میاں چنوں۔ سلام مسنون، اپنوں کی چاہت سے سجی محفل کا ممبر دار نئے افق ملا تو کتنے ہی پیاروں سے ملاقات کر کے دل خوشی سے نہال ہو گیا۔ اخلاق کے گلدانوں میں سے محبت کے پھول، جنہوں نے اپنی مہکار سے پوری محفل کو زعفران بنا رکھا ہے کتنے ہی راہیوں کو دو چار لمحوں کے لیے ستانے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے افق معیار کی بنا پر شہرت کی معراج پر براجمان ہے صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایڑیاں اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ ہر ماہ لاکھوں قارئین دیدار کے لیے چشم براہ ہوتے ہیں۔ رسائل کی ناموری نئے افق سے شروع ہوتی ہے۔ عزت، دولت، عظمت اور شہرت کی اوج ثریا کے محل میں موجود مسند پر رونق افروز ہونے کے باوجود عملے کی عاجزی، انکساری اور محبت دنیا کا کوئی بھی ترازو ناپ تول کرنے سے عاجز ہے۔ نئے افق وہ پرچہ ہے جس کو پڑھنا لوگ اعزاز سمجھتے ہیں جس ہاتھ میں ہو دیکھنے والا عقیدت سے اس کو ادب کا بہت بڑا جوہری سمجھتا ہے۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی قارئین سے محبت کی انتہا ہے کہ جذبات کی رو میں بہہ کر تلخ بات کہنے والے کو بھی سینے سے لگاتے ہیں قارئین کو اس خزانے کا اثاثہ سمجھتے ہیں۔ زیادتی والی باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ اس محفل کے اندر خوشی کے قمقمے سجانے والے

جناب اقبال بھٹی کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مہمانوں کے استقبال کا سارا انتظام ان کے ذمہ ہے۔ جس مہمان کو بھی آگے بڑھ کر استقبال کے بہانے گلے لگا کر ملتے ہیں۔ برسوں کی شناسائی چھلکتی ہے ان کے رویے سے اس ماہ کا پرچہ بھی بروقت مل گیا۔ سرورق کی حسینہ نے ڈرانے کی بہت کوشش کی۔ بچھو، سانپ، چیل کے سہارے دھمکانے کی کوشش کی مگر میں پینڈو ہوں ان چیزوں سے ہم لوگ بچپن سے ہی کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ محترمہ کا یہ وار خالی گیا۔ تنقید، تعریف اور تجاویز پر مبنی خطوط پڑھ کر دل رنجیدہ اور خوش ہونے کے بعد اعتدال پر آ گیا۔ طاہرہ جبیں تارا کو جناب طاہر قریشی کی اقرا اور اور ڈاکٹر ایم اے قریشی کی ''کیچڑ کا کنول'' کے علاوہ ہر تحریر بے ربط اور فضول لگی۔ جناب امجد جاوید اور جناب سلیم اختر جیسے ادب کے درخشاں ستاروں کو روندتی چلی گئیں۔ اس تنقید سے حسد کی آگ میں جلنے کی بو آ رہی تھی بھائی اشفاق شاہین کی تجویز بہت پسند آئی اور ایک گزارش میری بھی نوٹ کر لیں اشعار کے لیے دو صفحات مختص ہو جائیں تو ممنون ہوں گا۔ ارشد وفا کا شعر ایسے معنی دے رہا تھا جیسے شادی والے گھر مزارع آ کر کہے مکئی کا بیج کہاں رکھا ہے۔ اگر یہ شعر ہوتا تو شاید زیادہ خوب صورت لگتا۔ اب جس کے جی میں آئے وہ پائے روشنی، ہم نے تو دل جلا کر سر راہ رکھ دیا۔ بھائی فلک شیر ملک کا ممنون ہوں۔ عامر زمان عامر سے گزارش ہے کہ وہ بہت بڑے ادیب ہیں اور شاگردوں کی ایک فوج ان کے علم سے مستفید ہو رہی ہیں۔ میں دریائے راوی کے کنارے سارا دن تربوزوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں اور راوی کی لہروں سے اصلاح لیتا ہوں میری تحریر بھی انہی صفحات کی زینت بنی ہے جہاں ان کی تحریر شائع ہوئی ہے اگر تم مجھ کو لکھاری نہ مانو تو میں کیا کروں، لوگ تو بڑے بڑے مفکرین کی صرف حسد کی وجہ سے ہرزہ سرائی کرتے ہیں لیکن ان کی شہرت کے چمکتے سورج میں اور تمازت آ جاتی ہے۔ جناب طاہر قریشی صاحب اگر ہم سچے مسلمان پکے پاکستانی اور علامہ اقبالؒ کی سوچ۔ ''ایک ہوں حرم کی پاسبانی کے لیے'' کے ترجمان بن جائیں تو پوری دنیا میں ہمارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا جناب ایم اے قریشی کی سرگوشیاں ہو جو کی ترقی تنزلی کی داستان تھی۔ خلیل جبار کی رقابت میں صفحہ 49 پر ایک بچی کا باپ ہے جبکہ 55 پر نامرد ہے۔ مہر افروز کی بھاگنی اس ماہ کی سر سید تحریر ہے ڈھیروں مبارکباد یں قبول فرمائیں۔ تیسرا راستہ اور زلیخا ریاض بٹ اور کشاف اقبال کی پاکیزگی کا منہ بولتی تصاویر تھیں۔ جناب اقبال بھٹی صاحب انصاف ایسے کیا جاتا ہے جیسے آپ نے کیا ہے۔ پرچہ پوری توجہ سے پڑھا ہر قسم کے مزاج کے قارئین کے ذوق کے عین مطابق تھا۔ تھوڑی بہت کسر جو رہ گئی ہے وہ دور کرنے کے لیے ہم آپ کو مجبور کر دیں گے۔ جناب قریشی صاحب نئے افق ہمارا پرچہ ہے اس کو سجانا، سنوارنا اور تحریروں کو معطر کر کے اس کے صفحات کو مہکانا ہمارا کام ہے آپ کا کام بروقت شائع کر کے ہم تک پہنچانا ہے۔

☆ پرویز صاحب! خوش آمدید، تنقید کو اگر آپ مثبت لیں تو اس سے آپ کے فن کو جلا ملے گی اس کا کبھی برا نہ مانیں، ہم بھی نہیں مناتے۔ نئے افق آپ کو پسند آ رہا ہے اس کا شکریہ۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ ستمبر کا نئے افق پڑھ لیا ہے بلکہ لفظ بہ لفظ رٹ لیا ہے۔ ٹائٹل کے علاوہ باقی سب کچھ زبردست ہے۔ سرورق جاذب نظر ہونا چاہیے۔ اسپشلی آنکھیں نشیلی ہوں، گھنی پلکیں، لمبی گردن، سر کے بال جوڑے کی شکل میں ہوں، دستک میں قریشی صاحب نے سارا زور حج پالیسی بہتر بنانے پر لگا دیا ہے جب اللہ کی رحمت اور رہنمائی ہوگی یہ مسائل حل نہیں ہوں گے۔ گفتگو میں طاہرہ جبیں تارا کا تبصرہ جاندار تھا۔ سلیم اختر اور عبدالغفار عابد کے خیالات بھی اچھے لگے۔ اقرا میں طاہر قریشی نے اللہ پاک کی واحدانیت پر بڑی واضح دلیلیں پیش کی ہیں جو قابل ستائش ہے۔ رب کبریا وحدہ لاشریک ہے جو سارے نظام کو اکیلا چلا رہا ہے۔ ایم اے قریشی کی سرگوشیاں اچھی تحریر ہے۔ ایک کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی رنگین مزاجیوں کو بڑے دلفریب انداز میں پیش کیا گیا۔ خلیل جبار کی رقابت ایک سبق آموز کہانی تھی بعض دفعہ اندھا اعتماد لے ڈوبتا ہے اور پھر بندہ پچھتاووں کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ دستگیر شہزاد کی ساتواں قتل پولیس کی چیرہ دستیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس نے ایک مزدور انسان کو قاتل بنا ڈالا۔ چھوٹی مگر پر تاثیر تحریر تھی۔ شاہد جمیل

احمد کی زندگی بڑی انمول ہے نئے علوم، جنسیات، نفسیات وغیرہ وغیرہ لیکچرز اور تعارف یعنی انٹرویو کی شکل میں روشناس کرائے گئے ہیں ایک معلوماتی اور دلچسپ تحریر تھی۔ ریاض بٹ نے نیسرا راستہ لکھ کر ہماری آنکھیں کھول دیں۔ آج کل اولاد پر حد سے زیادہ سختی کرنا مہنگا پڑتا ہے انداز اچھا تھا دل کو لگا۔ مہر افروز کی پھانگنی نے بہت متاثر کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اچھے دن آئیں تو برے وقت کی بھی امید رکھو۔ اٹھائیس انتیس صفحوں پر مشتمل روپ بہروپ کی دوسری قسط بھی اچھی رہی، خاص کر جہانزیب، جہانو نے رام وتی کو اپنی بہن بنالیا اور اس کے گھر پہنچا کر دل جیت لیا ایک مسلمان کا ہندو لڑکی کو بہن بنانا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ کشاف اقبال نے زلیخا پیش کی۔ حضرت یوسف اور زلیخا کا واقعہ یاد آ گیا۔ آج کل کے نوجوانوں کے لیے لحہ فکر یہ ہے اگر سب عارض کی طرح بن جائیں با کردار تو معاشرے سے بہت سی برائیاں ختم ہو جائیں۔ بنت غزہ میں زریں قمر نے خوب صورت انداز اپنایا حسین ابو القدیر اور نیوال کے کردار چھا گئے۔ الماس ایم اے نے فلسطین کا اینڈ کر دیا بڑا اچھا سلسلہ تھا۔ میری آنکھیں اس وقت نم ہو گئیں جب دیوار براق اور روضہ سلیمان کے بارے پڑھا۔ یہ مقدس مقامات مسلمانوں کی میراث ہیں۔ جس پر یہودی قبضہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ فتح اسلام کی ہی ہوگی۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن کے صفحات کو وسعت دینے پر نوازش کرم شکریہ، مہربانی، ماں تو ماں ہوتی ہے۔ خواہ وزیر اعلیٰ کی ہو یا فقیر اعلیٰ کی اور باپ تو باپ ہوتا ہے خواہ وزیر کا ہو یا فقیر کا۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے تو باپ جنت کا دروازہ ہے۔ ذوق آگہی میں جویریہ سلیم کے انعام یافتہ ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور خوشبوئے سخن میں فرخ بھٹو کو بھی مبارک ہو اچھا کلام تھا۔ شمارے میں کچھ غلطیاں تھیں۔ پرنٹنگ کے شعبے میں خاص کر دھیان دیں مثلاً (اوزوں کی چادر) کو زمین کی چادر چھاپ دیا گیا۔ میں نیا نیا لکھنے لگا ہوں، ایک تحریر بھیجی تھی خالی ہاتھ کے عنوان سے آپ بابائے ادب ہیں۔ کہانی کی ڈینٹنگ، پینٹنگ کر کے اور نوک پلک سنوار کر شائع کر دیں تو حوصلہ افزائی ہوگی اور ہاں 6 ستمبر 1965ء کے شہدا کرام کو نہ بھولنا ان کے درجات کی بلندی کے لیے خصوصی دعا کا اہتمام ہونا چاہیے۔ تمام افراد خصوصاً مدیر اعلیٰ اور مدیر کا خصوصی شکریہ اور سلام۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم، ماہ ستمبر 2015ء کا شمارہ نگاہوں کے سامنے ہے جب بھی ستمبر کا مہینہ آتا ہے ہمیں اپنے ان شہیدوں کی یاد آ جاتی ہے، جنہوں نے وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کی قربانی دی تھی دشمن ہم سے کئی گناہ زیادہ طاقت ور تھا فوجی اور اسلحہ کے لحاظ سے۔ لیکن ہماری بہادر افواج نے ان کو شکست دے کر ان کے ناپاک ارادے خاک میں ملا دیے تھے جو پاکستان کو ختم کرنے آئے تھے ان کو اپنے ہی خون میں نہلا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جنگ جذبوں سے جیتی جاتی ہے نہ کہ فوجی طاقت سے آج دکھ اور افسوس اس بات کا ہے کہ ہم انڈیا کا کلچر اپنا رہے ہیں ان کے ڈرامے دیکھ رہے ہیں۔ بھارت کا یہ حال ہے کہ ایک طرف مذاکرات کا روگ الاپ رہا ہے جبکہ دوسری طرف سرحدوں پر بلا اشتعال فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ اسے کہتے ہیں بغل میں چھری منہ میں رام رام۔ بہر حال بوجھل دل لیے آگے بڑھتے ہیں۔ عمران احمد صاحب گفتگو کی محفل سجائے بیٹھے ہیں۔ رنگ برنگے پھول (خطوط) اپنی خوشبو بکھیر رہے ہیں اس ماہ کا بہترین خط طاہرہ جبیں تارا کا ہے، بہن اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر آپ نے خط لکھا جو آپ کی نئے افق سے محبت دلچسپی اور لگاوٹ کو ظاہر کرتا ہے بڑا مدلل اور خوب صورت لفظوں کی مالا سے بنا خط ہے آپ کے خیالات ارفع ہیں۔ آپ کی تنقید برائے اصلاح ہے اور ہمارے پیارے رسالے کو مزید نکھارنے کے لیے ہے۔ عمر فاروق ارشد بھائی حسب معمول آپ کا خط کھٹی میٹھی باتوں سے مزین ہے آپ کی باتیں دل کو لگتی ہیں۔ صاف گوئی ایک اچھی عادت ہے۔ آپ کے جذبات احساسات قابل تعریف و توصیف ہیں۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ پرویز احمد دولو بھائی میں آپ کو پرانا جانتا ہوں آپ آداب عرض والے ہی ہیں جہاں آپ خوب صورت تبصرہ اور نا قابل فراموش واقعات بھیجتے تھے جواب ضرور دیجیے گا (کہیں مجھے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو رہی) بہر حال آپ کا خط اور تبصرہ بھی سندر اور گہرائی لیے ہوئے ہے۔ بھائی

سلیم اختر صاحب میری حوصلہ افزائی کرنے کا بے حد شکریہ اور میں جناب عمران احمد صاحب کا بھی انتہائی ممنون ہوں جو مجھے اتنی عزت دیتے ہیں۔ میری کہانیوں کو پذیرائی دیتے ہیں انہیں پرچے کی زینت بناتے ہیں سلیم اختر بھائی آپ ایک کہنہ مشق لکھاری ہیں آپ کی قسط وار کہانی روپ بہروپ بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ عبدالغفار عابد اور منعم اصغر خوش آمدید، اب آتے رہیے گا۔ اشفاق شاہین صاحب آپ کے خطوط کا بھی ہمیں انتظار رہتا ہے۔ خوش رہیں اور اس محفل کی رونق بڑھاتے رہیں۔ عامر زمان عامر اور فلک شیر ملک کے خطوط بھی اچھے ہیں۔ اب بات کرتے ہیں جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب سے۔ بھائی آپ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں مجھے یاد رکھتے ہیں میرے لیے دعا گو رہتے ہیں جس سے ایک تو میرا خون سیروں میں تو نہیں چھٹانکوں میں ضرور بڑھ جاتا ہے اور میں انار کے خرچے سے بچ جاتا ہوں اور دوسرے آپ کی وجہ سے میں اپنی بیماری کو بھول جاتا ہوں۔ سدا خوش رہیے ایم ارشد وفا آپ نے بھی مجھے یاد رکھا، میری حوصلہ افزائی کی جس کے لیے میں شکریہ ہی ادا کرسکتا ہوں محفل سے غیر حاضر نہ ہوئیے گا۔ چھ ماہ بعد میرا انتخاب ذوق آگہی کی زینت بنا جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے بات ہوجائے سلیم اختر بھائی کی کہانی روپ بہروپ کی۔ اس بار کی قسط بھی جاندار ہے۔ خلیل جبار کی رقابت بھی ایک اچھی کہانی ہے جو لوگ وقت پر صحیح فیصلے کرتے ہیں ان کا انجام زیبو کے شوہر جیسا ہی ہوتا ہے۔ ساتواں قتل ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ناانصافی کی وجہ سے مجرم بنا۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں اس لیے ان پر تبصرہ نہیں کرسکتا۔ اب بات ہوجائے باقی سلسلوں کی۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب امریکہ کی پاکستان میں داخل اندازی کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ امریکہ کی تو ہر معاملے میں دخل اندازی ہے۔ وہ پاکستان کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتا۔ صفحہ بہ صفحہ بکھری کترنیں بھی پرچے کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث ہیں۔ ذوق آگہی میں جویریہ سلیم کا انتخاب واقعی انعام کے قابل ہے۔ ماں کے متعلق یہ شعر بھی ہے۔

خالق کو اپنی خلق سے الفت تھی اس لیے
جنت اتار ڈالی ہے ماؤں کے روپ میں

فلک شیر ملک کی حکمت سے متعلق معلومات بھی غور کے قابل ہیں۔ جاوید احمد صدیقی بھائی کا شگفتہ پیرائے میں لکھا ہوا واقعی سوٹ بھی لاجواب ہے۔ اب آخر میں اپنی کہانی تیسر اراستہ کے متعلق ایک وضاحت کردوں، دلربا کی شادی آخر میں دلدار سے ہوگئی تھی۔ یعنی اس کے کزن سے جس کے ساتھ پہلے منگنی ہو کر ٹوٹ گئی تھی۔ پرچے میں غلطی سے ولاور چھپ گیا ہے تصحیح کرلیں۔

اشفاق شاہین...... کراچی۔ رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ تفریحی رسالہ نئے افق کا تازہ شمارہ اس ماہ کچھ تاخیر سے کچھ دیر اخبار والے نے کی اور اب کچھ میری طرف سے اللہ کرے کہ یہ خط بروقت پہنچ جائے۔ سرورق اچھا رہا' دستک اچھی رہی ہاں کچھ دوستوں نے ٹھیک کہا ہے کہ کرپشن میں سارے ملوث ہیں۔ ایسے میں کسی کا نام لینا ٹھیک نہیں۔ گفتگو میں پہنچے جہاں طاہرہ جبیں تارہ انعامی خط کے ساتھ کرسی صدارت پر، بہت جچ رہی تھیں گڈ، عمر فاروق ارشد، پرویز دولو، علیم اختر کے خط بھی خوب صورت تھے۔ عبدالغفار تم نے اپنے خیالات کا اظہار احسن طریقے سے کیا۔ ویری گڈ اور خوش آمدید۔ منعم اصغر خوش آمدید اب آتے رہیے گا۔ عامر زمان عامر کا خط بھی انعامی ہونا چاہیے تھا گڈ فلک شیر جی آیا نوں، ابن مقبول اور ارشد وفا آپ کی آمد بھی خوب رہی۔ آتے ہیں تبصرے کی طرف ایم اے قریشی کی سرگوشیاں نے خوب محظوظ کیا واقعی کبھی علم ہونا بھی کئی معاملات کھڑے کردیتا ہے۔ انجام بہرحال مناسب تھا خلیل جبار کی رقابت بہت خوب رہی۔ ساتواں قتل کوئی خاص متاثر نہیں کرسکا۔ زندگی تو ہمارے اوپر اوپر سے گزر گئی۔ "تیسر اراستہ" ریاض بٹ نے ٹھیک ہی لکھا لیکن زیادہ دلچسپ اور سسپنس فل نہیں تھا۔ مہر افروز کی پھانگنی اس ماہ کی سب سے خوب صورت تحریر لگی۔ ویری گڈ مہر افروز۔ روپ بہروپ بھی زبردست جارہا ہے گڈ لیکن منشیات کا غائب ہوجانا یہ کچھ ہضم نہیں ہورہا۔ زلیخا خوب رہی خیالی لگی۔ بنت

غزہ اور فلسطین مجھے تو پسند نہیں بالکل۔ اچھا ہوا اس کا بھی اختتام ہو گیا۔ اقبال بھٹی کا انصاف خوب تر تھا۔ ذوق آگہی میں ہمارے نام کو شاہین کے بجائے حسن کردیا گیا۔ یہ غلطی کیوں ہوئی۔ سپاس گل گڈ، نوشین اقبال نوشی خوشبوئے سخن میں بہترین انتخاب لے کر آئی ہیں۔ خصوصاً فرح بھٹو کی غزل اور مریم جہانگیر کی نظم۔ تمام دوستوں کو عیدالاضحیٰ کی خوشیاں مبارک ہو۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی وا قبال بھٹی۔ السلام علیکم! اچھے سے ٹائٹل والا نئے افق نئی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ ہر ماہ آپ کی کاوشیں رنگ لا رہی ہیں اور مختلف شعبہ جات میں اچھی خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ پہلے تو بتائیں حسام بٹ کیوں غیر حاضر تھے، ان کی غیر موجودگی ہرگز برداشت نہ ہوگی۔ گفتگو میں حسام بٹ کی پامسٹری کے اردگرد گھومتی کہانیوں پر بڑا تبصرہ کیا گیا ہے ایک کہانی ایک داستان کے حساب سے تو پھر بھی برداشت کی گئی ہے مگر پامسٹری پر جو مذہب کے لحاظ سے کہا گیا ہے۔ بھئی یہ سب صحیح ہے ہمارا ایمان ہی یہی ہے لیکن داستان اور وہ بھی معاشرے کی اصلاحی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے ایک اچھا سلسلہ ہے۔ کیا میں یہ سوال پوچھ سکتا ہوں کہ بے تحاشہ میگزین میں روزانہ، ہفتہ وار، ماہانہ اور پورے اگلے سال کا پامسٹری کے حوالے سے تفصیلات آتی رہتی ہیں آپ میں سے کس نے ایسے خط ان میگزین میں شائع کرائے ہیں، ثبوت دیں۔ اور ساتھ ہی پامسٹری کی ان گنت کتب مارکیٹ میں ہیں۔ ان پبلشرز کے نام بھی خط لکھیں اور یہ سب کہہ دیں، میں ہرگز اس کے لیے جائز نہیں کہوں گا۔ مگر ذرا انداز تو بدلیں۔ کیا نئے افق میں بھی ایسی کہانی پر اعتراض ہوسکتا ہے کیوں؟ عمران جی صرف نئے افق کی نئی آن بان سے۔ بہت لوگ جلتے ہیں اور اس کی ترقی ہضم نہیں ہو رہی۔ میں نے اپنے دل کی بات لکھ دی ہے۔ دل آزاری ہرگز مقصد نہیں بلکہ حقیقت کو کھلے دل کے ساتھ تسلیم کرنا سیکھیں۔ گفتگو میں خطوط میں تبصرے اچھے کیے گئے۔ محترمہ تارہ کو مبارکباد۔ حالانکہ انہوں نے مجھے جھوٹے منہ بھی مبارک نہ دی تھی۔ یہ کھلا تضاد نہیں تو اور کیا ہے۔ عمر فاروق ارشد خوب لکھا ہے اور قدیر رانا پر تو آپ نے تو پیں ہی چھوڑ دی ہیں۔ تبصرہ بے حد اچھا تھا یاد کرنے کا شکریہ۔ جناب سلیم اختر جی کیا تبصرہ زبردست تھا۔ میر اذکر ہوا اس کے لیے بڑا ممنون ہوں ایسے ہی خیالات اور جذبات میرے آپ کے لیے ہیں اور آپ کو بحیثیت رائٹر مانے ہوئے ہیں اور قسط وار کہانی نے تو دل موہ لیے ہیں زبردستی جیسے عبدالغفار عابد جی نے آپ کے ناول پر تبصرہ کیا ہے میں ان سے سو فیصد متفق ہوں۔ منعم اصغر کی موجودگی اچھی لگی آگے سے ذرا تفصیلاً آیا کریں جی۔ اشفاق شاہین یہ گفتگو کا سلسلہ ایک علیحدہ کام کے ہی برابر ہے آپ ضرور آئیں تحسین سے یا تنقید سے اس کا دائرہ کار محترم مدیر صاحب جواب میں لکھ چکے ہیں۔ عامر زمان عامر جی زبردست تبصرے کے ساتھ آئے ہیں اور تجزیہ بھی اچھا کیا ہے۔ افسانہ کہانی نہیں سسپنس کی ضرورت اور اس کی تشریح آپ نے خوب کی ہے۔ اسی طرح ملک شیر محمد کے بھی خوب صورت طویل اور حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرہ لکھا ہے۔ کاش یہی کہہ کر رہ جاتے ہیں فلسطین کے لیے یاسر عرفات جیسا دلیر مجاہد آئے آمین۔ ایم ارشد وفا نے تبصرہ میں خوب وفا کی ہے کاش مسلمان آپ کی لکھی ہوئی حدیث شریف پر بھی صحیح عمل پیرا ہو دکھائیں آمین ثم آمین۔ محترم کارکن جناب مبارک احمد کو اللہ غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے آمین۔ دستک تو چشم کشا ثابت ہوا اور بہت سی سوچوں کے در وا کر گیا اقرا تو طاہر صاحب کو جزاک اللہ انتہائی زبردست موضوع ہے۔ سرگوشیاں پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہمارے کہنہ مشق اور صحیح لکھنے والے تو اب آئے ہیں۔ قریشی صاحب کی کہانی شروع کرو اور پھر آخر تک بندھا ہوا قاری ختم کر کے ہی اٹھتا ہے۔ یہ اور حسام بٹ ہمارے لیے سرمایہ ہیں ادب کے۔ انتہائی خوب صورت اور سائنٹیفک فکشنز تھا۔ رقابت بس اچھی کہانی رہی۔ نازک موضوع تھا اور عام طرح سے نپٹایا گیا تھا ساتواں قتل نے کچھ مزہ نہ دیا بے حد جلدی میں کہانی کو نمٹایا گیا تھا۔ زندگی تو پیور سائنسی کہانی ہے جس کا بیک گراؤنڈ سائنس ہے وہی صحیح سمجھ کر پڑھے گا انوکھی اور زبردست رہی۔ آخر میں چوکھٹے میں تمام وضاحتیں اور کام کی تفصیل اور بھی بے حد اچھی معلومات دے گئی۔ تیسرا راستہ تو بے

حد اچھا رہا۔ ریاض جی تو ہمارے دل موہ لینے والے رائٹر ہیں اور نئے افق کے سرمایہ۔ پھاگنی روایتی اور ماورائی سی کہانی ہے دونوں میں رنگ وروپ ذات پات کا اتنا تضاد لے کر کہانی لکھنا مصنف کی کمزوری ہے۔ اس سے تو اچھا تھا ماورائی سی کہانی لکھ دیتے۔ زلیخا آج کل کی سچ بیانی ہے اور مضبوط لوگ راہوں سے بھٹکتے نہیں۔ ویری گڈ، بنت غزہ تو لاجواب رہی اور بھٹی صاحب کی انصاف نے آکر ہمیں چونکا دیا زبردست جناب فلسطین ختم مگر دل اداس۔ کوٹیشن میں چیٹر بے حد اچھی تھی میری عبرت ناک لگانے کا بے حد شکریہ۔ خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی میں انعام یافتہ کو مبارک باد۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت اللہ حافظ۔

ناز سلوش نشے ...... میر پور، آزاد کشمیر۔ محترم عمران بھیا تسلیمات، امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے یاد تو نہیں مگر عرصہ ہوا نئے افق کے افق سے غائب ہوں جیسے 2005ء میں ناز سلوش ذشے نام سے ایک نیا جنم لینے والی میں محض دو سال بعد 2007ء میں نئے افق کے پلیٹ فارم سے رائٹنگ کی فیلڈ میں قدم رکھنے والی میں یعنی ان گزرے دس سالوں میں سے آٹھ سال خود پر محنت کرکے خود کو بلڈ اپ کرکے ہر ناممکن کو ممکن بنانے والی، ہر چیز پر دسترس رکھنے والی میں نجانے کیوں گزرے ان دو سالوں میں ہر چیز سے ہار گئی ہوں نہیں ہار تو شکست کی علامت ہے اور شکست میں کبھی تسلیم نہیں کرتی، بس یہ کہنا بجا ہوگا کہ ذرا تھک گئی ہوں، معاشرے سے اس میں بستے بہروپ لوگوں سے وعدہ خلاف رشتوں سے لڑتے لڑتے ہمت جواب دینے لگی ہے۔ خدا کی قسم اگر پری کا وجود میری ذات سے وابستہ نہ ہوتا تو نجانے کب کی منوں مٹی اوڑھ کر سو جاتی۔ مگر اس ننھی منی گڑیا کی ہنسی، اس کے ننھے ننھے کھیل مجھے اس کی خاطر جینے کا حوصلہ دیتے ہیں آنسو پلکوں کی باڑ تک آتے ہیں اور دم توڑ جاتے ہیں کہ ابھی تو پری نے ٹھیک سے ماما کہنا بھی نہیں سیکھا، سچ کہتے ہیں ''شادی وہ لڈو ہے جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔'' اگر مجھ سے پوچھا جائے تو نہ کھا کر پچھتانا زیادہ بہتر ہے۔ خیر انسان دکھوں کی آماجگاہ ہے نجانے خوش رہنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟ پچھلے اگست سے اس اگست کے دوران یہ کشمیر کی طرف میرا کراچی سے تیسرا چکر ہے اور شادی کے بعد یہ اکثر ہونے لگا ہے کہ میں یہاں آنے کے بعد ہی نئے افق میں لکھ پاتی ہوں شاید یہاں کی ہوا مجھے سکون دیتی ہے میرے گھر کی چھت سے دکھتا منگلا ڈیم میرے دکھوں کو کم کرتا ہے، میرے ٹیرس پر رکھے پودوں کے پتے جب ہوا سے سرسراتے ہیں تو ہاتھ بے خود ہو کر قلم کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ یہ فیکٹ ہے کشمیر کی فضا میں عجیب سا سکون ہے، 5 اگست کو جب صبح 7 بجے میرے جہاز نے کراچی سے ٹیک آف کیا تو روح میں بے چینی تھی، نہ وہاں کی لطیف ہوا نے مجھے سکون دیا نہ لوگوں کا ہجوم میرے اندر کی اتھل پتھل کو کم کرسکا، ہاں مگر جیسے ہی گاڑی دریائے جہلم کو عبور کرکے کشمیر کی حدود میں داخل ہوئی ٹھنڈی ہوا نے اندر تک سکون اتار دیا۔ ہاں مجھے افسوس ہے میں آتے سے محترمہ شہناز بانو سے ملاقات نہیں کرسکی عید کے تیسرے روز میں گھر سے تیار ہو کر نکلی تھی مگر چھوٹا گیٹ کے پاس سے واپس آنا پڑا تھا کیونکہ گزشتہ روز کی بارش کی وجہ سے آگے ملیر تک جانے والے رستے بند تھے سوروڈ اور گلیوں میں جمع پانی کی وجہ سے میں گاڑی میں تیرتی صد افسوس کے ساتھ واپس گھر ہولی تھی۔ ہاں اگر آپ نئے افق کی یہ سطر پڑھ رہی ہوں تو دعا کیجیے گا میرے حق میں بہتر ہو، میں نے تو عرصہ ہوا اپنے لیے ہاتھ اٹھانے ہی چھوڑ دیے کراچی والوں نے میرا سب کچھ چھین لیا مجھ سے۔ چونکہ ایک عرصے بعد نئے افق نظر سے گزرا ہے اور بوجہ مجبوری وحالات میں تقریباً فارغ ہی ہوں تو دن رات رسالہ ہاتھ میں ہوتا ہے یوں لگتا ہے جیسے کھویا ہوا دوست مل گیا ہو اور کیوں نہ ہو اس نے تو ہمیں ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھایا اور اس جگہ لا کھڑا کیا کہ آپ ہم کچھ ہیں اور پر سے چاہے معاشرتی ظلم وستم کا شکار رہے ہوں مگر اندر سے تو وہ ہنر وہ صلاحیتیں اب بھی باقی ہیں۔ ستمبر کا شمارہ ابھی موصول نہیں ہوا البتہ اگست کا پڑھ چکی ہوں سو تبصرہ اسی کو لے کر کروں گی بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ جو نئے افق کے لیے سود مند ثابت ہوں گی۔ جیسے ٹائٹل میں تبدیلی ونکھار، منتخب خطوط و تحاریر کے لیے انعامات خاکہ جات وغیرہ، مشتاق انکل کی دستک کے جواب میں کچھ نہیں لکھ سکتی کیونکہ میں جب سے گھریلو

سیاست کا شکار ہوئی ہوں تب سے ملکی سیاست کے بارے میں خبر رکھنا چھوڑ دی ہے۔ سب ہی ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور اس سے زیادہ ہماری شامت اعمال۔ گفتگو میں عمران بھیا کے ابتدائی الفاظ پر کچھ کہنا چاہوں گی اگر کراچی اور دیگر علاقوں کے حالات و اموات عذاب الٰہی ہیں تو اس عذاب کو دعوت بھی ہم خود دیتے ہیں ہمارا حال تو اس قوم سے بھی بدتر ہے جو راتوں کو گناہ کرتے ہیں اور صبح اٹھ کر توبہ...... حکومت پر کیا بحث کرنی، 18,20 کروڑ عوام کو سنبھالتے سنبھالتے بچاری خود پاگل ہوئے جا رہی ہے۔ میں دو اگست کا واقعہ بیان کرنا چاہوں گی۔ کیماڑی سے واپسی پر ڈرگ روڈ جنکشن کے سامنے شاہراہ فیصل پر کچھ لوگوں نے دونوں اطراف بند کر رکھے تھے وجہ جان کر روح کانپ اٹھی کہ کسی منکر خدا نے قرآن پاک کے صفحات کچرے میں پھینک دیے تھے جو وہاں کے مقامی افراد نے اٹھائے اور دھونے کے بعد یہ احتجاج کیا جو شاید دو اگست کے تمام نیوز چینلو کا حصہ بنا اس کے بعد بھی کوئی کسر باقی ہے کہ ہم پر عذاب نازل نہ ہو؟ گفتگو میں پانچ خطوط دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ عرصہ قبل 25,20 خطوط ایک نارمل سی بات تھی خیر نام بھی جانے پہچانے تھے جن میں مقبول انکل، ریاض بٹ صاحب اور ریحانہ سعیدہ میرے سات سال پرانے ساتھی نکلے۔ سب کو سلام اور دعا، کہانیوں کا معیار (قسط وار ناولز کو چھوڑ کر کہ وہ ابھی مطالعہ نہیں کیے) بھی بہت اچھا رہا۔ جیسے عروس آزادی، کیچڑ کا کنول وغیرہ فلسطین ناول سے زیادہ ہسٹری کا کوئی چیپٹر محسوس ہوا۔ نظر فریب دلچسپ رہی اور متاثر کن بھی اس سے قبل حسام بٹ شاید کسی وکیل کی ڈائری سے لکھا کرتے تھے (ایک اور میگزین میں) اس سے مجھے لگا مجھے اپنا مسئلہ وسیم قریشی کے پاس لے کر جانا چاہیے۔ ایک حقیقت بیان کروں گی رائٹرز کے لیے کہانی لکھنا زندگی کے تجربے سے کئی گناہ زیادہ آسان ہے کیونکہ بہت سے حالات و واقعات، کردار اور ان سے وابستہ قصے ہماری جنبش قلم پر ہوتے ہیں ہم اکثر اوقات ہیرو یا ہیروئن کو موت کے منہ سے نکال لے آتے ہیں۔ مگر یقین جانیے حقیقی زندگی کوئی کہانی ہرگز نہیں ہے یہاں جو گتھی ایک بار الجھتی ہے وہ دوبارہ سلجھنے کا نام نہیں لیتی، حقیقت میں، ہم لوگوں کے ذہنوں میں پلنے والی سازشوں کی بو تک نہیں سونگھ پاتے۔ رائٹر ہونے کے باوجود غیر متعدل حالات میں ہم خود کو ایک بند گلی میں محسوس کرتے ہیں، شاید وجہ یہ ہے کہ ہم بہت سے لوگوں پر انحصار کرتے ہیں ہمارا کیس بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے یا شاید ہم ٹیپیکل پاکستانی لڑکیاں کٹھ پتلیوں کی مانند ہوتی ہیں۔ خیر جو بھی ہو، میں نے تو گزشتہ دو سالوں میں حقیقت کے وہ تلخ گھونٹ بھرے ہیں کہ اپنے زندہ ہونے پر شک سا ہونے لگا ہے دل تو کرتا ہے 26 سالوں پر مٹی ڈال کر اگلے ماہ 27 سال سے نیا جنم لوں سب کچھ بھول جانا قطعاً ممکن نہیں مگر خود کو کسی نئے کام سے وابستہ کر لینے سے جینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اس امنگ کو دل میں بسائے اور ننھی بیٹی پری کی ٹوٹی پھوٹی باتوں پر ہنستے ہوئے میں دوبارہ سے نئے افق میں پلٹنا چاہوں گی۔ کیا آپ مجھے ویلکم کہیں گے؟

☆ ناز! نئے افق کی محفل میں دوبارہ خوش آمدید۔ یہ آپ کا اپنا گھر، محفل اور خاندان ہے۔ زندگی نام ہے نشیب و فراز کا اس میں خوش رنگ خوش بو سے بھری وادیاں بھی آتی ہیں اور خاردار راستے بھی، کھٹائیاں بھی ہیں اور آسانیاں بھی، حیرت ہے کہ آپ جیسی حالات کی نبض شناس مصنفہ حالات سے کیوں کر ہار گئی۔ آپ نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کو سکون دے، آپ کو مشکل حالات سے لڑنے کا حوصلہ دے۔ ننھی پری کو پیار کہتے ہیں۔ اللہ جس سے خوش ہوتا ہے اسے بیٹی عطا کرتا ہے تو اللہ آپ سے بہت خوش ہے، بس آپ ہمت نہ ہاریں۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

اسی سورۃ الانعام کی آیت (۱۰۴) اہل ایمان افراد کو دعوت فکر دے رہی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔
ترجمہ:۔ بلاشبہ اب تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو شخص اندھا بنا رہے گا وہ خود اپنا ہی نقصان کرے گا، اور کیا میں تمہارا نگران نہیں ہوں۔ (الانعام۔۱۰۴)
تفسیر:۔ آیت مبارکہ میں لفظ بصائر آیا ہے جو بصیرۃ کی جمع ہے۔ جو دراصل دل کی روشنی کا نام ہے لیکن یہاں اس سے مراد وہ دلائل و براہین ہیں جو قرآن کریم نے رہنمائی اور ہدایت کے لئے جگہ جگہ بار بار بیان کئے ہیں، اور جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احادیث مبارکہ کے ذریعے بیان فرمایا ہے جو کوئی ان دلائل کو سمجھ کر ہدایت کا راستہ اپنا لے گا، اس میں اس کا ہی فائدہ ہوگا۔ اور اگر ہدایت کو نہیں اپنائے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ یہی بات سورۃ بنی اسرائیل۔ ۱۵ میں بھی کہی گئی ہے اس کا مطلب بھی وہی ہے جو آیت مذکور میں ہے۔
آیتِ مبارکہ کا مضمون گو کہ کلام الٰہی ہے مگر اسے ادا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ''میں تم پر نگہبان یا پاسبان نہیں ہوں۔'' یعنی میرا کام تو صرف اتنا ہے کہ حق کی روشنی تمہارے سامنے پیش کردوں۔ اس کے بعد تمہارا کام ہے کہ تم آنکھیں کھول کر ایمان کی روشنی سے اپنا قلب منور کرتے ہو یا نہیں، یہ دیکھنا سمجھنا تو تمہارا کام ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تو صرف اتنی خدمت کہ تھی وہ حق کی روشنی اللہ کے بندوں تک پہنچا دیں صراط مستقیم کا پتہ بتا دیں سمجھا دیں۔
اسے پانا، اسے اپنانا، راہ حق پر چلنا حق کی روشنی کو اپنانا اپنے قلب کی سیاہی دھو کر روشنی سے منور کرنا تو اہل حق کا کام ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے حق کو نہیں اپناتے، روشنی کو نہیں پاتے، اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں زبردستی کھلوانا نبی کا کام نہیں کہ جو کچھ وہ دیکھنا نہیں چاہتے سمجھنا نہیں چاہتے وہ زبردستی انہیں دکھائے اور سمجھائے۔ اُن کی ذمہ داری تو حق کی روشنی دکھانا پہنچانا ہی ہے جو وہ پہنچا چکے۔ اب تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس روشنی سے کس قدر فائدہ حاصل کرتے ہیں اور اپنے قلب کو کس قدر اور کیسے منور کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نشانیاں اس لئے پیدا فرمائی ہیں کہ انسان انہیں دیکھے سمجھے اور غور و فکر کرے کہ اللہ تعالیٰ کتنی بڑی قدرت و اختیار والا ہے، کہ اُس نے ہی انسان کی راحت و آسائش کے لئے یہ کائنات اور اس کا سارا نظام پیدا کیا ہے، اس کائنات کے ایک ایک ذرّے سے اللہ کی حکمت و دانائی کس کس طرح سے عیاں ہے، اگر انسان اپنی عقل کو استعمال کرے تو اللہ کی قدرت، اس کے وجود، اس کے اقتدار و اختیار کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اہلِ ایمان کی رہنمائی اور غور و فکر کے لئے قرآنِ حکیم میں جو پورا کا پورا کلامِ الٰہی ہے، سب کچھ سمجھا دیا، بتا دیا ہے، بس سمجھنے والی فہم و عقل کے استعمال کی ضرورت ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے۔

ترجمہ:۔ وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا' پھر آسمان کی طرف قصد کیا' اور اُن کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کو (پوری طرح) جانتا ہے۔ (البقرۃ۔۲۹)

جیسا کہ البقرۃ کی اس آیتِ مبارکہ میں ربِّ کائنات نے ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا کی ہر ہر چیز اس نے پیدا کی ہے اور سب آسمان بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ غرض کائنات کی کونسی چیز ہے جو اس کے پیدا کرنے سے پیدا نہیں ہوئی۔ انسان اگر اس حقیقت ارضی کو ہی سمجھ لے تو اسے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کا' اس کی قدرت کا مشاہدہ ہو جاتا ہے' اگر خود انسان اپنی ذات' اپنی جسم و جاں پر غور و فکر کرے تو اسے ذاتِ الٰہی کا کمال و اختیار اور ذاتِ الٰہی کا شدید احساس و نظارہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجر میں ارشاد فرمایا۔

ترجمہ:۔ تو جب میں اسے پورا بنا چکوں' اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں' تو تم سب اس کے لئے سجدے میں گر جانا۔ (الحجر۔۲۹)

یہ آیتِ مبارکہ انسان کو غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے۔ آیتِ مبارکہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ جس میں کسی قسم کا کوئی ابہام یا شک نہیں کہ انسان میں جو روح پھونگی گئی وہ ذاتِ الٰہی صفاتِ الٰہی کا ایک عکس ہے ایک پرتو ہے انسان میں جو کچھ صلاحیتیں' حیات' علم' قدرت' ارادہ' اختیار اور دوسری تمام صفاتِ انسانی جن کے مجموعے کا نام روح ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی جانب سے پھونگی گئی روح کا بالکل ہی ہلکا سا پرتو ہے اسی روح کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدے کا حکم دیا جو دراصل انسان کو نہیں اس روح کو سجدے کا حکم تھا جو روحِ الٰہی کا حصہ ہے۔ انسان میں اللہ نے جو اپنی روح میں سے پھونکا وہ ایسا ہی ہے جیسے سمندر میں انگلی ڈبو کر نکال لی جائے انگلی سے جو قطرہ ٹپکے وہی یا اتنی ہی مقدر روحِ الٰہی کی ممکن ہے اور پھر خود قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے انسان کو ایک ٹپکے ہوئے قطرے سے پیدا کیا' اس طرح ساری انسانیت اسی ایک معجزاتی قطرے کا تسلسل ہے جو حضرت آدم سے نسل در نسل منتقل ہو رہا ہے۔ یہی قطرہ روح انسان کو متحرک و فعال رکھتا ہے اور جب یہ قطرہِ روح انسانی جسم سے نکل جاتا ہے تو جسم مردہ' بے جان ہو جاتا ہے اور وہ جسم بے روح انسانی معاشرے کے لئے تمام تر اہم رشتوں' تعلق کے بے کار ہو جاتا ہے اسے پھر جلد از جلد سپرد خاک کر دیا جاتا ہے یعنی وہ مٹی جو اس جسم انسانی کی اصل اور تخلیق کا سامان تھی اسی میں سے ملا دیا جاتا ہے۔

جس طرح انسان ذاتِ الٰہی کو نہیں دیکھ سکتا اسی طرح انسان تمام تر جدید ترین آلاتِ سائنس اور ترقی کی تمام تر کوشش کے اس قطرہِ روح کو نہیں دیکھ سکا نہ اس کا سراغ ہی پا سکا ہے اور تمام کوششوں اور تجربات کے باوجود اسے سوائے حیرانی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکا جب انسان روحِ الٰہی کے ایک ہلکے سے قطرے کا سراغ نہیں لگا سکا' نہ اسے کسی بھی طرح دیکھ سکا تو ذاتِ الٰہی کا دیدار کیسے ممکن ہے ہاں اللہ کو ہم اس کائنات کے ذرے ذرے میں خود اپنی ذات میں دیکھ سکتے ہیں اس کی قدرت و حکمت کے تمام نظارے اس ذاتِ عالی کے ہی نظارے تو ہیں جو انسان رات و دن ہر لمحہ ہر آن دیکھ رہا اور سمجھ رہا ہے۔ اللہ ہمارے قلوب کو روشن کر دے۔

یہ کائنات اور اس کا سارے کا سارا نظام بہت ہی عظیم ہے جس کی کوئی انتہا نہیں' اس کا نظام نہایت مستحکم اور دقیق ہے اس کی ساخت متوازن ہے' جوں جوں اس کائنات کے بارے میں معلومات ہو رہی ہیں اور انسان غور کر رہا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

راجپوت اقبال احمد

ایک نیم دیوانے کا احوال' وہ مرنے بعد عفریت بن گیا تھا۔
ایک معصوم بچی کی روداد' وہ اپنے چچا کی محبت میں موت کے فرشتے سے جاٹکرائی تھی۔
دو بھائیوں کی محبت کا فسانہ' وہ سوچ کے دو کناروں پر کھڑے تھے مگر ان کا دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکتا تھا۔
ایک ایسی تحریر جسے آپ ایک ہی نشست میں پڑھنا پسند کریں گے۔

وہ جنگل میں محوِ خرام تھا۔ اس کا ایک عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ بس وجود پذیر ہو گیا تھا۔

صنوبر کے درختوں تلے حرارت تھی، نمی تھی، تاریکی تھی، گلے سڑے پتے اور گھاس تھی۔ وہیں وہ بنتا رہا، پلتا رہا اور بڑھتا رہا، مگر وہ زندگی سے عاری تھا۔ جنگل میں وہ بے سانس لیے گھومتا رہتا۔ وہ فہم و ادراک کا مالک اور بصارت کا حامل ایک انتہائی ہیبت ناک اور بے حد طاقت ور جسم تھا مگر نہ وہ پیدا ہوا تھا اور نہ ہی وہ زندہ تھا۔ وہ بغیر زندگی کے متحرک تھا اور نشو و نما پا رہا تھا۔

صبح کی روح پرور فضا میں وہ جنگل سے باہر آ گیا۔ اس کے بھاری بھرکم بے ڈول اور عظیم جثے پر بدنما داغ اور بے ترتیب ابھار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی نفرت انگیز اور مکروہ مادے کا مرکب ہو۔ جب وہ چلتا اس کا شانہ، سر یا پیر کسی جھومتی شاخ، کسی خاردار جھاڑی یا کسی پتھر سے ٹکرا جاتا تو اس کے جسم کے اس حصے کا مادہ جھڑ جاتا۔ زمین پر گر کر وہ چند لمحوں تک لہراتا، پھر ساکت ہو کر گھاس اور سوکھے پتوں میں سرایت کر جاتا۔

اس میں رحم نہ تھا، نہ ہی حس مزاح تھی۔ اس کی کوئی چیز بھی جاذب نظر نہیں تھی۔ وہ ہر پہلو سے کریہہ المنظر تھا۔ مگر وہ ایک فوق الفطرت سی قوت اور شاطروں کی سی ذہانت کا مالک تھا اور شاید...... ناقابل تسخیر بھی تھا۔ وہ جنگل سے نکل کر ایک ٹیلے کے دامن میں لیٹ گیا اور دیر تک دھوپ سینکتا رہا۔ اس کے جسم پر ابھرے ہوئے مکروہ مادے کے گومڑ اور دھبے سورج کی قرمزی روشنی میں دمکنے لگے۔ جانے یہ کس کی مردہ ہڈیاں تھیں جنہوں نے جنگل سے حرارت، نمی اور توانائی پا کر انسانی سی شکل اختیار کر لی تھی۔

اس نے اپنے بھاری بھرکم بے ڈول ہاتھوں سے زمین پیٹی اور قریب کھڑے ہوئے درخت کے تنے کو جھنجوڑ دیا پھر اس نے دو تین لڑھکنیاں کھائیں اور کہنیوں کے بل اٹھ گیا۔ اس نے سامنے اگی ہوئی گھاس، مٹھی میں بھری، اسے کھینچ کر اپنے سینے پر ملا اور پھر کسی ذہین بچے کی طرح شاداب گھاس کی ان پتیوں کو دیکھنے لگا آخر اس نے گھاس پھینک دی اور ایک پودا اکھاڑ کر توڑنے مروڑنے لگا۔ اس میں سے ٹپکتے ہوئے رقیق مادے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے وہ پودا بھی پھینک دیا۔ اچانک اس کے قریب سے ایک جنگلی جانور گزرا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا۔ جانور بری طرح مچلنے اور چیخنے چلانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ جانور پر اپنی گرفت مضبوط کرتا رہا۔ اس کی انگلیاں فولادی پنجوں کی طرح جانور کے بدن میں گھستی جا رہی تھیں، پھر جانور کے بدن میں سے فوارے کی مانند خون ابل پڑا جو اس کی انگلیوں میں سے ہوتا ہوا کہنیوں تک پھسل آیا۔ گرم گرم سرخ خون! جانور ساکت ہو گیا۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس نے جانور کو بھی دور اچھال دیا۔ اب اس کی نظریں کسی اور چیز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

٭٭٭

ٹامی اپنے قد سے اونچی گھاس میں دوڑ رہا تھا۔ اس کے حلق سے مسرت بھری غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اس کے خوف ناک جبڑے کھلے ہوئے تھے اور جبری دم کمر سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ بڑے مزے میں تھا۔ یوں آزادی سے بھاگنا اسے بے حد پسند تھا۔ اسے اپنی طاقت اور پھرتی کا ادراک تھا اور وہ ان پر فخر کرتا تھا اس کی زبان بے پروائی سے اس کے ہونٹوں پر پھسل رہی تھی اور ہونٹ ہر چھلانگ کے ساتھ متحرک تھے۔ وہ ایک اصیل کتا تھا، بے حد صحت منداور طاقت ور۔

وہ اُڑتا ہوا سا ایک بھاری پتھر پر چڑھ گیا اور جب دوسری طرف کودا تو پتھر کے نیچے سے لمبے کانوں والا خرگوش نکل کر بھاگا۔ ایک لمحے کو ٹامی گھبرایا، پھر خرگوش

کے تعاقب میں دوڑ گیا۔ اس کی غراہٹوں کا انداز بدل گیا تھا۔ خرگوش یکساں فاصلے سے کانوں کو گردن سے چپکائے بھاگتا رہا اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں یوں متحرک تھیں جیسے ان میں برقی رو دوڑ رہی ہو۔ اچانک وہ رک گیا۔ پھر جیسے ہی ٹامی اس کے قریب پہنچا خرگوش نے جست لگائی اور ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں گھس گیا۔ ٹامی غراتا ہوا تنے سے ٹکرایا مگر تنے کا سوراخ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ اس میں گھس سکتا۔ ذرا دیر کی کوشش کے بعد اس نے جدوجہد ترک کر دی اور دوبارہ جنگل میں دوڑ گیا۔

اچانک ٹامی کی نظر "اس" پر پڑی۔ وہ پگڈنڈی کے قریب ساکت کھڑا ہوا تھا۔ ٹامی کی ناک سے ناگوار بو کا ایک جھونکا ٹکرایا۔ اس نے نتھنے سکیڑے اور اس کے سامنے سے گزرنے لگا۔

وہ جیسے ٹامی ہی کا منتظر تھا۔ جیسے ہی ٹامی اس کے قریب پہنچا اس نے اپنا بھاری مکا اس کی طرف لہرایا۔ ٹامی نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو چھلانگ لگا کر مکے کی زد سے بچنا چاہا لیکن وار نپے تلے انداز میں کیا گیا تھا۔ مکا ٹامی کے پہلو میں پڑا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس پر کوئی بھاری چٹان دے ماری ہو۔ وہ ڈگمگایا پھر چیخ کر ڈھلان پر لڑھکتا ہوا دور جا گرا لیکن جلد ہی سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سر جھٹکا بدن کو ایک جھرجھری دی اور پلٹ کر اس کی طرف بڑھا۔ ٹامی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کی دم اس کے سر کی طرف اٹھ گئی اور شدت غیظ سے گردن کے بال تن گئے تھے۔ "وہ" اپنی جگہ کھڑا ہاتھ اٹھائے ٹامی کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹامی نے رفتار سست کر دی۔ ذرا فاصلے پر رک کر اس نے بدن کو پیچھے دھکیلا پھر پوری قوت سے اڑتا ہوا اس کی گردن پر جھپٹ پڑا۔ ٹامی کے دانت اس کی گردن میں پیوست ہو گئے اور مکروہ مادے سے گزرتے ہوئے آپس میں مل گئے، تعفن کا بھپکا اس کے اعصاب کو جھنجوڑ گیا وہ غراتا ہوا عفریت کے قدموں میں گر پڑا۔ "وہ" ٹامی پر جھکا اور یکے بعد دیگرے اس کی کمر پر گھونسے برسا دیے۔ ٹامی کی کمر ٹوٹ گئی وہ زمین پر لڑھک گیا پھر اس نے ٹامی کے تڑپتے جسم کو دونوں ہاتھوں سے چیرنا پھاڑنا شروع کر دیا۔

⁂

"ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جاؤں گا۔" آغا ناصر نے لکڑی کے صندوق کے پیچھے رکھی ہوئی رائفل اٹھاتے ہوئے کہا اور اس کا بڑا بھائی، آغا طاہر ہنس پڑا۔

"یہ ٹامی تو تمہارے ذہن پر سوار ہو کر رہ گیا ہے ناصر۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "ہوگا یہیں کہیں ایسی کیا بے تابی ہے؟"

"نہیں آغا! میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" ناصر نے سنجیدگی سے کہا۔ "دیر تک میری سیٹی کے جواب میں نہ آنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے یا پھر کسی شکار کا پیچھا کر رہا ہے اور شوٹنگ کے لیے میرا منتظر ہے۔ مجھے بلانے کے لیے وہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ میری سیٹی کا جواب نہیں دیتا۔"

آغا طاہر نے اپنی نو سالہ لڑکی شبینا کی طرف دودھ سے بھرا ہوا گلاس بڑھایا اور بولا۔ "میں محسوس کرتا ہوں ناصر کہ تم اپنے کتے سے اسی قدر محبت کرتے ہو جتنی مجھے اس ذہین بیٹی شبینا سے ہے۔"

شبینا کرسی سے اتر کر دوڑتی ہوئی اپنے چچا کے قریب آ گئی۔ "میرے لیے برا آدمی بھی پکڑ لائیں گے نا چچا ناصر۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"برا آدمی" آغا طاہر کی ایجاد تھی اس آدمی کے لیے

جو اندھیروں میں چھپا رہتا تھا۔ چھوٹی لڑکیوں کو پکڑ لیتا تھا چوزے اٹھا لے جاتا تھا' درختوں پر لگے سیب برباد کردیتا تھا۔ ان لڑکیوں کا تو وہ سخت دشمن تھا جو اپنی امی ابو کی بات نہیں مانتی تھیں' بغیر اجازت گھوڑا دوڑا لی پھرتی تھیں اور دودھ سے بھری بالٹی میں مچھلی ڈال دیا کرتی تھیں۔

''شمی! چچا ناصر کی رائفل سے دور ہٹو۔''

آغا طاہر مصنوعی غصے سے بولا۔ ''اور یہاں آکر دودھ پی لو۔'' پھر ناصر کی طرف مڑا۔ ''اگر تمہیں کہیں برا آدمی نظر آجائے تو اس سے کہنا شبینا تم سے ملنا چاہتی ہے رات اس نے گایوں کے نمک کے ڈلوں پر مرچ چھڑک دی تھی۔ ذرا اسے سبق دیا جائے۔''

ناصر ہنس پڑا اور شبینا کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''بے فکر رہو شمی جان' اگر مجھے برا آدمی نظر آگیا میں اس کے ہاتھ سے بچ گیا تو پھر تمہارے لیے اس کی کھال ہی اتار لاؤں گا۔''

جنگل کی طرف جانے والے راستے پر چلتے ہوئے وہ شبینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک بے حد پیاری' دلچسپ اور صحت مند لڑکی تھی۔ اسے ہونا بھی چاہیے تھا وہ دونوں بھائیوں کی محبت کا واحد ثمر تھی۔ دونوں بھائی نورین سے محبت کرتے تھے۔ نورین نے آغا طاہر کا انتخاب کیا اور دونوں کی شادی ہوگئی۔ شبینا ان کی اکلوتی اولاد تھی اور آغا ناصر نے اپنی ساری محبتیں اس کے لیے وقف کردی تھیں۔ یہ محبت بھی عجیب شے ہے وہ مسکرا دیا۔ وہ مردوں کا مرد تھا اور ہر چیز کو اسی انداز میں دیکھنے کا عادی تھا۔ محبت کے بارے میں بھی اس کا نظریہ انتہائی سخت اور خوف زدہ کردینے والا تھا۔ اسے احساس تھا کہ محبت کیا شے ہے کیونکہ اپنے بھائی کی بیوی' نورین کے لیے ابھی تک اس کی محبت میں ذرا کمی نہیں آئی تھی۔ بس رخ بدل گیا تھا اور اب جیسے وہ زندہ ہی شبینا کے لیے تھا۔ اسے ٹامی سے بھی شدید محبت تھی مگر یہ محبت آسان تھی اس میں کسی کو کچھ کہنا یا جتانا نہیں پڑتا تھا۔ دونوں' ایک دوسرے کی خاموش زبان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ناصر کے لیے بارود کی بو اور اپنے کتے کے جسم سے اٹھتی ہوئی باس لطیف ترین خوشبو سے بڑھ کر تھی۔ ٹامی کی غراہٹ' رائفل کا دھماکا اور شکار کیے ہوئے جانور کی چیخیں اس کے لیے روح پرور شاعری اور موسیقی جیسا اثر رکھتی تھیں۔ ٹامی کی محبت' انسانی محبت کی طرح نہیں تھی کہ محبت کو سامنے پاکر زبان لڑکھڑا جائے اور شب و روز آدمی تصورات کی دنیا میں کھویا رہے۔ ٹامی اور ونچسٹر رائفل اس کی اصل محبت تھے جو اسے مست و سرشار رکھتے تھے۔ دوسری طرف نورین اور شبینا کی محبتیں تھیں جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی تھیں۔ اس کی تیز نگاہوں نے بڑے سے پتھر کے قریب نرم مٹی پر ٹامی کے پیروں کے نشانات دیکھ لیے وہ جان گیا کہ کتا پتھر پر سے کودا تھا اور پھر خرگوش کے تعاقب میں دوڑ گیا تھا۔ اس نے نشانات پر سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں خرگوش پناہ لے سکتا تھا۔ اسے کھوکھلا تنا نظر آگیا۔ ٹامی یہاں تک آیا تھا مگر اسے دیر ہو چکی تھی اور وہ خرگوش کو نہیں پکڑ سکا تھا۔

''ہت تیری کی۔'' وہ خوش دلی سے بڑبڑایا۔ ''ایک خرگوش کو نہیں پکڑ سکا۔'' پھر اس نے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ اسے یقین تھا کہ ٹامی قریب ہی کسی درخت یا ٹیلے کے پیچھے کسی خرگوش کی بھٹ کھود رہا ہوگا مگر اس کی سیٹی کا کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر تک وہ الجھا ہوا کھڑا رہا پھر دوبارہ اسی راستے پر آگیا۔ ''ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔'' وہ بڑبڑایا پھر اس کے ذہن میں خوف وخدشات لہرانے لگے۔

اس نے اپنی اعشاریہ بتیس چالیس کا گھوڑا چڑھا

لیا اور فائرنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ سالانہ میلے میں یہ بات زبان زد عام تھی کہ آغا ناصر کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ ایک بار اس نے چاقو کی نوک پر گولی ماری تھی اور موم بتی کی لو بجھانا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسے دنیا کی کسی ایسی چیز سے خوف نہیں تھا جسے گولی ماری جا سکتی تھی اور بھوت پریت کا وہ قائل نہیں تھا۔

☆
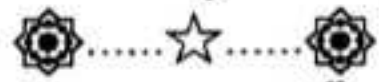
وہ حیرت بھری نظروں سے ٹامی کی اُدھڑی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے منہ سے ویسی ہی آواز نکالی جیسی ٹامی کے حلق سے دم توڑتے وقت نکلی تھی۔ وہ چند لمحوں تک وہیں کھڑا اپنے غلیظ ذہن میں قطعی غیر جذباتی طور پر حالات کا تجزیہ کرتا رہا۔ کتے کے بدن سے نکلنے والا خون گرم تھا۔ سورج کی روشنی میں حرارت تھی۔ جو چیزیں حرکت کرتی ہیں اور جن کے جسموں پر بالوں بھری کھال چڑھی ہوئی ہے ان کے اندر پتلی پتلی نالیاں ہوتی ہیں جن میں سرخ' گاڑھا' رقیق مادہ بھرا ہوتا ہے۔ یہ مادہ باہر نکلنے کے ذرا دیر بعد جم جاتا ہے۔ گھاس اور پودوں میں نسبتاً پتلا مادہ ہوتا ہے اور ان کا ایک حصہ ٹوٹ جانے سے ان کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہ بڑا دلچسپ مگر ناخوش گوار تجربہ تھا لیکن وہ ناگواری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں تو مشاہدے اور نت نئے تجربات حاصل کرنے کی تمنا مچل رہی تھی۔ اس کے لیے یہ محض حیران کن سی بات تھی۔

سورج کی تمازت میں کمی آ گئی تھی' سفر کے اختتام سے پہلے لگتا تھا جیسے وہ دور پہاڑی کی چوٹی پر ٹکا ستا رہا ہو۔ مغرب کی سمت بکھرے ہوئے بادلوں میں شفق کا رنگ اتر آیا تھا۔ ''اس'' نے اچانک اپنا سر اٹھایا اور ماحول پر امڈتے اندھیرے کو دیکھنے لگا۔ رات اس کے لیے ایک عجیب چیز تھی۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ سناٹا بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اگر اس میں خوف کا احساس ہوتا تو یقیناً وہ بھی دیگر جان داروں کی طرح اس تاریک اور مہیب سناٹے سے خوف زدہ ہو جاتا۔ مگر وہ اس قسم کے احساسات سے عاری تھا۔ البتہ اس کے ذہن پر تجسس غالب تھا اور جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اس کا جواز سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے سوچا اس کی بصارت زائل ہوتی جا رہی تھی۔ کیوں؟ اس نے اپنے بے ڈول سر کو ایک جانب جھکایا ہاں یہ سچ ہے کہ اب سب کچھ دھندلانے لگا تھا اور بتدریج اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ چیزیں شکل بدل رہی تھیں۔ انہیں اندھیرا نگل رہا تھا۔ کیا وہ چیزیں جنہیں اس نے چیر پھاڑ ڈالا تھا اس سیاہی میں دیکھ سکتی تھیں؟ وہ کیسے دیکھتے تھے؟ وہ بڑا جانور جس نے اس پر حملہ کیا تھا اس کے سر پر دو ستارے سے چمک رہے تھے۔ یقیناً وہ انہی کی مدد سے دیکھ رہا تھا کیونکہ جب اس نے اس جانور کی پیٹھ پر پہلا ہاتھ مارا تھا تو اس نے ان دو ستاروں سے ہی اسے گھورا تھا اور پھر اس پر چھلانگ لگا دی تھی اور جب اس نے اسے چیر پھاڑ دیا تھا تو ان پر کھال چڑھ گئی تھی۔ گویا آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ یقیناً وہ ان آنکھوں سے ہی دیکھ رہی تھا لیکن جب کتا مر گیا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں تو اس کے بعد بھی اس نے اسے مارا تھا مگر آنکھیں نہیں کھلی تھیں اور نہ ہی اس کے جسم نے حرکت کی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ جب کوئی چیز مر جاتی ہے اس کا سانس بند ہو جاتا ہے اور حرکت رک جاتی ہے۔ تو اس کی آنکھیں دیکھنے قابل نہیں رہتیں گویا جب کسی کی بصارت زائل ہو جائے تو وہ مر جاتا ہے اور جب کوئی مر جاتا ہے تو پھر حرکت نہیں کر سکتا' بس وہ زمین پر گر کر ساکت ہو جاتا ہے اپنے ذہن میں اس منطقی نتیجے پر پہنچنے کے

بعد وہ ٹامی کے بکھرے ہوئے جسم سے تھوڑی سی دور زمین پر لیٹا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس نے خود کو مردہ تصور کر لیا تھا۔

⊛......☆......⊛

آغا ناصر شام کے سرمئی اجالے میں نکل کر جنگل کی تاریکی میں آ گیا۔ وہ واقعی متفکر تھا اس نے پھر سیٹی بجائی اور ٹونی کو پکارا مگر اس بار بھی سناٹا منہ چڑاتا رہا۔ ''اس میرے یار نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔'' وہ بڑبڑایا اور سر ہلانے لگا۔ دودھ نکالنے کا وقت گزر رہا تھا وہ اس کام میں آغا طاہر کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا یقیناً بھائی ناراض ہو رہا ہوگا۔ ''ٹو...... نی......!'' وہ پوری قوت سے چلایا مگر آواز درختوں سے لپٹی تاریکی سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور بٹ کو زمین پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور سر کھجانے لگا۔ ٹونی کی یہ حرکت اسے بری طرح کھل رہی تھی۔ رائفل پر جھک کر اس نے جنگل میں نظر دوڑائی۔ بٹ نرم زمین میں دھنسنے لگا۔ وہ لڑکھڑایا' توازن برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنا پیر کسی کے سینے پر رکھ دیا۔ اس کا پیر ٹخنوں تک کسی لجلجے سے مادے میں اتر گیا۔

''لعنت ہو! جانے کس کی لاش گل سڑ رہی ہے اوغ۔'' اسے ابکائی آنے لگی۔ قریب ہی درخت کی شاخ سے اس نے چند پتے نوچے اور اپنے بوٹ کو صاف کرنے لگا۔ عفریت کے سینے پر آغا ناصر کے پیر کا گہرا نشان پڑ گیا تھا جو خود بخود بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی گدلی آنکھوں کی جھری سے بے حس و حرکت پڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اندھیرے کی وجہ سے اپنے خیال میں مردہ تھا مگر آغا ناصر کی حرکات اسے صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا جانے یہ عاقبت نا اندیش مخلوق کون ہے کچھ اور پتے توڑ کر آغا ناصر نے رائفل کا بٹ بھی صاف کیا اور پگڈنڈی پر چل دیا۔ ٹونی کو بلانے کے لیے وہ مسلسل سیٹیاں بجا رہا تھا۔

⊛......☆......⊛

نورین باڑے کے گیٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ نیلے فراک پر اس کا سرخ و سپید چہرہ نوشگفتہ گلاب کی طرح دمک رہا تھا۔ اس نے سیاہ گھنے بالوں کے بیچ میں سے مانگ کاڑھ کر سخت چوٹی گوندھی ہوئی تھی جو ناگن کی طرح اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ ''طاہر! ناصر!'' اس نے آواز لگائی۔

''کیا بات ہے؟'' باڑے کے اندر سے اس کے شوہر نے پکارا۔ وہ گائے کے تھنوں کو مٹھی میں بھینچے گرم گرم دودھ کی دھاریں بالٹی میں اتار رہا تھا جو تقریباً بھر چکی تھی۔

''میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے آپ کے بغیر شبی بھی کھانا نہیں کھا رہی ہے یہ ناصر کہاں چلا گیا؟''

طاہر بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ دودھ سے بھری بالٹی ہاتھ میں لٹکا کر اس نے گائے کو تھپکی ماری وہ ناند کی طرف بڑھ گئی۔ طاہر گیٹ پر آ گیا۔ ''ابھی تک نہیں آیا۔'' اس نے کہا' پھر بھری ہوئی بالٹی رکھ کر خالی بالٹی اٹھائی اور دوسری گائے کے قریب جا بیٹھا۔

''نہیں آیا؟'' نورین اپنے شوہر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ''مگر طاہر اس نے تو کہا تھا کہ......!''

''ہاں' ہاں مجھے معلوم ہے اس نے کہا تھا کہ وہ دودھ نکالنے کے وقت تک واپس آ جائے گا میں نے سن لیا تھا مگر وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔''

''اور آپ ان گایوں کا دودھ...... اوہ...... لائیے میں آپ کی مدد کر دوں۔ ناصر کہیں الجھ گیا ہوگا۔ ورنہ ضرور آ جاتا۔ شاید کسی......!''

''ہاں شاید وہ کسی نیل گائے کے چکر میں ہو۔''

آغا طاہر غصے سے بولا۔ ''وہ اور اس کا منحوس کتا کوئی کارنامہ سرانجام دے کر ہی آئیں گے یہاں بارہ گائیں اس کی جان کو رو رہی ہیں' سب کا دودھ مجھے نکالنا پڑے گا۔ مرغیوں کو ڈربوں میں بند کرنا ہے' بکریوں کو چارہ ڈالنا ہے پھر وہ گھوڑے ہیں دانے اور پانی کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ صبح کے لیے لکڑیاں کاٹنی ہیں۔ کوئی ایک کام ہے؟ اور نواب صاحب شکار کرنے میں مصروف ہیں۔'' وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس کے ہاتھ تھنوں سے دودھ نچوڑ رہے تھے۔

نورین خاموش کھڑی بے بسی سے انگلیاں مروڑ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طوفان کا زور توڑنے کے لیے کیا کہے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا ناصر پہلے بھی کئی بار ایسی حرکت کر چکا تھا۔ اس کو گھر کی ذمہ داریوں سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی۔ ''اب یہ سب کچھ مجھ اکیلے کو کرنا پڑے گا۔'' طاہر بڑبڑایا۔ ''میں اس کے شکار کے شوق سے تنگ آ چکا ہوں۔ اس کا کتا گلہری کی بو پا کر اس کے تعاقب میں لگ جاتا ہے اور نواب صاحب رائفل اٹھا کر دوڑ پڑتے ہیں۔ بس اب میں اس کی یہ حرکتیں مزید برداشت......!''

''اوہ لایئے نا میں ہاتھ بٹا دیتی ہوں آپ کا۔''

نورین جلدی سے بولی اسے وہ وقت یاد آ گیا جب شبینا جنگل سے کسی ریچھنی کا بچہ اٹھا کر لا رہی تھی کہ ریچھنی آ گئی اور شبینا ایک کھڈ میں گر گئی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ ریچھنی اس پر حملہ کرنے ہی والی تھی کہ ٹامی آ گیا اور اس وقت تک ریچھنی کو حملہ کرنے سے روکے رکھا جب تک کہ ناصر نے آ کر اس کی کھوپڑی میں گولی نہ اتار دی۔ اب بھلا ایسے کتے سے کیسے نفرت کی جا سکتی تھی جس نے اس کے جگر گوشے کی جان بچائی تھی۔

''تم کچھ نہیں کر سکتیں۔'' آغا طاہر تنک کر بولا۔ ''جاؤ تم گھر میں جاؤ' تمہارے لیے وہیں بہت کام ہے کام ختم ہو جائے گا تو میں بھی آ جاؤں گا اوہ روتی کیوں ہو؟ میرا مطلب یہ نہیں تھا......اوہ......بھئی یہ کیا ہے؟ نورین' نہیں۔'' اس کے لہجے میں غصے کی جگہ پیار اتر آیا۔ وہ اٹھا اور اپنی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ''اوہ بھئی میں تم پر غصہ کب کر رہا تھا میں تو یہ کہہ رہا تھا تم اندر چلی جاؤ شبینا کے پاس میں بھی ابھی آتا ہوں۔ اب ان کاموں کو ادھورا تو نہیں چھوڑا جا سکتا نا؟ یہ چار آدمیوں کا کام ہے اور کرنے والا صرف میں اور وہ شکار صاحب بس اب جاؤ' جاؤ میں ابھی آ رہا ہوں۔''

''جا رہی ہوں'' نورین آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ''لیکن اگر وہ آ جائے تو اسے فوراً ہی ڈانٹنا شروع مت کر دینا پہلے اس کی بات سن لینا۔ آہ طاہر! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ اس بار نہیں آ سکے گا جیسے اسے......!''

''میرے بھائی کو دنیا کی کوئی ایسی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی جسے گولی ماری جا سکی۔ وہ اپنی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے مگر اس بار میں اس کا کوئی بہانہ نہیں سنوں گا اب تم جاؤ اور شبی کو کھانا کھلاؤ۔''

نورین گھر میں آ گئی مگر اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے غصے سے واقف تھی اور آج وہ کچھ زیادہ ہی غضب ناک ہو رہا تھا۔ اگر اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر ناصر کو گھر سے نکال دیا تو وہ کیا کریں گے۔ یہ زمین' یہ جانور' اکیلے طاہر کے بس کا روگ نہیں تھے اور کسی نوکر کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا پھر اگر طاہر اپنی پوری طاقت بھی لگا لے تو سارا کام نہیں کر سکے گا۔ یہ ایک کیا' چار آدمیوں کے لیے بھی بھاری کام تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور کلاک کی طرف دیکھا' سات بج رہے تھے اور اب تک دودھ بھی نہیں نکل سکا

تھا۔اوہ! آخر ناصر کیوں اس قدر بے پروا......

نو بجے شبینا سو گئی تو نورین مکان کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی طاہر مرغیوں کا ڈربا بند کر رہا تھا کیا ناصر آ گیا؟" دونوں کی زبان سے بہ یک وقت ایک سوال نکلا۔طاہر اس کے قریب آ کھڑا ہوا نورین نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ چولہے کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔اس نے دیگچی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا اور پھر بند کر دیا۔"تم اب سو جاؤ۔" وہ کمرے میں آتا ہوا بولا۔

نورین نے دز دیدہ نگاہوں سے اپنے شوہر کی چوڑی پیٹھ کو دیکھا۔اس کی عمر اٹھائیس سال تھی مگر وہ اپنی عمر سے دس سال بڑے آدمی کی طرح چلتا تھا۔ جبکہ چہرے سے وہ پانچ سال کم کا لگتا تھا۔"بس اب تیاری کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔

طاہر نے لکڑی کے صندوق کے پیچھے اس کونے کی طرف دیکھا جہاں ناصر کی رائفل ہوا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے بے معنی سی غراہٹیں نکلنے لگیں۔ پھر وہ کرسی پر ٹک کر اپنے کیچڑ میں بھرے بھاری بوٹ اتارنے لگا۔

"نو کب کے بج چکے ہیں۔" نورین دھیمے لہجے میں بولی۔ طاہر نے جواب دیے بغیر جوتے اتار کر چپل پہن لی۔ "طاہر۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی "کیا تم باہر......!"

"باہر؟ کیوں؟ کس لیے؟" وہ غراتا ہوا پلٹا۔

"اوہ کچھ نہیں۔" نورین نے جلدی سے کہا اور سر جھکا لیا۔"میں سوچ رہی تھی کہ شاید ناصر۔"

"ناصر ناصر۔" وہ گرج اٹھا۔"کتا چوہے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ ناصر اپنے کتے کے پیچھے بھاگ رہا ہے اب تم چاہتی ہو کہ میں اس کے پیچھے بھاگتا پھروں، یہی چاہتی ہو نا تم؟"

"تم تو صرف یہ کہہ رہی تھیں کہ......وہ کبھی اتنی دیر تک باہر نہیں رہا۔

"میں نہیں جاؤں گا اب رات کے نو بجے، نواب صاحب کی تلاش میں جنگل میں مارا مارا پھروں؟ اسے ذرا خیال نہیں رہا ہمارا۔"

نورین خاموشی سے گردن جھکائے باورچی خانے میں چلی گئی اور دیگچی چولہے پر سے اتار کر نیچے رکھ دی۔ جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو طاہر جوتے پہن رہا تھا پھر اس نے کوٹ پہن لیا۔"میں جانتی تھی کہ تم ضرور جاؤ گے۔" نورین کی آواز میں شگفتگی تھی مگر ہونٹ سنجیدہ تھے۔

"میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔"میرے خیال میں وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ رات خاصی ہو گئی ہے میں اس کی طرف سے خوف زدہ نہیں ہوں مگر۔" اس نے بارہ بور کی شاٹ گن کھول کر اس کی نالی سے آنکھ لگا دی پھر دو کارتوس فٹ کر کے اسے دوبارہ بند کر دیا۔ پھر کئی فاضل کارتوس اس نے کوٹ کی جیب میں رکھ لیے۔"میرا انتظار مت کرنا۔" باہر جاتے ہوئے اس نے سر گھما کر کہا۔"دیر ہو جائے تو سو جانا۔"

"سو جاؤں گی لیکن جلدی آنے کی کوشش کرنا۔" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔"پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے سلائی کا کام اٹھایا اور لیمپ کے قریب آ بیٹھی۔

وہ اندھیرے میں ڈوبی پگڈنڈی پر آنکھیں پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھتا جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ "ناصر" کی صدا بھی لگا لیتا۔ سرد ہواؤں میں جنگل کی باس رچی ہوئی تھی۔ اس نے دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں اور بڑبڑایا۔ لعنت ہو رات کے دس بج

رہے ہیں اور نواب صاحب کتے کو لیے شکار کھیل رہے ہیں' ناصر......!'' اس نے پوری قوت سے پکارا۔

''آغا ناصر......!'' جواب میں اس کی اپنی آواز ہی تھی جو بازگشت کی صورت میں لوٹ آئی تھی وہ جنگل میں داخل ہوگیا۔ فٹ پاتھ کے قریب پڑا ہوا مکروہ مادے کا ڈھیر اس کے قدموں کی دھمک محسوس کررہا تھا مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی کیونکہ اپنے خیال میں وہ مردہ تھا۔

طاہر آگے بڑھتا رہا اس کی نگاہیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''ناصر۔'' وہ پھر چلایا۔

''آغا بھائی کیا یہ آپ ہیں؟''

طاہر منجمد ہوکر رہ گیا۔ ناصر کی اچانک آواز نے لمحے بھر کے لیے اس کے اعصاب کو مفلوج کردیا تھا۔ جنگل کا یہ حصہ بے حد گھنا اور قبر کی طرح تاریک تھا۔ ناصر کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ ''ناصر؟'' اس نے پھر پکارا۔

''میں نے ٹامی کو ڈھونڈ لیا ہے آغا۔''

''تم اب تک یہاں کیا کررہے ہو؟'' طاہر کا غصہ عود کر آیا۔ اندھیرا اسے خوف زدہ کررہا تھا ناصر کی بھرائی ہوئی آواز سن کر اس کے ذہن میں خدشات کے ناگ رینگنے لگے تھے۔ اسے ڈر ہونے لگا کہ بھائی کی یہ کیفیت اس کے غصے کو متزلزل نہ کردے۔

''میں نے اسے پکارا تھا سیٹیاں بجائی تھیں مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔'' ناصر کی آواز میں درد بھرا ہوا تھا۔

''یہی بات میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔'' وہ تند لہجے میں بولا۔ ''تم......تم گدھے کی دم تمہیں دودھ نکالنا تھا اور تم کتے کے پیچھے پڑے ہوئے ہو اور تم ہو کہاں' سامنے کیوں نہیں آتے کیا کسی جال میں پھنس گئے ہو؟''

''آپ کو پتا ہے نا آغا' ٹامی میری آواز کا جواب کس مستعدی سے دیا کرتا تھا۔'' تاریکی میں ناصر کا بین سنائی دیا۔

''ناصر' آخر یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ اگر ٹامی نے تمہیں جواب نہیں دیا تو لعنت بھیجو اس پر آخر یہ......!''

''اس نے پہلے کبھی جواب سے اس لیے مایوس نہیں کیا تھا کہ وہ مرا نہیں تھا۔'' ناصر نے اپنے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' طاہر کے ہونٹ بھینچ گئے۔

''ناصر کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''ٹامی مرگیا ہے آغا۔'' اس کی آواز میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔

''ٹامی......اوہ......آہ......!'' طاہر کی آواز اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کے لیے یہ ایک قطعی غیر متوقع خبر تھی۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جب شبینا ایک گڑھے میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور گڑھے سے باہر ٹامی خونخوار ریچھنی پر بڑھ چڑھ کر حملے کررہا تھا۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر ریچھنی کو شبینا سے دور رکھنے کی کوشش کررہا تھا پھر ناصر نے آ کر ریچھنی کو گولی ماردی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیسے مرگیا ٹامی؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بس یہی بات معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ کسی نے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''ٹامی کو ٹامی کو چیر پھاڑ دیا ہے۔''

''اس کا جسم کا جوڑ جوڑ الگ کردیا گیا ہے اس کی آنتیں بھی باہر نکلی ہوئی ہیں۔''

''خدایا کیا یہ کسی ریچھنی کا کارنامہ ہے؟''

''ریچھنی کا کام نہیں ہے آغا' ٹامی کی یہ حالت کرنے والا کوئی چوپایا نہیں ہے اس کے سارے

حصے یہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ کوئی جانور ہوتا تو کچھ نہ کچھ کھا جاتا۔ جس کسی نے بھی یہ کام کیا ہے محض اسے مارنے کے لیے کیا ہے۔ اسے چیر پھاڑ کر پھینک دیا ہے۔''

''اوہ خداوند۔'' طاہر اٹکتی سی سانس لے کر بولا۔

''آخر یہ کون......؟'' وہ اچانک چپ ہو گیا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔

''آؤ گھر چلیں ناصر۔'' اس کے لہجے میں بڑے بھائی کا پیار تھا۔ ''اس تاریکی میں تم اس کے قاتل کو تلاش نہیں کر سکتے۔''

''میں اسے تلاش کر کے رہوں گا آغا۔'' ناصر کی غصے بھری آواز سنائی دی۔ ''میں سورج نکلنے تک یہیں رہوں گا۔ پھر میں اس کا تعاقب کروں گا چاہے زندگی بیت جائے میں اس کا بھی یہی حشر کروں گا۔ جو اس نے میرے ٹامی کا کیا ہے۔''

''کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ناصر؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

''آپ جو چاہیں سمجھیں آغا مگر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ ٹامی کا انتقام لیے بغیر مجھ پر کھانا' پینا' سونا سب کچھ حرام ہے۔''

''کیا بھول گئے ناصر ہماری یہاں زمین ہے جانور ہیں' ہمیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔'' وہ ناصحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''میں ابھی بارہ گایوں کا دودھ نکال کر آ رہا ہوں۔ صبح پھر مجھ اکیلے سے یہ کام نہیں ہوگا۔''

''کسی اور کو بلا لیں' میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ کسی کو نوکر رکھ لیں کسی کو تو رکھنا ہی پڑے گا آغا میں ٹامی کا انتقام لیے بغیر گھر نہیں آؤں گا۔''

''بکواس مت کرو ناصر۔'' آغا طاہر کا غصہ بے دار ہو گیا۔ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا ابھی' اسی وقت۔'' اس نے تاریکی میں آواز کی سمت قدم بڑھائے۔

''میرے قریب مت آنا آغا۔'' ناصر کی آواز میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ مگر طاہر بڑھتا رہا۔ ''میں کہتا ہوں......!''

''آپ جہاں ہیں وہیں رک جائیں۔'' طاہر نے اس وارننگ پر ذرا توجہ نہ دی۔ اچانک ایک گولی اس کے پیروں کے پاس سے دھول اڑا گئی۔ طاہر کے پیر جیسے زمین میں گڑ گئے۔

''تم......تم نے مجھ پر رائفل تانی ہے ناصر؟ تم نے مجھ پر فائر کیا ہے؟'' آغا طاہر کو خود اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

''ہاں آغا اس جگہ اس وحشی کے نشانات ہوں گے جس نے میرے ٹامی کو ہلاک کیا ہے اس کے نقوش پا برباد نہ کریں میں اس کا جہنم تک تعاقب کرنا چاہتا ہوں آپ الٹے قدموں واپس لوٹ جائیں۔''

پورے ایک منٹ تک سناٹے میں طاہر کے سانس لینے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ان آوازوں میں دکھ اور بے چینی کی آمیزش تھی۔

''میرے ہاتھ میں بھی رائفل ہے ناصر' گھر چلو۔'' آخر وہ بولا۔

''میں تاریکی میں چھپا ہوا ہوں' آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے اس لیے آپ کی گولی ضائع جائے گی جبکہ میں یہاں چار گھنٹے سے ہوں اور آپ میری زد پر ہیں۔''

''کیا اب یہاں تک نوبت آ گئی ہے ناصر۔''

''آپ ضد نہ کریں آغا گھر چلے جائیں۔ میں ہر گز آپ کے ساتھ نہیں چلوں گا۔''

''میری گولی کے چھرے پھیلتے ہوئے فائر کرتے ہیں۔'' آغا طاہر نے اسے متنبہ کیا۔

''اور میری گولی ٹھیک نشانے پر لگتی ہے۔'' اس نے

ناصر کا جواب سنا۔ ایک ثانیے کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ اندھیرے میں سیاہ تودے کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اسے موت وزیست کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ بس وہ خود کو مردہ سمجھے ہوئے تھا کیونکہ زندہ چیزیں دیکھ سکتی ہیں اور حرکت کرسکتی ہیں اور جو مردہ ہوتی ہیں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی وہ حرکت کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس کا مکردہ بدن درختوں کے نیچے پگڈنڈی کے قریب پڑا ہوا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اندھیرا دیکھ رہا تھا اور ذہن میں عجیب و غریب خیالات سرایت کررہے تھے۔ وہ نو دریافت حقائق پر غور کررہا تھا۔ ان کا تجزیہ کررہا تھا۔ وہ روشنی کا منتظر تھا جب چیزیں دیکھ سکتی ہیں اور زندہ ہوکر حرکت کرنے لگتی ہیں۔

ابھی تک دور ڈھلان پر ایستادہ درخت' ملگجے آسمان کے پس منظر میں دکھائی دے رہے تھے۔ پھر انہیں بھی اندھیرا نگل گیا اور زمین و آسمان روشنی کو ترسنے لگے۔ اس کے خیال میں یہ موت کی دیوی تھی جو کائنات پر پوری طرح اپنا تسلط جما چکی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عالم' یہ مرگ آسا سکوت کب تک طاری رہے گا؟ پھر اچانک ہی درختوں سے پرے دور آسمان پر مدہم سی روشنی پھیلنے لگی۔ اس کے لیے یہ ایک ناقابل یقین سی بات تھی مگر وہ اپنی بصارت کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ کیا کوئی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوسکتا ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا تو کیا وہ جانور بھی جسے اس نے چیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا اس کی طرح دوبارہ زندہ ہوجائے گا؟ وہ متحیر ذہن کے ساتھ اس کرشمے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ روشنی سورج کی نقیب تھی۔ شاہ خاور' جمال وجلال کا مرقع بنا نمودار ہوا تو زمین پر زندگی کی رونق اور گہما گہمی پھیل گئی۔ درختوں پر پرندے پھڑ پھڑا کر بے دار ہوئے اور خالق کائنات کی حمد و ثناء میں مصروف ہوگئے۔ عطر بیز ہواؤں کے اشارے پاکر پتے تالیاں بجانے لگے' منہ بند کلیوں کو قرمزی کرنوں نے چوما تو اس جسارت سے قوس قزح سے رنگین پروں والی تتلی تھرکتی ہوئی آئی اور فطرت کی رعنائیوں سے مسحور ہوکر نو شگفتہ پھولوں کی آغوش ٹٹولنے لگیں۔ دھوپ نے درختوں سے اتر کر جھاڑیوں کے تاریک گوشوں اور مخملیں گھاس کے قطعات کو اجال دیا۔

"میں پھر سے زندہ ہوگیا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ یہ محض اس کا احساس تھا حالانکہ وہ زندگی سے قطعی عاری تھا۔

"میں زندہ ہوگیا ہوں کیونکہ میں دیکھ سکتا ہوں۔" وہ اپنی قدآور ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ سورج بھی عجیب منصف مزاج تھا جو دل کش پودوں' رنگین پھولوں اور شاداب درختوں کے ساتھ ساتھ اس کریہہ المنظر جسم پر بھی یکساں طور پر اپنی کرنیں نچھاور کررہا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ بلاتفریق و امتیاز' کرہ ارض کی ہر شے کو اپنی توانا اور حرارت و زندگی بخش روشنی سے فیض یاب کرے۔ رات کی استراحت نے اس کے بدنما داغوں اور بے ہنگم گومڑوں کو نم آلود کردیا تھا اور جگہ جگہ سبز کائی کی ہلکی ہلکی تہیں جم گئی تھیں۔ دھوپ اس نمی اور کائی کو چاٹنے لگی۔ اس نے قدم بڑھایا تو نمی کے قطرے کائی کو ساتھ لیے ہوئے جھڑنے لگے۔ وہ ڈھلوان پر بکھری' ٹامی کی لاش کی طرف جارہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ' وہ بھی اس کی طرح دوبارہ زندگی پاچکا ہے؟

شبینا کی آنکھ کھلی تو اس کے کمرے میں دھوپ اتر آئی تھی۔ ناصر چچا جاچکے ہیں۔ یہ پہلا خیال تھا جو اس کے بے دار ذہن میں آیا۔ ابا رات کو اکیلے ہی سوئے تھے اور پھر ایک گھنٹے تک امی پر برستے رہے تھے۔

"ناصر کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اس نے مجھ پر بندوق تان لی تھی۔" وہ گرج رہے تھے اور وہ اپنا دم سادھے بستر پر پڑی لرز رہی تھی۔ "اس نے مجھ پر اپنے بڑے بھائی پر ایک فائر بھی کیا تھا۔ اب کہیں اگر وہ مجھے نظر آیا تو میں اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔ وہ انتہا درجے کا کاہل اور خودغرض ہے۔"

یہ تلخ باتیں یاد آتے ہی شبینا کا دل لرز اٹھا۔ وہ اپنے باپ سے اچھی طرح واقف تھی۔ جب انہیں غصہ آتا تھا تو پھر وہ کسی کی نہیں سنتے تھے۔ اب چچا ناصر یہاں کبھی نہیں آسکیں گے۔ ابا نے انہیں دیکھ لیا تو یقیناً گولی ماردیں گے۔

وہ بستر سے اٹھی اور کھڑکی پر آ کھڑی ہوئی۔ آغا طاہر لگام اور زین اٹھائے اصطبل کی طرف جارہا تھا۔ نیچے باورچی خانے میں برتن کھڑکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہ غسل خانے میں گھسی اور منہ ہاتھ دھوکر تولیا لیے باہر آگئی۔ پھر اس نے ایک دھلی ہوئی قمیص اور پتلون پہنی اور سیڑھیاں اتر کر باورچی خانے میں گھس گئی۔ اس کی امی ناشتے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ "کیا چچا ناصر اب تک نہیں آئے امی؟" اس نے سلام کیے بغیر پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔" نورین نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اپنی امی کے چہرے پر اداسی دیکھ کر شبینا بھی دکھی ہوگئی۔

"وہ کہاں چلے گئے امی؟"

"پتا نہیں شمی، تم بیٹھو اور ناشتا کرلو۔" نورین نے پلیٹ میں ناشتا نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"یہ حرام زادہ کیا ہوتا ہے امی؟"

شبینا نے سادگی سے پوچھا۔ یہ لفظ رات کو اس نے اپنے باپ کی زبان سے سنا تھا۔

نورین کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔

"شمی ایسی باتیں نہیں کیا کرتے بیٹی۔"

"اچھا، امی تو پھر چچا ناصر کیوں ہوئے، کیا کیسے ہوئے؟ حرام......!"

"شمی۔" نورین نے اسے بے طرح ڈانٹ دیا۔

"اوہ امی، اس میں کیا بات ہے، آپ بتا کیوں نہیں دیتیں؟" شبینا کی رگوں میں اپنے سرکش باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔

"میں نے رات طاہر سے کہا تھا......!" وہ بڑبڑائی جیسے خود سے مخاطب ہو "کہ یوں نہ چلائیں۔"

"اس کا مطلب کچھ بھی ہوا امی۔" شبینا نے خود ہی فیصلہ سنا دیا۔ "مگر چچا ناصر ایسے نہیں ہوسکتے کیا وہ پھر شکار پر گئے ہیں؟"

"وہ اپنے ٹامی کی تلاش میں گیا تھا جان۔"

"ٹامی امی کیا ٹامی بھی چلا گیا؟ کیا اب وہ بھی واپس نہیں آئے گا؟"

"نہیں جان اور شمی خدا کے لیے یہ سوالات بند کرو۔"

"اچھا امی، مگر وہ گئے کہاں ہیں؟"

"شمالی جنگل میں بس اب چپ ہوجاؤ۔" نورین نے کہا اور طاہر کی جھوٹی پلیٹیں صاف کرنے لگی۔

شبینا اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا ناشتا کرتے ہوئے وہ گاہے گاہے دزدیدہ نظروں سے اپنی امی کو بھی دیکھے جارہی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں امی اس کے خیالات نہ پڑھ لیں۔ اگر ابا نے چچا ناصر کو گولی ماردی تو یہ بہت برا ہوگا کسی کو انہیں خبردار کردینا چاہیے انہیں بتا دینا چاہیے کہ ڈیڈی سخت غصے میں ہیں وہ ابھی اس طرف نہ آئیں۔

شبینا جنگل کے آدھے راستے میں ہی تھی کہ دور وادی میں ناصر کی رائفل کے دھماکے گونجنے لگے۔

آغا طاہر نے یہ دھماکے اپنے کھیت میں سنے۔ وہ اس وقت ہل چلا رہا تھا۔

"ہو۔" اس نے پکار کر گھوڑوں کو روکا اور خاموش ہو کر فائر گننے لگا۔ "ایک...... دو...... تین...... چار...... شاید کسی کو دیکھ لیا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "اسی لیے بڑی احتیاط سے فائر کر رہا ہے۔ اوہ میرے خدا اس نے لگام سنبھالی اور گھوڑوں کو چلاتا ہوا درختوں کے جھنڈ تلے آ گیا۔ "ناصر اور قاتل۔" وہ گھوڑوں کو باندھتے ہوئے بولا پھر اپنی رائفل لینے گھر کی طرف دوڑ گیا۔ نورین دروازے کے باہر کھڑی ہوئی تھی اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں سے خوف مترشح تھا۔

"کارتوس نکالو" وہ بیوی سے کہتا ہوا گھر میں گھس گیا۔ نورین بھی اس کے پیچھے اندر آ گئی پھر وہ شکاری چاقو اپنی کمرے سے باندھ رہا تھا کہ وہ کارتوس کا ڈبا لے کر آ گئی۔ "طاہر" اس کی آواز لرز کر رہ گئی۔

"تم نے بھی گولیوں کی آواز سنی ہے۔ ناصر واقعی پاگل ہو گیا ہے وہ اس طرح گولیاں ضائع نہیں کرتا اس نے یہ فائر کسی آدمی پر کیے ہیں۔ جانوروں کو شکار کرنے میں وہ اس قدر محتاط نہیں ہوتا۔ وہ یقیناً کسی آدمی کے پیچھے ہے میری بندوق لاؤ۔"

"طاہر شبینا؟"

"تم اسے گھر میں ہی رکھنا اوہ خدایا۔ کس مصیبت میں پھنس گئے۔ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ دروازے کی طرف لپکا۔

نورین نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ "طاہر میں آپ کو کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔ شبینا گھر پر نہیں ہے۔ میں اسے ہر جگہ پکار آئی۔"

طاہر کا جسم ایک جھٹکے سے تن گیا اس کی آنکھوں سے آگ سی نکلنے لگی۔ "تم نے اسے آخری بار کہاں دیکھا تھا؟" اس نے وحشت ناک آواز میں سوال کیا۔

"ناشتے پر باورچی خانے میں۔" وہ رونے لگی۔

"کیا وہ کچھ کہہ کر گئی ہے؟"

"نہیں البتہ وہ ناصر کے بارے میں سوالات کر رہی تھی اور پوچھا تھا کہ وہ کہاں گیا؟"

"تو تم نے اسے بتا دیا؟"

نورین کی آنکھیں پھیل گئیں اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی ہتھیلی کاٹنے لگی۔ "تمہیں یہ بات اسے نہیں بتانی چاہیے تھی نورین۔" وہ دانت پیستا ہوا بولا۔ پھر رائفل لہراتا ہوا جنگل کی سمت دوڑ گیا۔ نورین اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور اسے نگل لے۔

طاہر سر اٹھائے آنکھیں پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا جنگل میں جاتی پگڈنڈی پر دوڑ رہا تھا۔ بتدریج اس کی سانس پھولتی جا رہی تھی۔

وہ ڈھلان پر سے اتر کر جنگل میں آ گیا' پھر فضا میں پھیلی ہوئی بو سے بے نیاز وہ جھاڑیوں اور درختوں میں چکرانے لگا۔ اچانک اس نے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں کوئی حرکت محسوس کی۔ وہ ایک دم سے زمین پر گر گیا اور سانس روک لیا۔ پھر کہنیوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ اب آگے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً جھاڑیوں میں کوئی تھا۔ جو اب ساکت ہو گیا تھا۔ طاہر نے ٹانگیں اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس دوران خون کی رفتار معمول پر آتے ہی اسے اپنے جسم میں تازگی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے بارہ بور کی شاٹ گن کندھے سے لگائی اور اس کا رخ جھاڑیوں کی طرف کر دیا۔

"باہر آ جاؤ" وہ چلایا۔ مگر دوسری طرف سناٹا ہی رہا۔

"جھاڑی میں سے سامنے آ جاؤ ورنہ خدا کی قسم گولی چلا دوں گا۔" اس بار بھی دیر تک خاموشی رہی۔

طاہر کی انگلی ٹرائیگر پر جم گئی۔
"تم نے خود مجھے فائر کرنے پر مجبور کیا ہے۔" وہ غرایا اور گولی چلادی۔
دھماکا ہوتے ہی کوئی جھاڑی سے باہر آ گرا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی بے ساختہ تھی۔
وہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک منحنی سا بڈھا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر بچوں کی طرح گلابی اور معصوم تھا۔ طاہر نے ایسا چہرہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس چہرے پر خوف اور درد کے سائے لرز رہے تھے۔
وہ بہ مشکل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مسلسل چلائے جا رہا تھا۔ "اوہ! میرا ہاتھ اب گولی مت چلانا۔" "اوہ! میرا ہاتھ اب گولی مت چلانا۔" طاہر کھڑا ہو کر اس کے سامنے آ گیا بڈھا اسے دیکھتے ہی چپ ہو گیا۔ اس کی بھوری آنکھیں درد سے سکڑی جا رہی تھیں۔
"تم نے مجھ پر گولی چلائی ہے؟"
اس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔ جس میں سے خون ٹپک رہا تھا۔ "اوہ میرے خدایا۔"
"تم ہو کون؟" طاہر نے سخت آواز میں پوچھا۔
"اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"
بوڑھے پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اول فول بکے جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑنے لگے۔ طاہر نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے دفاع کے خیال سے بندوق تان لی، پھر وہ توجہ سے بوڑھے کی باتیں سننے لگا۔ "میرے کاغذات کھو گئے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ میں نے نہیں کیا ہے اوہ بے حد خوف ناک...... خوف ناک...... مردہ آدمی...... لاش...... اوہ دوبارہ گولی مت چلانا۔"
طاہر نے دوبارہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر بڈھا جیسے اپنے حواس کھو چکا تھا۔ طاہر لمبا ڈگ بھر کر اس کے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ بڈھا زمین پر گر پڑا۔ اچانک ہی اس کی زبان بند ہو گئی۔ پھر اس نے ایک لمحے کے لیے حیرت بھری نظروں سے طاہر کو دیکھا۔ اور بری طرح رونے لگا۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ سے تھپڑ والے رخسار کو سہلاتا جا رہا تھا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟" طاہر نے پھر سخت لہجے میں پوچھا۔
"اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
بڈھا ذرا دور لڑھک گیا پھر اٹھ بیٹھا۔
"میں نے نہیں کیا ہے۔" وہ سسکتا ہوا بولا۔ "میں نے نہیں کیا ہے میں تو ادھر سے گزر رہا تھا کہ اچانک میں نے بندوق چلنے کی آواز سنی پھر کوئی گالیاں بکنے اور غرانے لگا۔ پھر کوئی بری طرح چیخا میں دوڑ کر آواز کی سمت گیا وہاں ایک آدمی مرا پڑا تھا میں بھاگ اٹھا۔ پھر تم آ گئے میں جھاڑیوں میں چھپ گیا تم نے گولی چلادی اور......!"
"خاموش۔" طاہر گرجا۔ بڈھا یوں چپ ہو گیا جیسے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن بند کر دیا گیا ہو۔ "تم نے وہ لاش کہاں پر دیکھی ہے۔"
بڈھے نے ڈرتے ڈرتے ایک طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے۔ طاہر نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ "تم میرے گھر چلے جاؤ۔" وہ نرمی سے بولا۔ "جنگل سے نکل کر دائیں طرف" میری بیوی ہاتھ پر پٹی باندھ دے گی مگر اسے کچھ مت بتانا اور میرے واپس آنے تک گھر پر ہی رہنا سمجھے؟"
"ہاں سمجھ گیا شکریہ، شکریہ۔" بڈھا سر ہلا کر جلدی جلدی بولا۔
"اب چل دو۔" اس نے بڈھے کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی اور خود اس جانب بڑھ گیا جہاں رات کو اس

نے ناصر سے گفتگو کی تھی۔ ناصر اب بھی وہیں تھا اور وہاں ٹامی بھی تھا۔ ناصر کا پیارا کتا۔ ناصر اور ٹامی گہرے دوست تھے وہ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ وہ ساتھ شکار کھیلتے تھے لڑتے تھے وہ ساتھ کھاتے' پیتے اور سوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندہ رہے تھے اور اب وہ ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں جا سوئے تھے وہ مر گئے تھے اور دونوں کی موت میں بے حد یکسانیت تھی۔ آغا طاہر انتہائی مضبوط دل گردے کا آدمی تھا لیکن یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل گئی اور وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گیا۔ عفریت نے ان کے جسموں کو بڑے بہیمانہ انداز میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیا تھا۔ سیاہ لباس والا منحنی سا بڈھا اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے لرزتا' کپکپاتا پگڈنڈی پر بھاگ رہا تھا کچھ دور جا کر اس کی کپکپاہٹ دور ہو گئی اور دوڑنے کے بجائے وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے دل و دماغ پر چھائی دہشت بتدریج معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

پھر اس نے دو تین گہری سانسیں لیں اور بڑبڑایا۔

''میرے خدا او خدایا۔'' اس کے حواس بحال ہو گئے۔ اس نے جیب سے ایک ریشمی رومال نکال کر زخمی ہاتھ پر باندھ لیا مگر خون کی روانی کم نہ ہوئی۔ اس نے ہاتھ سے رومال کھول کر کہنی پر باندھا مگر درد ایک دم سے بڑھ گیا۔ اس نے رومال اتار کر دوبارہ جیب میں ٹھونس لیا اور زخمی ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرانے لگا۔ ذرا دیر بعد زخم پر خون جم گیا۔

یہ کوئی بڑا زخم نہیں تھا۔ اسے صرف دو چھرے لگے تھے جن میں ایک انگوٹھے کے گوشت میں سے پار نکل گیا تھا اور دوسرے چھرے نے محض ایک خراش ڈالی تھی اچانک فخر سے اس کی گردن تن گئی۔ وہ بندوق کی گولی کھا کر بھی بچ گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے دوستوں کو سنانے کے لیے ایک داستان ترتیب دینے لگا۔ وہ اب کوئی معمولی آدمی نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک مہم جو تھا جو ایک ایسے اچھے جنگل میں جہاں نہ سانپ تھے نہ درندے ایک خوف ناک حادثے سے دوچار ہو کر زندہ نکل آیا تھا۔ انہی خیالات میں مگن وہ بالکل محسوس نہیں کر سکا کہ اس کے پیچھے کیسی خوف ناک بلا چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ اس کی ناک سے بدبو کا ایک بھبکا ٹکرایا تھا مگر اس مہم کے خیالات اس قدر دل خوش کن تھے کہ اس پر ذرا توجہ نہ دے سکا۔

عفریت کے سینے پر تین سوراخ ہو چکے تھے۔ ان سوراخوں کا درمیانی فاصلہ بہت کم تھا۔ ایک چھوٹا سا سوراخ اس کی تنگ پیشانی کے وسط میں بنا ہوا تھا۔ اسی طرح قریب قریب تین سوراخ اس کی پشت پر اور ایک گدی پر جھانک رہا تھا۔ یہ سوراخ ناصر کی رائفل سے چلائی ہوئی گولیوں کا کرشمہ تھے جو کہ عفریت کے جسم سے پار نکل گئی تھیں۔ عفریت کا نصف چہرہ بھی ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا اور شانے پر ایک گہرا گڑھا پڑا ہوا تھا۔ یہ ناصر کی رائفل کی بٹ کی چوٹیں تھیں جب چار گولیاں کھانے کے بعد بھی عفریت زمین پر نہیں گرا تو ناصر وحشیوں کی طرح بندوق کی نال پکڑ کر اس پر پل پڑا تھا۔ ناصر کی گولیوں اور بٹ کی چوٹوں کا عفریت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ نہ اسے درد ہو رہا تھا اور نہ ہی غصہ آ رہا تھا۔ اسے تو حیرت تھی کہ آخر یہ آدمی کر کیا رہا تھا اور اب وہ عفریت اطمینان سے اس منحنی سے بڈھے کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اس کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر قدم پر اس کے بدن سے رقیق مادہ جھڑ جھڑ کر گھاس اور سوکھے پتوں میں جذب ہو رہا تھا۔ مگر اسے ذرا احساس نہیں تھا۔

بڈھا جنگل سے نکل آیا اور کنارے پر ایستادہ ایک بھاری درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا "بس بہت ہو چکا۔" وہ سوچ رہا تھا "اب یہاں رہ کر اس خوف ناک قتل کی تفتیش میں ملوث ہونے سے کیا فائدہ؟" وہ اس جنگل میں ایک پرانے شکاری کے مکان کے کھنڈرات کی تلاش میں آیا تھا اسے کچھ شہادتوں کی ضرورت تھی۔ مگر وہ رپورٹ جس میں ایک کھنڈر کی نشاندہی کی گئی تھی بڑی غیر واضح سی تھی۔ ایسی ناقص رپورٹ کی وجہ سے اب دوبارہ جنگل میں جانا اسے ذرا پسند نہ تھا۔ اس کے علاوہ تھوڑی سی دیر میں وہ جنگل سرخ ٹوپیوں والے سپاہیوں سے بھر جانے والا تھا۔ اسے اتنی فرصت نہیں تھی کہ قتل کی گواہی کے چکر میں پھنستا اور نہ ہی اسے اس کسان کی ہدایت کی پروا تھی جس نے اسے اپنے گھر جا کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔ وہ تو بس اب سیدھا شہر جانا چاہتا تھا۔

عفریت نے قریب آ کر اس درخت کی دوسری جانب اپنی پیٹھ ٹکا دی اچانک بڈھے کی ناک سے تعفن بھرا جھونکا ٹکرایا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال ٹٹولا مگر گھبراہٹ کی وجہ سے رومال نیچے گر گیا۔ جیسے ہی وہ رومال اٹھانے جھکا عفریت کا بھری بھر کم ہاتھ تنے کی اس جگہ پر پڑا جہاں ذرا دیر پہلے بوڑھے کا سر تھا۔ یہ ایک ایسی چوٹ تھی جو بلا شبہ بوڑھے کے معصوم چہرے کا بھرتا بنا دیتی۔ بوڑھا رومال اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا مگر رومال خون میں بھرا ہوا تھا اس لیے وہ اسے اپنی ناک پر نہ رکھ سکا۔ عفریت نے دوبارہ اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اسی لمحے بوڑھے نے رومال پھینکا اور درخت سے ہٹ کر میدان میں آ گیا۔ اس کا رخ کسان کے گھر سے دور اس پختہ سڑک کی طرف تھا جو شہر کی جانب جا رہی تھی۔

عفریت رومال پر جھک گیا۔ رومال اٹھا کر وہ دیر تک اس کا جائزہ لیتا رہا پھر کئی بار پھاڑا اور ان دھجیوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے رومال دوبارہ زمین پر پھینک دیا اور سر اٹھا کر دور جاتے ہوئے بوڑھے کی طرف نگاہیں جما دیں مگر اس سے بھی وہ جلد ہی اکتا گیا آخر اس نے سر جھٹکا اور مڑ کر جنگل میں اتر گیا۔

❁.....☆.....❁

گولیوں کی آواز سنتے ہی شینا نے دوڑنا شروع کر دیا چچا ناصر کو یہ بتانا بے حد ضروری تھا کہ ابا نے ان کے بارے میں کیا کہا تھا مگر اب اس کو زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ چچا ناصر نے کس جانور کا شکار کیا تھا۔ اوہ انہوں نے ضرور کسی بڑے جانور کو مار گرایا ہوگا۔ چچا ناصر اپنے کارتوس کبھی ضائع نہیں کرتے۔ ویسے یہ پہلی بار ہوا تھا کہ انہوں نے لگاتار اتنے فائر کیے تھے شاید کوئی پاگل ریچھ ہوگا۔ وہ سوچتی رہی اور دوڑتی رہی۔ دوڑتے میں اس بات کی بھی پروا نہیں کر رہی تھی کہ اس کے پیر ابھری ہوئی جڑوں سے شاخوں سے یا پتھروں سے ٹکرا رہے ہیں۔ یہ کبھی ٹھوکر زوردار لگتی تو وہ لڑکھڑاتی اور پھر سنبھل کر دوڑنے لگی۔ جوش و مسرت کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی سانس پھولتی جا رہی تھی مگر ذہن میں ریچھ کی کھال رقص کر رہی تھی جسے وہ اپنے کمرے میں سجانے کے لیے بے تاب تھی یا شاید امی کا کمبل بنوا دیں کیونکہ یہ ایک ریچھ کی کھال پہلے ہی اس کے کمرے میں بچھی ہوئی تھی۔ چچا ناصر رات کے وقت اس پر بیٹھ کر اسے مزے دار کہانیاں سنایا کریں گے۔ اوہ نہیں، اس نے اپنا نازک سا سر جھٹکا۔ ابا کی ان سے لڑائی ہو گئی ہے اور وہ اسے کہانیاں کیسے سنا سکتے ہیں؟ کاش وہ کچھ کر سکتی۔ سوچ میں ڈوبی ہوئی پریشان سی وہ اور تیزی سے بھاگنے لگی مگر جلد ہی اس کا سانس پھول گیا اور اس کے قدم سست پڑ گئے۔

ٹیلے پر پہنچ کر اس نے جنگل کی طرف دیکھا' پھر اپنے گھر کی طرف نظر ڈالی۔ دور وادی میں ان کا کھیت تھا اس کی نگاہیں کھیت میں اپنے ابا کو ڈھونڈنے لگیں۔ آغا طاہر جلد ہی اسے نظر آ گیا وہ گھوڑوں کو درختوں تلے باندھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ابا کو گھر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔

پھر اس نے اپنے گھر کی طرف نظر دوڑائی۔ ذرا سی دیر بعد آغا طاہر گھر سے نکلتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن دبی ہوئی تھی اور وہ جنگل ہی کی طرف بھاگا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔

''کہیں وہ مجھے ہی پکڑنے تو نہیں آ رہے؟'' شینا نے خوف زدہ ذہن سے سوچا۔ ''انہوں نے لازما یہ سوچا ہو گا کہ گولیوں کی آواز سن کر میں چچا ناصر کی تلاش میں نکل آئی ہوں۔ اب وہ اس کے تعاقب میں اس لیے آ رہے ہیں کہ چچا ناصر تک پہنچ جائیں اور پھر انہیں گولی مار دیں۔ وہ اس کے نقوش پا دیکھتے ہوئے چلے آئیں گے مگر......!'' وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔

''میں بھی ابا کو ایسا چکر دوں گی یاد ہی کریں گے۔''

وہ ٹیلے سے اتر کر جنگل کی طرف بھاگی۔ وہ اس بات کا خیال رکھ رہی تھی کہ اس کے قدموں کے نشان گہرے نہ ہونے پائیں تقریباً سو گز دوڑ کر جنگل میں گھس گئی اور اس گھنے حصے کی طرف بڑھی پھر وہ درخت پر چڑھ گئی اور گلہری کی طرح ایک سے دوسرے درخت پر ہوتی ہوئی دور جا کر زمین پر اتر گئی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ ''اب انہیں مجھ تک پہنچنے کے لیے گھنٹوں چکرانا پڑے گا۔'' وہ اپنے باپ کو بے وقوف بنانے کے خیال سے ہنس پڑی۔ مگر اس کی دھیمی سی مترنم ہنسی دم توڑتے ہوئے ناصر کی دہشت ناک چیخ میں ڈوب گئی۔

وہ دوڑتی ہوئی پگڈنڈی تک پہنچی پھر اسے پار کر کے قریب کی ایک جھاڑی میں دبک گئی گولیوں کی آواز یہیں کہیں قریب سے آئی تھی۔ وہ پوری توجہ سے سنتی رہی اچانک اسے احساس ہوا جیسے کوئی بڑی تیزی سے اس کی طرف آ رہا ہے وہ کچھ اور سکڑ گئی۔ یہ ایک بچکانہ سے چہرے والا منحنی سا بوڑھا تھا جس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا چمڑے کا بیگ جھاڑیوں میں اٹکا جا رہا تھا۔ پھر بیگ ایک شاخ سے الجھا اور اس کے سامنے زمین پر آ رہا بوڑھا خوف سے لرزتا آگے بڑھ گیا۔ اسے بیگ اٹھانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔

شینا دیر تک جھاڑیوں میں دبکی رہی پھر اس نے بیگ اٹھایا اور جنگل کے گھنے حصے کی طرف لوٹ آئی۔ یہ تیزی سے رونما ہوتے ہوئے حالات اس کے چھوٹے سے ذہن کی گرفت سے باہر تھے۔ وہ چچا ناصر سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسے پکارے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ جنگل کے کنارے آ گئی تو اچانک اپنے باپ کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔ وہ کسی آدمی سے بول رہا تھا۔ شاید یہ وہی آدمی تھا جو اپنا بیگ گرا کر آیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے خوف سے پیچھے ہٹ آئی اور اسے اس خوف ناک اور پراسرار ماحول میں ایک طرح کا لطف آ رہا تھا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کچھ کرنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے فاتحانہ انداز میں دو انگلیاں اپنے منہ میں دبا لیں۔ وہ اور چچا ناصر اکثر اس جنگل میں آ کر کھیلا کرتے تھے اور مختلف قسم کے خفیہ سگنل ایجاد کر رکھے تھے۔ وہ بڑی مہارت سے کئی پرندوں کی آواز نکال سکتی تھی۔ وہ کس کی آواز نکالے؟ اس نے سوچا' نیل کنٹھ کی پھر نیل کنٹھ کی تیز آواز جنگل کے سناٹے میں تیر گئی۔ اس نے ایک بار پھر یہ

آواز نکالی۔

فوراً ہی اس کی آواز کا جواب آ گیا۔ کوئی نیل کنٹھ بار بار وقفے وقفے سے چلائی۔ شبینا نے مسرت سے سر ہلایا۔ اشارہ ایک مخصوص جگہ پر پہنچنے کا تھا۔ جسے وہ کنج کہتے تھے۔ ہر جگہ چچا ناصر کی دریافت تھی۔ اس کے اور شبینا کے علاوہ کسی کو اس پوشیدہ جگہ کا علم نہیں تھا۔ ان کا یہ کنج ایک چٹان کے عقب میں چشمے کے قریب واقع تھا۔ یہ ایک مکمل غار تو نہیں مگر غار ہی کی طرح کا ایک کوٹھری نما گڑھا تھا۔ جس کے سوراخ میں سے باآسانی ایک آدمی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ شبینا خوشی سے اچھلتی ہوئی چشمے کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ چچا ناصر نے ضرور نیل کنٹھ کی آواز سن لی ہوگی اور اس کا مطلب بھی سمجھ گئے ہوں گے۔

☆

آغا طاہر کو سنبھلنے میں کافی دیر لگ گئی بلاشبہ یہ ایک بھیانک منظر تھا۔ وہ منہ پھیر کر صنوبر کے درخت کے سہارے ٹک گیا اور ہانپنے لگا۔ ناصر، ہاں وہ ناصر ہی تھا جو دور تک بکھرا پڑا تھا۔ ”خدایا! خدایا۔“ وہ سسک پڑا جب اس کی طاقت بحال ہوئی تو وہ دل کڑا کر کے مڑا پھر احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا بڑھا اور جھک کر ناصر کی رائفل اٹھالی۔ اس کی نال صاف اور چمک دار تھی مگر بٹ پر کوئی متعفن مادہ لپٹا ہوا تھا۔ یہ غلیظ مادہ اس نے کہاں دیکھا تھا؟ کہیں دیکھا ضرور تھا۔ جانے کہاں؟ وہ بے دھیانی سے پتے توڑ توڑ کر بٹ صاف کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں ناصر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے پچھلی ہی رات یہ باتیں کہی تھیں؟

”میں اس وحشی کا تعاقب کرنا چاہتا ہوں میں اسے جہنم تک نہیں چھوڑوں گا۔ میں ٹامی کا انتقام لیے بغیر گھر نہیں آؤں گا۔“ طاہر نے زمین پر نگاہ دوڑائی۔ اسے ناصر کی گولیوں کا ڈبا بھی نظر آ گیا۔ ڈبا گیلا اور چپچپا ہو رہا تھا۔ ”یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”ناصر کے دشمن کے جسم میں ناصر کے خون سے بھیگی ہوئی گولیاں اترنی چاہیے۔“ وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔ وہ کچھ دور نکل گیا پھر لوٹ آیا۔ اس کی نگاہیں زمین پر ثبت بڑے بڑے پیروں کے نشانات پر گڑی ہوئی تھی۔

”اب میں تمہارے دشمن کا تعاقب کروں گا ناصر۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا مگر اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے دانت بھینچ کر آنسو پی لیے۔ نشانات کو دیکھتا ہوا وہ ایک جانب چل دیا۔ جھاڑیوں میں درخت کی جھومتی شاخوں میں اور سبزے پر وہی تعفن پھیلا ہوا تھا ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اس کے جسم میں نفرت اور غصے کا طوفان شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب اسے انتقال کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ اپنے بھائی کے قاتل کو ہر قیمت پر کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو مطعون کرنے لگا۔ آخر پچھلی رات وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر کیوں نہ لے گیا؟

قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا وہ جنگل کے کنارے کھڑے ہوئے بھاری درخت کے قریب آ گیا مگر وہاں کچھ اور نشانات بھی تھے اس سیاہ لباس والے شہری بڈھے کے نشانات قریب ہی ریشمی رومال کی دھجیاں بکھری ہوئی تھیں اور وہاں اور بھی کچھ تھا۔ کچھ اور نشانات، چھوٹے چھوٹے پیروں کے نشانات، خدایا شبینا۔

”وحشی۔“ وہ پوری قوت سے چلایا۔ ”شبینا۔“ مگر وہی منہ چڑاتی بازگشت اور سسکیاں بھرتی ہوائیں۔ دور کہیں کوئی نیل کنٹھ چلایا۔

شبینا ٹھٹک گئی۔ اس نے اپنے ابا کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ اسے پکار رہے تھے اس نے مڑ کر دیکھا۔

”دیکھو کیسے چلا رہے ہیں۔“ وہ معصومیت سے

ہنس پڑی۔ ''کیسا مزا آرہا ہے جیسے پاگل ہو رہے ہیں۔'' اس نے پھر ایک بار نیل کنٹھ کی آواز نکالی اور پوشیدہ غار کی طرف چل دی۔ چشمے کے قریب ایک بھاری سا گول پتھر گرا ہوا تھا۔ اس سے آگے ایک اور چٹان کا ایک حصہ چشمے کے پانی پر جھکا ہوا تھا اور پچھلا سرا جھاڑیوں میں سے ہی تھا۔ یہ چٹان اس غار کے لیے چھت کا کام بھی دیتی تھی۔ شبینا نے جھاڑیاں ہٹا کر منہ اندر کیا اور دھیرے سے پکارا۔ ''چچا ناصر۔'' مگر اندر سناٹا ہی رہا کوئی بات نہیں۔ اس نے سوچا بس آنے ہی والے ہوں گے وہ پھسل کر کنج میں آ گئی۔ یہ جگہ اسے بے حد پسند تھی۔ سایہ دار اور سرد۔ اس چٹان میں چشمے کی طرف بھی ایک سوراخ تھا سورج کی کرنیں جب پانی پر مچلتیں تو اس کا عکس اندر آ جاتا پھر مسلسل بہتے پانی کی موسیقی بھی جو کنج میں گونجتی رہتی تھی یہ موسیقی شبینا کو مست و بے خود کر دیا کرتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے چچا ناصر کو پکارا مگر کوئی جواب نہ پا کر اطمینان سے ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھ گئی اور اسے احساس ہوا کہ بوڑھے کا بیگ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے ایک دو بار اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر کھول دیا۔ بیگ کے درمیان چمڑے کی ایک دیوار تھی جس نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ایک حصے میں چند کاغذات اور بڑا سا زرد لفافہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں کچھ سینڈوچز؛ مٹھائی اور ایک سیب تھا شبینا کا جی خوش ہو گیا اسے اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے بھوک لگنے لگی تھی۔ اس نے سینڈوچ اور تھوڑی سی مٹھائی چچا ناصر کے لیے الگ کی اور باقی سب کچھ چٹ کر گئی اب اس کے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے دوسرے حصے میں سے کاغذات نکالے اور انہیں دیکھنے لگی۔

کاغذات میں ایک اخبار کا تراشہ بھی تھا جس میں لوگوں کی چھوڑی ہوئی عجیب و غریب وصیتوں کا احوال درج تھا۔ ایک خاتون اپنی دولت اس آدمی کے نام کر گئی تھی جو چاند پر جا کر خیریت سے لوٹ آئے۔ ایک اور مال دار آدمی نے اپنا سب کچھ اپنی بلیوں کے نام لکھ دیا تھا۔ ایک امریکی سرمایہ دار نے دس ہزار ڈالر اس آدمی کو دینے کی وصیت کی تھی جو ریاضی کا ایک مخصوص سوال حل کر دے مگر ایک وصیت ایسی بھی تھی جس کے گرد نیلی پینسل سے دائرہ بنا ہوا تھا۔ یہ عجیب و غریب وصیت انیس سو چالیس میں ملک اللہ داد خاں نے کی تھی۔ ملک اللہ داد خاں نے اپنی جاگیر پر ایک شاندار قبرستان تعمیر کروایا تھا اس قبرستان میں خاندان کے ہر فرد کے لیے ایک مقبرہ بنوایا تھا۔ ملک اللہ داد خاں نے اپنے پورے ملک میں سے اپنے رشتے داروں کی قبریں کھدوا کر ان کے باقیات کو ان مقبروں میں دفن کرا دیا تھا۔ اس نے اپنا مقبرہ بھی اپنی زندگی میں ہی تعمیر کرا لیا تھا اور اب وہ اسی میں دفن ہے مگر ان خاندانی مقبروں میں سے اس کے دادا کا مقبرہ ابھی تک خالی پڑا ہے ملک اللہ داد اپنے خاندان کا آخری فرد تھا اس کی وصیت کے مطابق ہر سال ان مقبروں کی مرمت اور رنگ و روغن ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وصیت کا اہم ترین حصہ یہ تھا کہ جو کوئی بھی اس کے دادا کی باقیات کو تلاش کر کے اس مقبرے میں دفن کرائے گا اسے انعام کے طور پر ایک خطیر رقم دی جائے گی۔

شبینا کو جمائیاں آنے لگیں مگر چونکہ کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے وہ پڑھتی ہی رہی۔ اخباری تراشے کے ساتھ وکلاء کی ایک مشہور فرم کا ایک خط اب بھی منسلک تھا۔ شبینا نے وہ خط پڑھنا شروع کر دیا اس میں تحریر تھا۔

جناب ملک اللہ داد خاں مرحوم کے دادا جناب ملک

خداداد خاں سے متعلق استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ ان کا قد پانچ فٹ پانچ انچ تھا۔ ان کا بایاں بازو ٹوٹا ہوا تھا اور کاسہ سر میں ایک چاندی کی چھوٹی سی مثلث پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ آج تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ان کی موت کہاں واقع ہوئی تھی مرحوم بس اچانک ہی غائب ہوگئے تھے پھر چودہ سال بعد قانونی طور پر ان کی موت کا اعلان کردیا گیا تھا۔

وصیت میں درج شدہ انعام اور اس پر آج تک کا سود ملا کر کل رقم باسٹھ ہزار روپے ہوگئی ہے یہ رقم اس شخص کو ادا کی جائے گی جو مرحوم کی باقیات دریافت کرے۔ اگر مرحوم کے ڈھانچے سے ان کے اصل ہونے کی شہادت مل گئی تو رقم فوری طور پر اس کے حوالے کردی جائے گی اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا مگر شبنیا نے بور ہو کر سارے کاغذات ایک طرف اچھال دیے اور چچا ناصر کے بارے میں سوچنے لگی۔ جانے وہ کہاں ہیں۔ پھر وہ ایک گیت گنگنانے لگی یہ گیت چچا ناصر گایا کرتے تھے اور شبنیا بار بار اصرار کر کے سنتی تھی غار کے منہ پر اگی ہوئی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سن کر چوکنا ہوگئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا کوئی انہیں ایک طرف ہٹا رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دوڑ کر ایک ابھرے ہوئے پتھر کے پیچھے جا چھپی وہ دل ہی دل میں ہنس رہی تھی چچا ناصر آئیں گے اور وہ ایک دم سے اچھل کر ان کے سامنے آجائے گی۔ تو وہ کیسے گھبرائیں گے۔

کوئی غار کے دہانے سے پھسلتا ہوا دھم سے اندر آیا لیکن جانے یہ کیسی آواز تھی؟ شبنیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اسے احساس تھا کہ چچا ناصر جیسے صحت مند آدمی کے لیے بھی غار کے منہ سے اترنا ایک وقت طلب کام تھا اور اندر آ کر وہ ایک گہرا سانس لیا کرتے تھے مگر دھم کی آواز کے ساتھ سانس کی آواز نہیں آئی۔ لگتا تھا جیسے جو کوئی بھی اندر آیا وہ سانس لے ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے پتھر کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ غار کے اندر چچا ناصر کے بجائے ایک انتہائی خوف ناک اور بے ہنگم آدمی کھڑا تھا۔ جیسے کسی نے گیلی مٹی کے ڈھیر کو انسانی روپ دینے کی ناکام کوشش کی ہو۔ دوسری جانب اسے آنے والی دھوپ میں اس کے جسم کے بعض حصے خشک اور بعض گیلے نظر آرہے تھے۔ چہرے کا بایاں نصف حصہ بالکل غائب تھا۔ منہ اور ناک گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔ ایک آنکھ اوپر اور دوسری اس سے ہٹ کر نیچے بنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں سفیدی اور سیاہ پتلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھورے ڈھیلے چمک رہے تھے۔ وہ بالکل ساکت کھڑا اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پورا بدن ایک ہلکے سے ارتعاش کے سوا مکمل طور پر بے حس و حرکت تھا۔ وہ پوری توجہ سے شبینا کے منہ سے نکلنے والی دہشت بھری آوازیں سن رہا تھا۔ شبینا پیچھے کھسکتی ہوئی غار کے اندر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے خلا میں رینگ گئی اس کے دماغ میں بگولے سے اٹھ رہے تھے وہ اس قدر ڈراؤنے انسان کا تصور تک نہیں کرسکتی تھی اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر آواز اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑ رہی تھی۔ چہرہ یوں سرخ ہوگیا تھا جیسے اس کا گلا گھونٹا جارہا ہو اور جسم کا سارا خون سمٹ آیا ہوا۔ کاش وہ غار سے باہر ہوتی یا غار کے بڑے حصے میں ہوتی تو کسی نہ کسی طرح نکل کر بھاگتی یا پھر کاش وہ اپنے گھر پر ہی ہوتی۔

وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ یوں قدم اٹھا رہا تھا جیسے ان میں کوئی مشین لگی ہوئی تھی۔ وہ منجمد سی آنکھیں پھاڑے ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ خوف و

دہشت سے اس کے بدن کا ایک ایک بال کھڑا ہوگیا تھا اور دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے پسلیاں توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ عفریت اس چھوٹے سے خلا کے منہ پر آ کھڑا ہوا پھر اس نے اندر گھسنے کی کوشش کی مگر خلا کے تنگ دہانے نے اسے باہر ہی روک لیا۔

وہ شبینا تک پہنچنے کے لیے اپنے شانوں سے دہانے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عفریت کے جسم سے تعفن کے بھپکے اٹھ رہے تھے۔ شبینا کے لرزتے ہوئے دل میں امید کی ایک کرن چمکی۔ وہ اندر نہیں آ سکتا تھا وہ اس خلا میں نہیں آ سکتا تھا کیونکہ وہ بھاری بھر کم تھا۔

شدید دباؤ کی وجہ سے اس کے پیروں کا مادہ پگھلنے لگا پھر اس کے شانے میں ایک دراڑ پڑ گئی۔ وہ ہر بات سے بے نیاز سنگی دہانے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

عفریت کے جسم سے تعفن کے بھپکے اٹھ رہے تھے۔ شبینا کے لرزتے ہوئے دل میں امید کی ایک کرن چمکی۔ وہ اندر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اس خلا میں نہیں آ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بھاری بھر کم تھا۔

شدید دباؤ کی وجہ سے اس کے پیروں کا مادہ پگھلنے لگا پھر اس کے شانے میں ایک دراڑ پڑ گئی۔ وہ ہر بات سے بے نیاز سنگی دہانے پر دباؤ ڈالتا رہا۔ اچانک اس کے کندھے سے ایک لوتھڑا سا ادھڑنے لگا اور پھر اندر کی طرف گر گیا۔ شبینا پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگی۔ وہ اپنی غیر انسانی بھوری آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا خوف ناک ہاتھ شبینا کی طرف بڑھایا۔

شبینا پتھریلی دیوار سے چپک گئی۔ اس سے زیادہ پیچھے ہٹنے کی ایک انچ بھی گنجائش نہ تھی۔ خوف ناک ہاتھ اس تک پہنچ گیا اور اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔ شبینا کی صاف ستھری قمیص پر ایسا نشان بن گیا جیسے کسی نے سیاہ بدبودار کیچڑ تھیٹر دی ہو پھر اس بے ڈول ہاتھ نے اس کی چٹیا پکڑ لی اور شبینا کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بالوں پر جھول رہی تھی جو اس عفریت کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھے۔

وہ شبینا کو بالوں سے اٹھائے غار کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ دونوں کے چہروں کا درمیانی فاصلہ ایک فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ انتہائی متجسس آنکھوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا اور اسے آگے پیچھے جھلا رہا تھا۔ بالوں کو کھینچنے سے پیدا ہونے والے درد نے وہ کام کر دیا جو انتہائی دہشت بھی نہ کر سکی تھی۔ اسے آواز مل گئی اور وہ بری طرح چیخ اٹھی۔ پھر اس کے صحت مند پھیپھڑوں نے ہوا نگلی اور پوری قوت سے چیخ کی صورت میں باہر نکال دی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ مگر عفریت پر ان چیخوں کا مطلق اثر نہ تھا۔ وہ اسے اسی طرح بالوں سے پکڑے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ اپنے ذہن کے مطابق اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا تو بالوں پر گرفت ڈھیلی کر دی شبینا نیچے گر پڑی شبینا کو چھوڑ کر اس نے غار میں نظر دوڑائی۔ اسے چمڑے کا بیگ دکھائی دیا اس نے جھک کر بیگ اٹھایا اور دنوں ہاتھوں سے اسے یوں پھاڑ دیا جیسے وہ چمڑے کا بیگ نہیں محض کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ چچا ناصر کے لیے چھوڑا ہوا سینڈوچ زمین پر گر گیا۔ اس نے جھک کر سینڈوچ اٹھایا ایک لمحے کے لیے اس کا جائزہ لیا پھر انگلیوں سے مسل کر دور پھینک دیا۔

شبینا نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی اسے آزادی کا احساس ہوگیا۔ عفریت مڑ کر غار کے دہانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شبینا اٹھ بیٹھی پھر جھکی جھکی تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلی اور غار

سے باہر کر چشمے میں کود گئی پھر وہ چیختی چلاتی تیرتی ہوئی چشمہ پار کر کے دوسرے کنارے پر جا کھڑی ہوئی۔

عفریت بھی غار سے نکل کر چشمے کے کنارے آ گیا تھا۔ وہ گہری نظروں سے بہتے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ شبینا کا خون کھول اٹھا اب وہ اس کی پہنچ سے دور تھی۔ اس نے کنارے پر پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا۔ پتھر عفریت کے پیر پر پڑا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اسے توازن برقرار رکھنے کی مشق نہیں تھی۔ اس لیے دوسرے ہی لمحے وہ چشمے کے پانی میں جا گرا۔ کچھ دیر تک وہ کنارے پر مچلتا رہا پھر پھسلتا ہوا گہرائی میں آ گیا۔ شبینا مڑ کر دیکھے بغیر چلاتی ہوئی جنگل کی طرف دوڑنے لگی۔

آغا طاہر قاتل کے بدبودار نشانات کے تعاقب میں بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ چشمے کے قریب جنگل میں تھا کہ اس کی سماعت سے شبینا کی دہشت بھری چیخ ٹکرائی۔ وہ ایک ثانیے کے لیے ٹھٹکا' پھر شاٹ گن پھینک کر ناصر کی رائفل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے آواز کی سمت دوڑ پڑا۔ بیٹی کے خیال سے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ جھونک میں غار والی چٹان سے دور نکل گیا۔ اسی وقت اسے شبینا غار سے نکل کر چشمے کی طرف بھاگتی نظر آئی۔ پھر وہ چشمے میں گری اور تیرتی ہوئی اسے پار کر گئی۔ وہ اس کی طرف دوڑا اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی بے حد خوف ناک چیز اس کے تعاقب میں غار سے نکل رہی تھی۔ اس نے شبینا کو پتھر مارتے دیکھا پھر وہ جنگل کی طرف بھاگ اٹھی۔ طاہر بھی پوری قوت سے اس کی طرف بھاگا اور شبینا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ باپ کے بازوؤں میں آ کر بھی وہ دیر تک چلاتی رہی۔ لگتا تھا جیسے دہشت اس کے دماغ پر غالب آ گئی ہو اور وہ اپنے باپ کو بھی نہ پہچان سکی ہو۔

❁......☆......❁

عفریت پانی میں پڑا ہوا تھا۔ یہ نئی رقیق چیز اس کی پسند' ناپسند سے ماورا تھی۔ وہ اس کی تہہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر سطح آب سے ایک فٹ نیچے تھا۔ اس کا متجسس ذہن اس نئی چیز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شبینا کی آواز سن کر ہی غار تک آیا تھا۔ پھر اس کا گیت اسے غار کے اندر لے گیا تھا۔ وہاں اسے سیاہ بیگ نظر آیا تھا اور دوسری چیزوں کی طرح اس نے اسے بھی چیر کر پھینک دیا تھا مگر وہ چھوٹی سی دو پیروں والی مخلوق جو اسے دیکھتے ہی چلانے لگی تھی اور اب یہ سرد متحرک مادہ جس میں وہ جانے کیسے آ گرا تھا یہ بہتا ہوا پانی اس کے جسم کو دھو رہا تھا۔ یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ مگر یہ چیز تھی بڑی دلچسپ عفریت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہیں رہ کر اس نئی چیز کا مشاہدہ کرے گا۔ اسے اپنی حفاظت کا ذرا خیال نہ تھا۔ وہ تجسس کے علاوہ ہر قسم کے جذبات سے بے نیاز تھا۔

چشمے کا پانی گاتا گنگناتا دھوپ میں لہریں بناتا اوپر سے نیچے کی جانب بہہ رہا تھا۔ وہ کنارے پر لگے چھوٹے چھوٹے پودوں سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور آبی پودوں کو جھولا جھلا رہا تھا۔ یہ ایک زندہ دل چشمہ تھا۔ وہ اپنی تہہ میں بیٹھے ہوئے عفریت سے بھی کھیل رہا تھا مگر اس کے بدن پر متعفن مادہ چڑھا ہوا تھا۔ چشمے کا پانی اس تعفن کو اتارنے لگا۔ اس کی لہریں عفریت کے جسم سے ٹکرا رہی تھیں اور ہر رگڑ کے ساتھ مادے کی چڑھی ہوئی تہہ ہلکی پڑتی جا رہی تھی۔ یہ ایک خوش مزاج چشمہ تھا۔ اس نے اپنی تہہ میں پڑے ہوئے زہریلے عفریت کی موجودگی پر ذرا اعتراض نہ کیا۔ بلکہ وہ تو اس زہر کو اتار رہا تھا۔ اسے اس تعفن سے چھٹکارا دلا رہا تھا۔ مگر یہ متعفن اور زہریلا مادہ آبی پودوں کے لیے بے

حد حیات افزا تھا۔ یہ آبی پودے اسے جذب کر کے زیادہ شاداب اور سرسبز ہو سکتے تھے۔ تہہ میں پڑا ہوا عفریت بتدریج پگھلتا رہا۔

''میں چھوٹا ہوتا جا رہا ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''دبلا ہوتا جا رہا ہوں۔'' خاصی دلچسپ بات ہے اب میں حرکت نہیں کر سکتا اور میرا وہ حصہ جو سوچنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے میرا ساتھ چھوڑتا جا رہا ہے۔ وہ بھی پگھلتا جا رہا ہے بس ذرا ہی دیر میں وہ مجھ سے الگ ہو جائے گا اور دوسرے حصوں کی طرح دور بہہ جائے گا۔ پھر میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاؤں گا۔ میرا وجود ختم ہو جائے گا اور یہ بات بھی کتنی دلچسپ ہے۔''

عفریت پگھلتا رہا اس کے مادے سے غلیظ ہونے والا پانی آگے بہتا رہا پھر ساری غلاظت دھل گئی پانی دوبارہ صاف شفاف ہو گیا۔ اس چشمے کی موجیں اس ڈھانچے سے ٹکرا رہی تھیں جو عفریت کے اندر سے نکلا تھا۔ یہ کوئی لمبا چوڑا ڈھانچہ نہیں تھا۔ اس کے بائیں بازو پر ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے ایک موٹی سی گرہ لگی ہوئی تھی اس کے کاسہ سر پر جڑی ہوئی چاندی کی مثلث پلیٹ پر پانی میں اترتی دھوپ مسکرانے لگی۔ ڈھانچہ اب بالکل دھل گیا تھا۔ اس کے کسی بھی حصے پر غلاظت کا نشان نہیں تھا۔ چشمہ اپنا ابدی راگ الاپتا ہوا بہتا رہا۔

☆
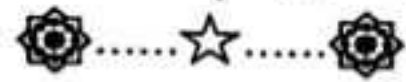
چھ لمبے تڑنگے باوردی آدمیوں نے جو قاتل کی تلاش میں جنگل کو کھنگال رہے تھے چشمے کی تہہ میں سے اس ڈھانچے کو نکال لیا۔ شینا نے جب کئی دن بعد اپنی داستان سنائی تو کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ چشمے پر سے آنے کے بعد کئی روز تک وہ مسلسل چلاتی رہی تھی۔ چلاتے چلاتے جب اس کا گلا جواب دے جاتا تو وہ مردہ سی ہو کر پڑ جاتی۔ پھر جب اس کی حالت سنبھلی تو کسی نے اس کا اعتبار نہ کیا کیونکہ وہ مسلسل 'برے آدمی' کی داستان سنا رہی تھی اور سب ہی جانتے تھے کہ یہ برا آدمی' شینا کو ڈرانے کے لیے اس کے باپ کی اختراع تھا۔ مگر چشمے سے وہ ڈھانچہ اس کی نشاندہی پر نکالا گیا تھا۔ اس لیے ڈھانچے کی بازیافت کے دوسرے ہی دن ان کے نام باسٹھ ہزار کا چیک آ گیا۔ اتنی بڑی رقم تو انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وکیلوں نے ڈھانچہ شناخت کر لیا تھا۔ وہ ملک خداداد ہی کا ڈھانچہ تھا جو اپنی موت کی جگہ سے پانچ میل دور چشمے میں پایا گیا۔ وہ جنگل ہی میں مرا تھا۔ برسوں بیت گئے، موسموں کے تغیر و تبدل، حرارت، نمی اور سڑی ہوئی نباتات ان سوکھی ہوئی ہڈیوں پر متعفن مادے کی تہہ پر تہہ چڑھاتے رہے آخر وہ ایک دن عفریت کی صورت میں اٹھ کھڑا ہوا اور جنگل میں نکل آیا۔

آغا طاہر نے اس رقم سے ایک نیا کھلیان بنوایا۔ کچھ اور مویشی خریدے اور اپنی مدد کے لیے چار آدمی ملازم رکھ لیے مگر ناصر ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکا تھا۔ نہ ہی ان کے گھر کا رکھوالا ٹامی تھا۔ وہ اس گھر کو خوش حال کر گئے تھے مگر ان کی خوشیاں اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ شینا اچانک ہی راتوں کو جاگ اٹھتی، پھر دیر تک اپنے چچا اور ٹامی کا نام لے لے کر چلاتی رہتی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی چیخوں میں کمی آتی گئی۔

تعاقب

انجم فاروق ساحلی

امریکا سے برآمد ایک مجرم کی کہانی۔
ان لمحوں کی روداد‘ جب سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو جاتا ہے‘ لیکن اوپر بیٹھا سب سے بڑا منصوبہ ساز اپنے قلم کی جنبش سے سب کچھ تبدیل کرکے انسانوں کو ان کے بے کس اور بے بس ہونے کا احساس دلا دیتا ہے۔
اچھی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے بطور خاص

ایک نوجوان تھانے میں داخل ہوا‘ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں‘ لوگ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگے اسے کوئی رپورٹ درج کرانا تھی لیکن محرر سے رجوع کرنے کے بجائے وہ براہ راست انسپکٹر سے ملنا چاہتا تھا۔

اسے انسپکٹر جوبرٹ کے کمرے میں پہنچادیا گیا‘ انسپکٹر جوبرٹ بوڑھے انسپکٹر رالف اور سراغ رساں جانسن سے باتیں کررہا تھا۔ تینوں کے سامنے کافی کے کپ رکھے ہوئے تھے‘ کمرے میں چائے کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ انسپکٹر جوبرٹ نے آنے والے نوجوان سے کافی کے لیے پوچھا‘ نوجوان انکار کرتے ہوئے کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ جیسے اس کی ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت نہ ہو‘ اس نے اپنا نام جیفرسن بتایا‘ وہ بہت ڈرا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ انسپکٹر جوبرٹ نے ہمدردی سے سوال کیا۔

''مسٹر جیفرسن! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' انسپکٹر کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''ایک بھوت میرا پیچھا کررہا ہے۔'' جیفرسن نے بغیر کسی تمہید کے جواب دیا۔

''واقعی؟'' انسپکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''کون بھوت آپ کا تعاقب کررہا ہے مسٹر جیفرسن! کیا آپ اس کا حلیہ بتاسکتے ہیں؟''

''دراصل ایک آدمی ہے۔'' جیفرسن ایک بار پھیکی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''وہ چھوٹے قد کا ایک گول مٹول سا آدمی ہے‘ اسٹیل کے فریم کا چشمہ لگاتا ہے۔ وہ پچھلے تین مہینوں سے کسی بھوت کی طرح میرا تعاقب کررہا ہے‘ مجھے اس سے بچالیجیے انسپکٹر صاحب!'' انسپکٹر سنجیدہ ہوگیا‘ جیفرسن نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اگر وہ شخص صرف میرا پیچھا کررہا ہوتا تو مجھے زیادہ پریشانی نہ ہوتی لیکن تعاقب کے ساتھ ساتھ خطوط کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ میرا خیال ہے یا وہ کوئی بے حد خطرناک آدمی ہے جو غالباً کسی موقع کی تلاش میں ہے اور......''

''ایک منٹ۔'' انسپکٹر نے اسے ٹوک دیا۔ ''شروع سے بتایئے قصہ کیا ہے پلیز۔''

''اوہ معاف کیجیے گا‘ بدحواسی کی وجہ سے مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں ہورہی ہے۔'' جیفرسن خاموش ہوگیا‘ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔

''میں نیویارک کے ایک پُرشکوہ اور پُرسکون علاقے میں رہتا ہوں‘ میرے آنجہانی باپ ٹیکساس میں تیل کے کنوؤں کے مالک تھے۔ وہ میرے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں‘ مجھے زندگی

بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے اپنا قصہ شروع کیا۔

''ایک روز صبح دس بجے کے قریب میں اپنے مکان کی دوسری منزل پر بیٹھا کچھ خطوط کمپوز کر رہا تھا' اچانک ایک پتھر کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہوا میری میز کے قریب آ گرا۔ میں نے گھبرا کے پتھر کی طرف دیکھا میری نظریں اس سے چپک کر رہ گئیں کیونکہ پتھر کے ساتھ ایک کاغذ کا پُرزہ بندھا ہوا تھا۔'' جیفرسن نے کاغذ کا ایک پُرزہ نکال کر جوبرٹ کی طرف بڑھایا' وہ ایک ہلکا سا سلوٹوں بھرا کاغذ تھا۔ کسی سستی نوٹ بک سے پھاڑا گیا تھا' عبارت کے حروف مختلف اخبارات سے کاٹ کر لگائے گئے تھے۔ کسی کا دست خط یا پتا وغیرہ نہیں تھا' تاریخ بھی ہاتھ سے نہیں لکھی گئی تھی بلکہ ''نیویارک ٹائمز'' سے اکیس اگست کی تاریخ کاٹ کر چپکائی گئی تھی لکھا تھا۔

''کل تم نے جو کچھ گلی میں دیکھا ہے اسے بھول جاؤ۔ تمہاری یادداشت تمہارے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ میں تمہاری نگرانی کرتا رہوں گا۔''

انسپکٹر جوبرٹ نے کاغذ سراغ رساں جانسن کی طرف بڑھایا۔ جانسن نے اسے انسپکٹر رالف کے حوالے کر دیا۔ رالف نے جیفرسن سے دریافت کیا۔

''مسٹر جیفرسن آپ نے گلی میں کیا دیکھا تھا؟'' انسپکٹر جوبرٹ اور سراغ رساں جانسن بھی جیفرسن کے جواب کے مشتاق تھے۔

''کچھ نہیں۔'' جیفرسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کچھ نہیں دیکھا' اس خط کا مفہوم ہی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلے میں سمجھا تھا کسی بچے کی شرارت ہوگی مگر میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی بچہ نہیں تھا بلکہ ایک حسین لڑکی ایک جوان لڑکے سے سرگوشیاں کررہی تھیں۔ ان سے چند گز دور ایک پولیس والا ٹہلتا ہوا جارہا تھا اور اس سے آگے پستہ قد گول مٹول سا آدمی کھڑا تھا۔ وہ اسٹیل کے فریم کی عینک لگائے ہوئے تھا' اس کے ہاتھ میں چہل قدمی کی چھڑی تھی۔

وہ فوراً میری توجہ کا مرکز بن گیا تھا' وہ وہاں واحد شخص تھا جو کچھ نہیں کررہا تھا وہ محلے کا آدمی بھی نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑا سڑک کی دوسری طرف کچھ دیکھ رہا تھا' میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی پھر میں نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔

جیفرسن رکا کچھ دیر بعد میں کھڑکی سے ہٹ کے بکھرے ہوئے شیشے صاف کرنے لگا۔ اس شخص کا حلیہ میرے ذہن میں محفوظ تھا' کرچیاں چنتے ہوئے مجھ پر جھرجھری طاری ہوگئی۔ اضطراری طور پر مجھے خیال آیا کہ میں خطرے میں ہوں چنانچہ کچھ عرصہ کے لیے مجھے یہ شہر ہی نہیں بلکہ ملک چھوڑ دینا چاہیے۔ میں اپنی چھٹی حس کی تنبیہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا خیر میں نے فی الفور ایک ٹریول ایجنسی کے ذریعے دوسرے روز لندن جانیوالے طیارے میں ایک نشست محفوظ کروالی۔

میں طویل فضائی سفر میں عموماً سوجاتا ہوں' اس روز بھی میں جہاز اڑنے سے پہلے ہی اپنی نشست پر سوگیا تھا۔ قریب قریب پورا سفر نیند میں ہی گزرا' اس لیے میں جہاز کے مسافروں کو نہیں دیکھ سکا' البتہ ہیتھرو ائرپورٹ پر میں نے ایک مسافر کو اترتے ہوئے دیکھا تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا' یہ وہی پستہ قد موٹا تھا۔'' جیفرسن نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔

''مسٹر انسپکٹر! پہلے تو میں اسے محض اتفاق سمجھا لیکن دوسرے روز صبح لندن ہوٹل کے کمرے میں دروازے کے نیچے سے ایک خط پھینکا گیا چنانچہ مجھے اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔'' اس نے ایک اور کاغذ انسپکٹر کی طرف بڑھایا' یہ خط بھی اخباری حروف سے چپکایا گیا تھا' عبارت مختصر تھی۔

''خاموشی ہی میں عافیت ہے۔''

''اس فقرے نے مجھے ڈرادیا۔'' جیفرسن نے بتایا۔ ''میں جلدی جلدی ہوٹل تبدیل کرتا رہا' کیا بتاؤں کہاں کہاں بھٹکتا پھرا' پھر میں نے بلامزی اسکوائر کے قریب کارلس فورڈ ہوٹل میں کمرا لے لیا' وہاں ایک ہفتہ خیریت سے گزر گیا۔ میں سمجھا کہ مجھے اس سے نجات مل چکی ہے لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ جلد ہی مجھے ڈاک سے یہ خط موصول ہوا یہ خط بھی پہلے دو خطوط کی طرح تھا' تاریخ کے لیے ڈیلی ٹیلی گراف کا تراشا استعمال کیا گیا تھا۔

''یاد رکھو تمہیں وہ سب کچھ بھولنا ہے'' اس خط سے میں دہل گیا۔'' جیفرسن نے بیان جاری رکھا۔ ''اس روز ڈائننگ ہال میں ناشتے کے وقت وہ شخص پھر مجھے نظر آیا' وہ میری میز سے تقریباً دس فٹ دور ایک میز پر بیٹھا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ شخص اٹھا اور باہر جانے لگا۔ میں نے اس کے

متعلق ایک ویٹر سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ پتا چلا کہ اس کا نام ہیڈر برگ ہے اور وہ کمرا نمبر تین سو چار میں قیام پذیر ہے۔ ناشتے سے فارغ ہوکر میں استقبالیہ پر گیا' وہاں میں نے مہمانوں کا رجسٹر دیکھا' رجسٹر سے معلوم ہوا کہ کوئی دس منٹ قبل اس نے ہوٹل چھوڑ دیا ہے۔"

"مسٹر جیفرسن! ان خطوط کے سلسلے میں آپ نے پولیس سے تو رابطہ قائم کیا ہوگا؟" انسپکٹر جوبرٹ نے پوچھا۔

"نہیں۔" جیفرسن نے جواب دیا۔

"کیوں؟" انسپکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"مجھے پولیس سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا لیکن دراصل میں ان خطوط کو کسی کا پاگل پن سمجھ رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ شخص محض یہ دیکھنے کے لیے ایک دلچسپ کھیل کھیل رہا ہے کہ میں اس سے پیچھا چھڑا سکتا ہوں یا نہیں' میں اس غلط فہمی میں اس کے آگے آگے چلتا رہا اور کھیل جاری رہا۔"

جیفرسن نے مزید بتایا کہ وہ لندن سے پیرس چلا گیا' وہاں تیسرے دن وہ ٹیکسی میں سفر کررہا تھا کہ ایک دوسری ٹیکسی اس کے قریب سے گزری۔ اس میں سے وہی موٹا آدمی جھانکتا ہوا نظر آیا وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسرے دن جیفرسن ایک پرائیویٹ کار میں پیرس سے نکل گیا' پچاس میل آگے ایک چھوٹے سے ریلوے جنکشن پر کار روک کر وہ جنوب کی طرف جانے والی ٹرین میں سوار ہوگیا۔ دو دن بعد وہ مارسیلز پہنچا وہاں ہوٹل میں پہلے سے ایک خط اس کا منتظر تھا' اس خط میں کوئی پیغام نہیں تھا۔ ایک مقامی اخبار سے صرف تاریخ کاٹ کر چپکادی گئی تھی' جیفرسن بہت کچھ سمجھ گیا۔

چار گھنٹے بعد وہ ایک یونانی جہاز میں نہر سوئز کی طرف سفر کررہا تھا۔ قاہرہ پہنچتے ہی امریکن ایکسپریس میں بھی اس کے نام ایک خط موجود تھا' اس نے لفافہ چاک کیا لفافے سے برآمد ہونے والے کاغذ پر گزشتہ روز کے مقامی اخبار کی تاریخ چپکی ہوئی تھی' اس نے پچھلے تین دنوں کے درمیان

قاہرہ آنے والے تمام مسافروں کی فہرست دیکھی، ایک جگہ اسے ہیڈر برگ کا نام نظر آیا۔
"مجھے معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے تاکہ اس سے مل کے صاف صاف بات کر لیتا۔" جیفرسن نے کہا۔ "میں نے سوچا کہ اگر اس نے ان خطوط سے لاتعلقی ظاہر کر دی، تو میں کیا کر لوں گا۔ چنانچہ میں نے اس سے چھٹکارے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور پہلی پرواز سے زیورخ روانہ ہو گیا، وہاں سے میں فرینکفرٹ، روم اور ٹریپولی پہنچا۔ ٹریپولی سے مجھے ایک اطالوی بحری جہاز میں جگہ مل گئی، جہاز نے مجھے دو دن میں کانو پہنچا دیا وہاں دو راتیں قیام کر کے میں سینٹرل افریقن ائر لائن کے ذریعے نیروبی پہنچ گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ نیروبی میں رہا، پھر برٹش ائر لائن سے جو ہانسبرگ روانہ ہو گیا۔
اس دو ہفتے کی بھاگ دوڑ کے دوران مجھے کوئی خط نہ ملا اور نہ موٹے کی شکل دکھائی دی، جو ہانسبرگ ائر پورٹ سے میں سیدھا ہوٹل کرائل پہنچا۔ وہاں میں رجسٹر میں اپنا نام درج کروا رہا تھا کہ یکایک میری نظر نیچے کی تیسری سطر پر پڑی۔ اس میں ہیڈر برگ کا نام دیکھ کر مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا میں کچھ کہے سنے بغیر ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور اپنے آپ کو بھیڑ میں گم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
وہ رات میں نے پارک اسٹیشن کے بنچ پر اونگھتے ہوئے گزاری، صبح ہوتے ہی میں ڈربن کی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ ڈربن میں میرا قیام صرف چند گھنٹے رہا، وہاں سے مجھے پورٹ ایلزبتھ جانے والے ایک بحری جہاز میں ٹکٹ مل گیا۔ ٹکٹ میں نے فرضی نام سے حاصل کیا تھا پھر پورٹ ایلزبتھ سے کیپ ٹاؤن تک کا ہوائی سفر میں نے ایک اور نام سے کیا اور وہاں ہلڈن ہوٹل میں کمرا ایک تیسرے نام سے لیا۔ اس مرتبہ میرا نام جیکسن تھا، یہ تین دن پہلے کی بات ہے اس دوران کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی لیکن آج صبح مجھے استقبالیہ کاؤنٹر سے یہ خط ملا۔" اس نے انسپکٹر جوبرٹ کی طرف ایک لفافہ بڑھایا، لفافے پر یہ الفاظ کمپوز کیے گئے تھے۔
"جیکسن! ہلڈن ہوٹل کیپ ٹاؤن" لفافے کے اندر ایک سستے سے کاغذ پر اخبار سے کاٹے گئے حروف میں یہ پیغام درج تھا۔ "دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جاؤ تم میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔" پیغام پر ایک دن پہلے کے "کیپ میل" اخبار کی تاریخ چسپاں تھی۔ انسپکٹر جوبرٹ نے سوالیہ نگاہوں سے جیفرسن کی طرف دیکھا۔
"وہ بھی نظر آیا نہیں؟ ہیڈر برگ؟"
"ابھی تک میں نے اسے نہیں دیکھا ہے لیکن وہ میرے ہی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔"
"یہ سب کچھ کئی ہفتوں سے ہو رہا ہے لیکن تم نے پریس سے آج رجوع کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟" بوڑھے انسپکٹر رالف نے دریافت کیا۔
"اب تک میں یہ کارروائی محض ایک کھیل سمجھ رہا تھا اور ہر کھیل کہیں نہ کہیں ختم ہوتا ہی ہے لیکن یہ سلسلہ تو بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کے خط سے میں بے حد سنجیدہ اور دہشت زدہ ہو گیا ہوں، مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ شخص کسی خاص وجہ سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔ انسپکٹر صاحب میں خطرے میں ہوں، براہ کرم مجھے تحفظ دیجیے۔"
"ٹھیک ہے دیکھتے ہیں کہ ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر دوسری میز پر گیا وہاں ٹیلی

فون رکھا ہوا تھا' اس نے ہلٹن ہوٹل کا نمبر ملایا اور کچھ بات کرکے سراغ رساں جانسن کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"جانسن! مسٹر جیفرسن کے ساتھ ان کے ہوٹل جاؤ۔" اس نے چابیوں کا گچھا جانسن کی طرف بڑھایا۔ "منیجر کے کہنے کے مطابق ہیڈر برگ ہوٹل کی لابی میں موجود ہے' اسے یہاں لے آؤ۔ میری کار لے جاؤ۔" جیفرسن نے انسپکٹر جوبرٹ سے پوچھا۔

"میں یہ خطوط آپ کے پاس رکھ سکتا ہوں جناب؟"

"بے شک۔" سراغ رساں نے کہا اور جیفرسن کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

❁ ❁ ❁

بیس منٹ بعد جانسن ایک بھاری بھرکم ٹھگنے آدمی کو لے کر آ گیا۔ ہیڈر برگ نہایت قیمتی اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دکھاوے سے زیادہ اپنی سہولت اور آسائش کا خیال رکھتا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا' بیٹھتے ہی اس نے اپنی پتلون قدرے اوپر کھینچ لی تاکہ استری خراب نہ ہو' اس کے دونوں موزوں پر گلابی پیوند نظر آنے لگے۔ اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"مجھے یہاں کیوں طلب کیا گیا ہے' میرا پاسپورٹ اور سفری کاغذات بالکل درست ہیں' آپ کو مجھ پر کوئی شبہ ہے کیا؟"

انسپکٹر جوبرٹ نے مدعی جیفرسن کے فراہم کیے ہوئے خطوط سے ان کی فہرست تیار کرچکا تھا جہاں ہیڈر برگ دیکھا گیا تھا۔

"مسٹر ہیڈر برگ! تکلیف معاف...... میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" جوبرٹ

نے بلند آواز سے شہروں کے نام پڑھے۔ ''کیا آپ گزشتہ دنوں ان مقامات پر دیکھے گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' ہیڈر برگ نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹائیں۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں آپ نے یہ سفر کس مقصد سے کیے؟'' ہیڈر برگ کے دونوں ہاتھ اس کی توند پر تھے' بظاہر وہ بالکل مطمئن تھا لیکن جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی تھی۔

''مسٹر انسپکٹر! اطلاعاً عرض ہے کہ میں نیویارک کی ہیڈر برگ اینڈ کمپنی کا مالک ہوں' یہ فرم میرے کارکن اچھی طرح چلا رہے ہیں۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی مجھ پر کوئی خاندانی ذمہ داری بھی نہیں ہے اس لیے میں آج کل دنیا کی سیاحت کر رہا ہوں۔ کیا سیر و تفریح کرنا جرم ہے؟''

''بالکل نہیں' لیکن ہمیں شکایت ملی ہے کہ آپ ایک شخص کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

''تعاقب...... نہیں جناب میں کسی کا تعاقب نہیں کر رہا ہوں' کیا اس شخص نے کوئی وجہ بتائی ہے کہ میں اس کا تعاقب کیوں کر رہا ہوں؟ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں' مجھے کسی کا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' انسپکٹر جوبرٹ نے چند لمحے متجسس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر اس نے جیفرسن کے خطوط میں سے ایک خط نکال کر ہیڈر برگ کی طرف بڑھایا۔

''آپ نے یہ خط کیوں بھیجا تھا؟'' ہیڈر برگ عینک کے موٹے شیشوں کو گھورتا ہوا بولا۔

''یہ خط میں نے نہیں بھیجا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا' وہ کھڑا ہو کے ذرا سا آگے جھکا پھر سیدھا ہو کے دروازے کی طرف مڑ گیا۔

''میرا وقت آپ نے بلاوجہ ضائع کیا' اس خط سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے' مجھے اجازت دیجیے۔'' جوبرٹ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی' وہ کمرے سے نکل گیا۔ انسپکٹر جوبرٹ رالف کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟''

''میں اسے اتفاق سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوں' کوئی شخص محض اتفاقاً پوری دنیا میں کسی کا تعاقب نہیں کر سکتا۔'' رالف نے جواب دیا۔

''خطوط کی دھمکیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قتل وغیرہ کا معاملہ ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جوبرٹ بولا۔ ''میں نیویارک پولیس کو فیکس بھیج رہا ہوں' ممکن ہے وہاں سے ہمیں ہیڈر برگ یا جیفرسن کے بارے میں کوئی مفید اطلاع مل جائے۔''

''ایک بات خاص طور پر معلوم کرنا۔'' رالف نے میز پر پڑے ہوئے خطوط کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیس اگست کو نیویارک کی کسی گلی میں کوئی قابل ذکر واقعہ تو نہیں ہوا؟''

❁......❁......❁

فیکس کا جواب دوسرے دن دوپہر کو آ گیا' ہیڈر برگ ایک بہت بڑی تجارتی کمپنی کا مالک ہے۔ اس کی کمپنی نیویارک کی معیشت میں اہم کردار ادا کر رہی ہے وہ جرمن نژاد امریکی ہے' قد چھوٹا' عمر ترپن سال اور غیر معمولی فربہ اندام ہے۔ موٹے عدسوں کی عینک لگاتا ہے وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ کاروبار کی دیکھ بھال اس کے ملازمین کرتے ہیں اس کے دفتر سے معلوم ہوا ہے کہ آج کل وہ دنیا کی سیاحت کر رہا ہے پولیس کے پاس اس کے خلاف کوئی ریکارڈ

موجود نہیں۔ جیفرسن آنجہانی کارائز کا بیٹا ہے' کارلائز تیل کے متعدد کنوؤں کا مالک تھا' جیفرسن بھی ان دنوں سیاحت میں مشغول ہے۔ اس کے بال بھورے ہیں' قد لمبا' عمرستائیس سال ہے کوئی کام نہیں کرتا کیونکہ بے حد دولت مند ہے۔ اس کے خلاف بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے پاس کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ بیس اگست کو دوپہر ڈھائی بجے میکن لین میں فرانس نامی لڑکی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ آج تک واردات کے کسی عینی شاہد یا قاتل کا سراغ نہیں مل سکا۔ ہیڈربرگ یا جیفرسن کا بھی اس معاملے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا اگر آپ کو کچھ پتا چلا ہو تو مطلع کیجیے۔''

انسپکٹر جوبرٹ نے فیکس پیپر رالف کی طرف بڑھایا اس وقت فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیور اٹھالیا' جیفرسن کا فون تھا۔

''مجھے ابھی ایک خط اور ملا ہے۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''صرف اتنا لکھا ہے ''آخر تم نے پولیس کو بتا دیا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر جیفرسن! کاغذ سنبھال کر رکھیے اور یہ بھی بتایئے کبھی میکن لین کا نام سنا ہے۔'' جوبرٹ نے پوچھا۔

''جی ہاں یہ نیویارک کی ایک گلی ہے اس کے ایک گیراج میں اپنی گاڑی کھڑی کرتا ہوں۔ میکن لین سے روزانہ میرا گزر ہوتا ہے۔'' جیفرسن نے بتایا۔

''کیا بیس اگست کو بھی آپ وہاں سے گزرے تھے؟''

''ضرور گزرا ہوں گا۔''

''کتنے بجے ذرا یاد کر کے بتایئے۔''

'ایک منٹ...... ہاں یاد آیا یہ پہلا خط ملنے سے ایک دن قبل کی بات ہے' میں ڈھائی بجے کے قریب وہاں سے گزرا تھا۔''

''اوہ اب سمجھ میں آگیا کہ ہیڈربرگ آپ کا تعاقب کیوں کر رہا ہے' اپنے کمرے سے نکلنے کی کوشش نہ کیجیے میں آرہا ہوں۔''

❁......❁......❁

ہوٹل کے احاطے میں کار موڑتے ہی جوبرٹ اور رالف کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا' اندر سے کسی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور ہوٹل کے داخلی دروازے میں لوگ جمع تھے۔ ویٹر وغیرہ بھی ہجوم میں شامل تھے' ہوٹل کے منیجر نے جوبرٹ سے کہا۔

''اچھا ہوا آپ آگئے انسپکٹر صاحب! کمرا نمبر 77 میں ایک آدمی قتل کر دیا گیا ہے۔'' لوگوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔

کمرا نمبر 77 میں جیفرسن موجود تھا' وہ انہیں دیکھتے ہی اٹھ گیا اس کا چہرہ فق تھا۔ اس کے سامنے قالین پر ہیڈربرگ اوندھا پڑا ہوا تھا اس کی پتلون قدرے اوپر اٹھی ہوئی تھی اور اس کے پیوند لگے موزے صاف نظر آرہے تھے۔ جوبرٹ کو حیرت تھی کہ اتنا مالدار آدمی پیوند لگے موزے کیوں پہنتا تھا' جیفرسن نے بتایا۔

رول ماڈل

-سیکھنے سکھانے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے کسی بھی ہنر یا علم میں مہارت حاصل کرنے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس میدان میں کسی شخصیت کو اپنا رول ماڈل بنالیں۔ پھر اس جیسا بننے کی کوشش کریں۔ اس طرح ہمارے اندر بھی اس جیسی کچھ نہ کچھ صلاحیتیں بیدار ہو جائیں گی۔

ارشد علی ...... لاہور

''ہیڈر برگ نے دروازے پر دستک دی تھی' میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی' وہ اندر داخل ہوتے ہی چاقو لہراتا ہوا میری طرف حملہ آور ہوا۔ خوش قسمتی سے آپ نے مجھے پہلے ہی خطرے سے آگاہ کردیا تھا' اس لیے میں پستول ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔''

''بے چارہ ہیڈر برگ۔'' انسپکٹر رالف کی آواز میں افسوس تھا۔

''آپ اسے بے چارہ کہہ رہے ہیں؟'' جیفرسن نے اسے گھورا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''میرا مطلب ہے ہمیں یہاں آنے میں دیر ہوگئی ورنہ شاید ہم اسے بچا لیتے۔'' رالف نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا قاتل قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔'' جیفرسن نے ناگواری سے کہا۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ مجھے قتل کرنے کے لیے چاقو لہراتا ہوا میری طرف لپکا تھا۔ میں نے گولی چلادی' یہ قتل نہیں دفاعی اقدام ہے۔''

جوبرٹ بے چینی محسوس کرنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رالف نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''جوبرٹ! ہمیں بتایا گیا ہے کہ مقتول ہیڈر برگ جیفرسن کا پیچھا کررہا تھا' میرا مشورہ ہے کہ یہ معاملہ ذرا الٹ کر دیکھو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جیفرسن ہیڈر برگ کا تعاقب کررہا ہو۔'' جوبرٹ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا' جیفرسن کا چہرہ متغیر ہوگیا' رالف نے اسے کہا۔

''مسٹر جیفرسن ممکن ہے وہ خطوط تمہیں ہیڈر برگ نے بھیجے ہوں لیکن امکان بھی پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا کہ خطوط کا چکر تمہاری اپنی کارستانی ہو کیوں کہ میں سمجھتا ہوں ہیڈر برگ تمہارا پیچھا نہیں کررہا تھا بلکہ تم اس کا تعاقب کررہے تھے۔''

''کیا بکواس ہے؟'' جیفرسن کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ''وہ خطوط میں نے خود لکھے ہوتے تو مجھے پولیس سے مدد لینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بتاتا ہوں۔'' رالف نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

''بیس اگست کو تم نے میکن لین گلی میں فرانس نامی ایک لڑکی کو قتل کردیا تھا' ایک موٹے آدمی نے تمہیں قتل کرتے یا گلی سے نکلتے دیکھ لیا' اس لڑکی نے تمہیں دھوکا دیا ہوگا یا بے وفائی کی ہوگی' کوئی پرانی رنجش تھی جس نے تمہیں لڑکی کو قتل کرنے پر مجبور کردیا شاید وہ کسی اور کی بانہوں میں نکل کر گلی سے گزر رہی تھی۔'' جیفرسن غصے اور طیش کے عالم میں رالف کو گھورنے لگا' اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں ساکت ہوگئی تھیں۔

''ممکن ہے موٹے آدمی نے تمہاری حرکت پر توجہ نہ دی ہو لیکن تم سمجھے کہ وہ تمہیں دیکھ چکا ہے اس لیے تم نے اس کا پیچھا شروع کردیا۔ شام کے اخبارات میں مقتولہ کے قتل کی خبر موجود تھی اور موٹے آدمی کا ایسا کوئی بیان نہیں تھا کہ یہ جرم اس کے سامنے ہوا ہے لیکن تم اس کے متعلق اپنے ذہن سے شبہ نہ نکال سکے۔ تمہیں خوف ہوا کہ ہیڈر برگ کبھی نہ کبھی پولیس کو ضرور اطلاع دے گا اس کا زندہ رہنا تمہارے لیے مستقل خطرہ تھا۔ اس لیے جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ اس نے ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنالیا ہے تو تم نے بھی ایک منصوبہ تیار کرلیا۔ تم نے خود اپنے نام خطوط بھیجے اور پوری دنیا میں ہیڈر برگ کا تعاقب شروع کردیا۔ تم ایک وہمی آدمی ہو تمہیں خواب میں بھی ہیڈر برگ ہی نظر آتا تھا۔ تم ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے کہ

اگر وہ تمہارے ہاتھوں مارا جائے تو تم اسی کے قتل کو اپنے بچاؤ کی اضطراری کوشش ثابت کر سکو۔''

''دلچسپ کہانی ہے۔'' جیفرسن نے زہر خند سے کہا۔ ''اگر میں نے کسی لڑکی کو قتل کیا ہوتا تو تمہیں ہیڈر برگ تک پہنچنے کا موقع فراہم کرتا کیوں کہ تمہارے قیاس کے مطابق وہ میرے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔''

''تمہیں تھوڑا بہت خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔'' رالف نے کہا۔ ''لیکن تمہارے لیے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ بھی کہ کہیں ہیڈر برگ تمہیں شناخت نہ کرلے اس کا تعاقب کرتے ہوئے تم نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کے سامنے نہ آنے پاؤ۔ تم برابر اسے ٹھکانے لگانے کا موقع تلاش کرتے رہے۔'' اس نے کچھ توقف سے کہا۔

''آہ تمہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ ہیڈر برگ کی دور کی نظر بہت کمزور تھی، اس نے تمہیں گلی میں نہیں دیکھا ہوگا...... دیکھا بھی ہوگا تو پہچانا نہیں ہوگا۔''

جیفرسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس اس الزام کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔'' رالف نے سوال کیا۔

''تم نے لاش کو چھوا تو نہیں......''

''نہیں۔'' جیفرسن بولا۔

''بہت اچھے اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔'' رالف نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''تم نے کسی طرح ہیڈر برگ کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے کرسی پیش کی پھر جیسے ہی وہ بیٹھا تم نے گولی چلادی اور اس کے ہاتھ میں چاقو تھما دیا۔'' جیفرسن چیخا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ رالف انسپکٹر جوبرٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''جوبرٹ یاد کرو جب ہیڈر برگ آیا تھا تو کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پتلون اوپر کھینچ لی تھی، بالکل وہی کیفیت یہاں بھی نظر آرہی ہے اور......''

جملہ مکمل کیے بغیر اس نے اچھل کر جیفرسن کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ جیفرسن میز پر پڑا ہوا پستول اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ رالف جیفرسن کی کلائی موڑتے ہوئے بولا۔

''میں بدتمیز آدمی نہیں ہوں مگر تم جیسے خطرناک آدمی کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر تم پستول اٹھانے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو میرا کچھ نہ بگڑتا۔ جوبرٹ تمہیں پہلے شوٹ کردیتا لیکن یہ سزا تمہارے لیے کافی نہ ہوتی اس طرح ہیڈر برگ کے ساتھ بھی انصاف نہ ہوتا۔ اب تم پہلے اس پر اپنے الزامات کی تردید کروگے پھر تمہیں یہاں کے قانون کے مطابق اس کے قتل کی سزا ملے گی۔ اگر تم موت کی سزا سے بچ گئے تو کم از کم بیس سال جیل میں کاٹو گے۔ اس کے بعد تمہیں نیویارک پولیس کے حوالے کردیا جائے گا وہاں فرانس نامی لڑکی کے قتل کے جرم میں تمہیں پھر آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے گا۔ زندگی کے آخری لمحوں تک تم آزاد فضا میں سانس نہیں لے سکو گے۔'' جیفرسن کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا اور اس کا سر جھک گیا۔

قاتل حسینہ

خلیل جبار

ایک تاجر کو پیش آنے والے خوف ناک واقعے کی روداد' اس کی دردناک موت کسی کی ضرورت بلکہ زندگی کی علامت بن گئی تھی۔
تصور کیجیے اگر یہ واقعہ آپ کے ساتھ پیش آجائے۔

میں اس وقت اپنے آستانے پر اکیلا بیٹھا تھا' میں نے اپنے خادم کو چھٹی دے دی تھی میرا شاگرد امتیاز چھٹی بالکل نہیں کرتا لیکن بہت زیادہ ضروری کام ہونے پر چھٹی کرلیتا ہے۔ اس لیے امتیاز کو چھیڑتے ہوئے کہتا ہوں کہ تو میرا شاگرد کم خادم زیادہ ہے۔ میرے پاس بے شمار لوگ اپنے بچوں کو لاتے ہیں کہ میں انہیں بھی شاگردی میں لے لوں مگر اس طرح بہانے سے ٹال دیتا ہوں کہ انہیں بُرا نہ لگے۔ میرا کام ہی ایسا ہے ہر وقت جنات کی طرف سے حملے کا خطرہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے میں جب شیطانی طاقتوں کے مالک جنات سے انسانوں کو چھٹکارا دلاؤں گا تو ان کا میرا دشمن ہونا یقینی ہے۔ میں عملیات کی بدولت ہی شیطانی طاقتوں سے بچا ہوا ہوں اور کچھ لوگوں کی دعائیں ہیں جن کے میں کام آتا ہوں وہ مجھے ڈھیروں دعائیں دیتے ہیں مجھے زیادہ دولت کی بھی تمنا نہیں ہے اس لیے لوگ جو بھی نذرانے کے طور پر رقم دیتے ہیں وہ ڈبے میں ڈال دیتا ہوں۔

مجھے اس وقت بڑی خوشی ہوتی ہے جب مصیبت زدہ' پریشان حال لوگوں کو مشکلات سے چھٹکارا حاصل ہوجاتا ہے۔ میں نے امتیاز کو بھی بہت سوچ سمجھ کر اپنا شاگرد بنالیا ہے وہ بھی میری طرح زیادہ دولت کا تمنائی نہیں جو وقت پر مل جائے اس میں خوش ہوجاتا ہے۔

میں اس وقت ایک وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھا' میں نے اپنے اردگرد حصار قائم کیا ہوا تھا' ایک ہفتہ قبل میرے پاس ایک شخص جس کا نام عبدالرشید تھا میرے آستانے پر آیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''عبدالرشید گھبراؤ نہیں تم میرے آستانے پر آگئے ہو' تمہارے ساتھ جو بھی مسئلہ ہے کھل کر بیان کرو۔'' میری بات سن کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

''بابا جی میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے اس لیے یہاں آیا ہوں اور مجھے بھی پورا یقین ہے آپ ہی مجھے اس مسئلے سے نجات دلائیں گے۔''

''تم کھل کر اپنا مسئلہ بیان کردو اس صورت میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں۔''

''بابا جی میں ایک کاروباری آدمی ہوں' کاروبار کے سلسلے میں میرا مختلف شہروں میں جانا ہوتا ہے۔ میں ایک دن اندرون سندھ کے دورے پر تھا' میں مختلف دیہات سے ہوتا ہوا اپنے شہر آرہا تھا واپسی پر مجھے رات ہوگئی تھی جن سے میرا کاروباری لین دین تھا۔ انہوں نے مجھے بہت روکنا چاہا مگر میری مجبوری تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں رک سکتا تھا۔ ایک کاروباری میٹنگ میں مجھے شرکت کرنا تھی۔ رات کی تاریکی ہر طرف

چھا گئی تھی، میں نے بھی اکیلے میں رات کو سفر نہیں کیا تھا اس لیے دل ہی دل میں خوف زدہ ہو رہا تھا۔ قد آور درخت رات کی تاریکی میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے جنات ہوں۔ جنات کو میں نے دیکھا نہیں ہے البتہ ان کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ قد آور ہوتے ہیں اپنی شکل اور جسم کو مختلف روپ میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

مجھے اچانک ایک جگہ کار کو بریک لگانا پڑی۔ میری کار کے سامنے اچانک سے کوئی آ گیا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ رات کے اس وقت اس تاریک جنگل میں کون ہے جو میری کار کے سامنے آ گیا ہے۔ میں اگر فوری بریک نہ لگاتا تو کار اس پر چڑھ جاتی۔ میرے کار روکنے پر وہ شخص میری کار کی طرف آیا' اسے قریب آنے پر میں چونکا' وہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ عورت بھی بہت حسین...... میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا' اتنی حسین عورت میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

''کیا شہر جا رہے ہو؟'' وہ ایک خاص ادا سے بولی۔

''آ......ا......ہاں......'' میں نے بمشکل کہا۔

وہ تیزی سے مجھ سے پوچھے بغیر کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے کار کا دروازہ اندر سے لاک کیا تھا پھر

وہ کیسے کھل گیا؟ وہ میری طرف بہت ہی پیار سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور گاڑی کو ریس دے دی۔

''کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''رات میں اکیلے میں گاڑی چلاتے ہوئے خوف آجانا فطری بات ہے لیکن اب ہم دو ہوگئے ہیں جب انسان دو ہو جائیں پھر خوف کسی حد تک کم ہو جاتا ہے۔''

''ہاں یہ بات بالکل درست ہے۔'' میں زبردستی مسکرایا۔

''مجھے دیکھو میں عورت ہو کر اس وحشت ناک جنگل سے نہیں گھبرا رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''تم یہاں رات میں کیا کر رہی ہو؟'' میں نے اپنا خوف کم ہو جانے پر اس سے سوال کیا۔

''ہاں...... میں تمہیں ضرور بتاؤں گی کہ میں اس وقت جنگل میں کیا کر رہی ہوں؟ میں اپنے گاؤں سے بس میں آرہی تھی کہ بس کا ٹائر خراب ہو گیا دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی بس سے نیچے اتر گئی۔ شام کے وقت یہ علاقہ بہت خوب صورت اور رومان پرور لگ رہا تھا۔ میں ایسے ہی علاقے کو دیکھتے بہت دور نکل گئی' ہوش اس وقت آیا جب بس کا زور' زور سے ہارن بجا' میں بہت دور نکل گئی تھی اس لیے میرا بس تک پہنچنا ممکن نہیں تھا پھر بھی میں تیز' تیز دوڑتی ہوئی بس کی طرف بھاگی' ہارن بجتا رہا اور میں بس کی طرف دوڑتی رہی پھر ہارن بجنا بند ہو گیا شاید بس چل دی تھی میں جیسے تیسے دوڑتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی جہاں بس کھڑی تھی مگر اب بس کا دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ میں کچھ دیر پریشان رہی پھر میں نے سوچا کہ پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مجھے کسی دوسری بس کا انتظار کرنا چاہیے۔ رات ہوگئی کوئی بس نہیں آئی حتیٰ کہ کوئی کار تک بھی نہیں آئی۔ رات ہونے پر مجھے انجانا سا خوف بھی آرہا تھا' ایسے میں تم میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آگئے اور میں تمہاری کار میں بیٹھ گئی۔''

''بس والے کو تمہارا انتظار کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔

''بس کا ٹائر خراب ہو جانے یا کوئی خرابی ہو جانے پر بس سے لوگوں کا اترنا فطری عمل ہے جب بس کی خرابی درست ہو جاتی ہے۔ کنڈیکٹر بس میں آواز لگاتا ہے کہ تمام مسافر اپنے برابر کے ساتھی کو دیکھ لیں' کوئی کم ہو تو بتا دیں ورنہ ہم بس چلا رہے ہیں جس کا بھی ساتھی کم ہوتا ہے وہ بتا دیتا ہے پھر اس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ میری بدقسمتی کہ میں اپنی سیٹ پر اکیلی تھی اور میرے پیچھے والی سیٹ خالی تھی اس لیے کسی کا بھی میری طرف دھیان نہیں گیا ہوگا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''ہاں میرا خیال ہے ایسا ہی ہوگا' ویسے کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔ لمبا سفر ہے بات چیت کرتے ہوئے نام لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا نام نغمہ ہے۔''

ہم دونوں بات چیت کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے' میں کار چلاتے ہوئے بوریت محسوس کر رہا تھا وہ بوریت دور ہوگئی تھی اور خوشگواریت نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ میں جی بھر کر اس حسین دوشیزہ کو دیکھ لینا چاہتا تھا اچانک

ایک جھٹکے سے کار رک گئی' میں نے کار کو دھکا لگا کر ایک سائیڈ پر کیا اور ٹارچ کی مدد سے اس کی خرابی چیک کرنے لگا جو بھی کار کا استعمال کرتا ہے وہ تھوڑا بہت مکینک بن جاتا ہے۔ میں بھی تھوڑی بہت خرابی دور کر لیتا ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کار اسٹارٹ ہو جائے مگر کار ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے کار کے اس وقت خراب ہو جانے پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ ایسی جگہ اور ایسے وقت کار خراب ہوئی ہے کہ میں کسی سے کار ٹھیک کرانے کے لیے مدد بھی نہیں لے سکتا۔ غصہ سے میں نے کار کو ایک لات ماری۔

''بہت غصہ آ رہا ہے؟'' نغمہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''صبح مجھے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا ہے ایسے میں کار کے خراب ہو جانے سے میرا سارا پروگرام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔''

''فکر نہ کرو اور تھوڑا انتظار کر لو ہو سکتا ہے گاڑی خود بخود ٹھیک ہو جائے یا کوئی اور گاڑی آ جائے جو تمہاری مشکل کو آسان کر دے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو بعض دفعہ میرے ساتھ ایسا ہوا ہے کار کچھ دیر کے بعد خود بخود ٹھیک ہو گئی۔'' میں نے کہا۔

''پھر کیوں پریشان ہو رہے ہو' رات کا پرسکون ماحول ہے تنہائی ہے' ایسے میں قدرت کی جانب سے فراہم کردہ موقع کو کیوں ضائع کر رہے ہو؟'' نغمہ نے میری طرف خود سپردگی کے انداز میں کہا۔

اس کی بات نے میرے دل میں گدگدی سی پیدا کر دی تھی' واقعی میرا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں کہ میرے ساتھ اس قدر حسین دوشیزہ کا ساتھ ہے۔ میں بہک گیا تھا' میں وہ غلطی کر بیٹھا تھا جو

مصنفین سے گزارش

☆مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 'تاریخ تک مل جانے چاہیے۔

☆اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

7'فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

☆نوٹ:1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

مجھے نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا نہ نغمہ میری حوصلہ افزائی کرتی اور نہ مجھ سے ایسا فعل ہوتا۔ میں کار میں ہی سو گیا اور جب صبح سورج کی پہلی کرن میرے چہرے پر پڑی میں بیدار ہو گیا' میں نے جیسے تیسے کار کو اسٹارٹ کیا' وہ اسٹارٹ ہو گئی میں نے کار اسٹارٹ ہو جانے پر خوش ہوتے ہوئے جب نغمہ کی طرف دیکھا وہ کار میں نہیں تھی۔ کار کے دروازے بھی لاک تھے' میں کار سے نکل کر باہر آیا ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں دور تک نغمہ کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے ہارن بھی بجایا مگر وہ نہ آئی' کچھ دیر انتظار کر کے میں نے کار کو ریس دے دی اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ ابھی اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک رات میں بیگم کے ساتھ سو رہا تھا کہ نغمہ کمرے میں آ گئی' میں اسے رات میں اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس سے پوچھا۔

''تم...... تم...... کمرے میں......''

''میں جب چاہوں جہاں چاہوں آ جا سکتی ہوں' مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔''

''کمرے میں میری بیگم......'' میں نے کہنا چاہا۔

''اس کی فکر نہ کرو میں جب تک نہ چاہوں یہ اپنی نیند سے بیدار نہیں ہو گی۔'' وہ بولی۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نغمہ کو دیکھ کر حقیقت میں پریشان ہو گیا تھا اور چاہ رہا تھا کہ وہ کمرے سے نکل جائے میں اس سے خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔

''میں تم سے کیا چاہوں گی' وہی جو اس رات تم نے کیا تھا۔''

''وہ مجھ سے انجانے میں ہوا تھا۔''

''اب جان بوجھ کر لو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مجھ پر چھا گئی۔

نغمہ ایک گھنٹے تک میرے ساتھ رہی مگر میری بیگم راحت ذرا سا ہل بھی نہ سکی۔ وہ ایسی بے سدھ پڑی رہی جیسے اس میں جان ہی نہ ہو مجھے یہ سوچ کر خوف آ رہا تھا کہ اگر بیگم جاگ جاتی اور مجھے اور نغمہ کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیتی تو وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرتی۔ اس کے ذہن میں میرے لیے جو عزت و احترام تھا وہ سب خاک میں مل جاتا پھر مجھے ہوش نہیں رہا' صبح ہی آنکھ کھلی۔ یہ سلسلہ تین مہینے تک چلا' ہر ہفتے نغمہ میرے کمرے میں چلی آتی اس کے آنے پر میری بیگم بے سدھ ہو جاتی تھی۔

تین مہینے کے اندر میری صحت بہت خراب ہو گئی تھی خون کی کمی بہت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر بھی حیران تھے کہ مجھے کوئی خطرناک بیماری بھی نہیں ہے پھر بھی خون کیوں کم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کے مرض سمجھ میں نہ آنے پر میں نے عاملوں سے رجوع کیا جس پر مجھ پر انکشاف ہوا کہ نغمہ ایک چڑیل ہے جو نوجوانوں کا خون پیتی ہے۔ وہ بھی میرا خون پی رہی ہے اگر وہ اسی طرح میرا خون پیتی رہی تو میرا انجام بہت ہی خطرناک ہو گا۔ میں نے کئی عاملوں سے علاج کرایا مگر نغمہ کسی کے قابو میں نہیں آئی اور وہ ہر ہفتے میرے پاس آتی رہتی ہے اس نے اب مجھے دھمکیاں بھی دینا شروع کر دی تھیں کہ میں نے اپنا علاج کرانا بند نہیں کیا تو ایک ہی رات میں میرے جسم کا سارا خون پی جائے گی۔ میں ڈر گیا اور اپنا علاج کرانا بند کر دیا پھر میرے دوست نے آپ کا پتا دیا تو یہاں آیا ہوں۔'' وہ بولا۔ میں نے آنکھ بند کر کے کچھ پڑھا اور پھر مجھ پر وہ حقیقت

آشکار ہوگئی۔

"نوجوان تم سے جو بڑی غلطی ہوئی وہ اس رات میں جو حرکت سرزد ہوئی اس کا نتیجہ ہے کہ وہ چڑیل تم پر غالب آ گئی ہے۔ اس چڑیل کے پاس شیطانی طاقتیں ہیں جس کے سبب ہر عامل اسے قابو نہیں کرسکتا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ پڑھائی کے زور سے تمہیں اس خبیث چڑیل سے نجات دلاؤں۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے میرے قابو نہیں آئے گی، اس نوجوان کی خاطر مجھے بھرپور کوشش کرنا پڑے گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں گا، کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہونے پر میں چونکا۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں وہی ہوں جس کے لیے یہ وظیفہ پڑھ رہے ہو۔" وہ بولی۔

"ظاہر کیوں نہیں ہو رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ میرے کہنے پر وہ ظاہر ہوگئی وہ انتہائی بدصورت بوڑھی عورت تھی، جسے دیکھ کر بھی گھن آجائے۔

"میں جس کے لیے یہ وظیفہ پڑھ رہا ہوں وہ تو بہت ہی حسین چڑیل ہے۔"

"چڑیل اور حسین یہ ناممکن سی بات ہے، چڑیلیں حسین ضرور نظر آجاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خوب صورت نہیں ہوتیں۔" وہ بولی۔

"تم میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟"

"تمہیں خبردار کرنے آئی ہوں کہ یہ وظیفہ پڑھنا چھوڑ دو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

ملا نصیر الدین کا گدھا

ملا نصیر الدین کا گدھا مر چکا تھا اور اس کے بغیر ان کی زندگی بڑی مشکل سے گزر رہی تھی۔ چنانچہ کئی مہینوں کی محنت و مشقت کے بعد کچھ رقم جمع کی اور ایک نیا گدھا خریدنے کی غرض سے بازار کا رخ کیا۔ حسب منشا گدھا خریدا اور گھر کی راہ لی اس طرح لی کہ وہ گدھے کی رسی تھامے آگے آگے چل رہے تھے اور گدھا ان کے پیچھے آرہا تھا۔ راستے میں چند ٹھگ قسم کے لوگوں نے ملا کو گدھا لے جاتے ہوئے دیکھا تو ان کے قریب ہوگئے ان میں سے ایک آدمی گدھے کے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ آہستہ گدھے کی گردن سے رسی نکال کر اپنی گردن میں ڈال دی اور گدھا اپنے ساتھیوں کے حوالے کردیا۔ جب ملا اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے اور مڑ کر پیچھے جو دیکھا تو چار ٹانگوں والے گدھے کے بجائے دو ٹانگوں والا گدھا نظر آیا یہ دیکھ کر ملا سخت حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ "سبحان اللہ، میں نے تو گدھا خریدا تھا انسان کیسے بن گیا۔"

یہ سن کر وہ ٹھگ بولا "آقائے من میں اپنی ماں کا ادب نہیں کرتا تھا اور ہر وقت ان کے درپے آزار رہتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بددعا دی کہ تو گدھا بن جائے چنانچہ میں انسان سے گدھا بن گیا تو میری ماں نے مجھے بازار میں لے جا کر فروخت کردیا۔ کئی سال سے میں گدھے کی زندگی بسر کررہا تھا۔ آج خوش قسمتی سے آپ نے مجھے خرید لیا اور آپ کی روحانیت کی برکت سے میں دوبارہ آدمی بن گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ملا کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بہت عقیدت کا اظہار کیا۔

ملا کو یہ بات بہت پسند آئی وفور مسرت میں نصیحت فرماتے ہوئے کہنے لگے۔ "اچھا اب جاؤ اور اپنی ماں کی خدمت کرو کبھی اس کے ساتھ گستاخی نہ کرنا۔"

ٹھگ ملا کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگیا دوسرے دن ملا نے کسی سے کچھ رقم ادھار لی اور پھر گدھا خریدنے بازار میں پہنچ گئے ان کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ وہی گدھا ایک جگہ بندھا کھڑا ہے، جو انہوں نے کل خریدا تھا چنانچہ وہ اس گدھے کے قریب گئے اور اس کے کان میں کہنے لگے۔ "لگتا ہے تم نے میری نصیحت پر عمل نہیں کیا اس پھر گدھے بن گئے ہو۔"

محمد موسیٰ ...... کراچی

''میرے پاس بھی طاقت ہے میں تمہیں مار دوں گی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''سوچ کیا رہی ہو عمل کیوں نہیں کرتی؟''

''میں دھمکی نہیں دے رہی میں واقعی میں تمہیں ہلاک کردوں گی۔''

''مجھے معلوم ہے تم دھمکی نہیں دے رہی ہو بلکہ مجھے مارنے آئی ہو پھر کیا سوچ رہی ہو جلاؤ نا مجھے۔'' میں نے ہنستے ہوئے دیکھا۔

مجھے ہنستا دیکھ کر وہ غصے سے آگ بگولہ ہوگئی اور کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ آگ کا شعلہ میری طرف لپکا مگر وہ میرے گرد حصار سے ٹکرا کر غائب ہوگیا۔ چڑیل نے کئی وار مجھ پر کیے مگر وہ ناکام رہی۔ وہ غصے سے جھلاتے ہوئے بولی۔

''اس وقت تم نے اپنے گرد حصار قائم کیا ہوا ہے اس لیے میں تمہیں نقصان پہنچانے سے قاصر ہوں جس وقت بھی تم حصار سے نکلو گے میں تم پر حملہ کردوں گی۔''

''تم میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتیں کیونکہ میں ہر وقت باوضو رہتا ہوں جو لوگ باوضو رہتے ہیں ان پر کالا جادو اثر نہیں کرتا بلکہ کالا جادو کرنے والا خود ہی کالے علم سے ہلاک ہوجاتا ہے۔''

میری بات پر اس نے غصے سے زمین پر پیر پٹخا اور غائب ہوگئی اس کے غائب ہوجانے پر میں پھر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ دو دن گزرنے پر جب میں وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ وہ چڑیل پھر آ گئی اس بار وہ غصے میں نہیں تھی میں اس کو دیکھ کر مسکرایا۔

''آج کیا دھمکی دینے آئی ہو؟''

''میں دھمکی دینے نہیں بلکہ ایک آفر کرنے آئی ہوں۔''

''کیسی آفر؟'' میں چونکا۔

''تم اگر یہ وظیفہ چھوڑ دو تو میں دولت سے مالا مال کردوں گی۔''

''دولت سے مالا مال......''

''میں زمین میں چھپے خزانوں کے بارے میں جانتی ہوں۔''

''اس دن تم مجھے جلا کر بھسم کرنے آئی تھی آج دولت سے مالا مال کردینا چاہتی ہو آخر عبدالرشید میں ایسی کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے پاس شیطان کی بہت بڑی شکتی ہے اور یہ سب ایسے ہی حاصل نہیں ہوگئی میں نے بہت جتن کیے ہیں جب کہیں جا کر یہ شکتی ملی ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے امر ہونا چاہتی ہوں' ہمیشہ کی زندگی پانے کے لیے مجھے سو آدمیوں کا خون پینا ہے۔ خون پینے کا عمل اس کرنا ہے کہ جس شخص کا میں خون پی رہی ہوں وہ خون پینے سے ہلاک نہیں ہوجاتا اس وقت تک میں دوسرے شخص کا خون نہیں پی سکتی۔ میں نے ننانوے آدمیوں کا خون پی لیا ہے' اب عبدالرشید کا سو واں نمبر ہے اگر عبد الرشید میرے خون پینے سے ہلاک نہیں ہوتو میں ہلاک ہوجاؤں گی۔ اب میں کسی اور شخص کا بھی خون نہیں پی سکتی۔ میں مجبور ہوگئی ہوں اس سے قبل میں نے عبدالرشید کا علاج کرنے والے عاملوں کو ڈرا دھمکا کر علاج کرنے سے روک دیا تھا' تم باوضو رہتے ہو اس لیے میرا علم تم پر نہیں چل سکتا۔ اس لیے میں نے دولت کی آفر کی ہے' مجھے ہر حال میں عبدالرشید کا علاج رکوانا ہے ورنہ میری موت یقینی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ عبدالرشید کو ہلاک کر کے تم ہمیشہ کی زندگی پالو گی' ابھی تم ننانوے آدمیوں کو ہلاک کرچکی ہو سو واں شکار عبدالرشید

ہوگا، ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے پر تم نا جانے اور کتنا انسانیت کو نقصان پہنچاؤ گی۔"

"میں کیا کرتی ہوں کیا نہیں تم اس چکر میں پڑنے کی بجائے میری بات مان لو اور میں تمہیں منہ مانگی دولت دوں گی۔" وہ بولی۔

"میں ایسا نہیں کرسکتا میں انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لیے کام کرتا ہوں پھر تم نے کیسے یہ اندازہ لگالیا کہ دولت کی خاطر میں تمہاری بات مان لوں گا۔"

"تم دولت کو ٹھکرا کر اپنا نقصان کررہے ہو، میں کوئی اور راستہ نکال ہی لوں گی لیکن عبدالرشید کو کسی صورت میں نہیں چھوڑوں گی۔"

"تم عبدالرشید کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔" میں نے غصہ سے کہا۔

میرے غصہ کرنے پر وہ غائب ہوگئی اس کے جانے پر میں دوبارہ وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

دو دن گزرنے پر وہ پھر میرے سامنے تھی وہ میری منت سماجت کرنے لگی، میرے مسلسل انکار پر اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ اس نے کئی وار کیے اس کا ہر وار خالی گیا۔ وہ جنونی حالت میں آگئی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے وار خالی جانے پر دیوانی ہوگئی تھی۔ وہ ہر حالت میں مجھے نقصان پہنچانا چاہ رہی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں حصار میں بیٹھا ہوں ایسے میں اس کا کوئی بھی وار اثر نہیں کرے گا پھر بھی وار کررہی تھی۔

میں نے جب سے وظیفہ شروع کیا تھا، وظیفہ ختم ہونے پر پانی پر دم کرتا رہتا ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں اس پانی کا استعمال کرسکوں، میں نے فوراً وہ پانی چڑیل پر اچھال دیا۔ جیسے ہی پانی چڑیل کے جسم پر پڑا، اس کی چیخ نکل گئی پورے بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ وہ چیختی چلاتی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی تھی۔ میں نے اس راکھ کو ایک تھیلی میں بھر کر ایک کونے میں رکھ دیا، میں جو چاہ رہا تھا وہ ہوچکا تھا۔

عبدالرشید کے میرے پاس آنے پر میں نے چڑیل کے ہلاک ہونے کی خوشخبری سنادی جسے سن کر وہ خوش ہوگیا۔

"عبدالرشید تم جو یہ تھیلی میں راکھ دیکھ رہے ہو اس چڑیل کی ہے تمہیں اس راکھ کو دریا میں بہانا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اس چڑیل کی راکھ کو دریا میں ڈال دوں گا۔" عبدالرشید خوش ہوتے ہوئے بولا۔

اس نے مجھے اچھی خاصی رقم دینا چاہی مگر میں نے مسکراتے ہوئے رقم لینے سے انکار کردیا۔

"عبدالرشید میں یہ کام خدمت خلق کے جذبے کے تحت کرتا ہوں، دولت کی مجھے ہوس نہیں ہے تم جو رقم دینا چاہ رہے ہو یہ رقم کچھ بھی نہیں ہے اس چڑیل نے مجھے کئی خزانے دینے کی آفر کی تھی مگر میں نے انکار کردیا اور میں نے تمہارا علاج کرکے ثابت کردیا کہ مجھے خزانے حاصل کرنے کا نہیں خدمت خلق کا شوق ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر عبدالرشید نے سر جھکالیا۔ آج میں بہت خوش تھا، میں نے خزانوں کو ٹھکرا کر ثابت کردیا تھا کہ مجھے دولت سے پیار نہیں ہے، دولت سے اگر دلچسپی ہے تو صرف اتنی کہ ضروریات زندگی پوری ہوتی رہے اور بس......!

قسط نمبر 31

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

’’تم ملک حیات تم، طارق کہاں ہے؟‘‘ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

’’تم نے جو بات بھی کرنی ہے، مجھ سے کرو، وہ اس وقت میرے سامنے بندھا ہوا پڑا ہے۔‘‘ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میرے بدن میں سنسنی تیز ہونے لگی۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پھر کہا۔

’’ملک حیات! میں کہہ رہا ہوں میری اس سے بات کراؤ۔‘‘

’’نہ کراؤ تو پھر کیا کرو گے؟‘‘ اس نے مجھے اشتعال دلانے والے لہجے میں حقارت سے کہا۔

’’تو پھر تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر طارق نذیر کو ایک خراش بھی آئی تو سمجھ لو تم نے اپنی زندگی پر لکیر پھیر دی ہے۔‘‘ میں اسی کے لہجے میں جواب دیا تو وہ تپ گیا۔ اس کے ساتھ ہی چٹاخ سے ایک تھپڑ کی آواز گونجی۔

’’لو، نکال دیا اس کی ناک سے خون، کیا اکھاڑ لو گے میرا۔‘‘ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

’’سنو! کسی کو گھیر کر تھپڑ مار لیا بہت آسان ہوتا ہے، ہیجڑے کرتے ہیں ایسا، لیکن سن لو، میں تجھے ماروں گا نہیں، لیکن تو اس دھرتی پر سیدھا چل بھی نہیں سکے گا اور تجھے پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تیرے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔‘‘

’’تجھے مجھ تک پہنچنے میں پتہ نہیں کتنا وقت لگے گا، لیکن تب تک پتہ نہیں کیا کچھ ہو جانے والا ہے، تجھے اس کی سمجھ بھی نہیں آئے گی۔‘‘

’’چل پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟‘‘ میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ اروند سنگھ میری بات سن کر بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ تیزی سے کار کی طرف بڑھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھنے تک کال ملا لی تھی۔ کال ملتے ہی میں نے کہا۔

’’تم لوگوں کو پتہ ہے کہ تمہارا باس کہاں ہے؟‘‘ میں نے طارق نذیر کے ایک جونیئر سے پوچھا۔

’’ہمیں تو وہ گھر جانے کا بتا کر نکلے ہیں۔‘‘ اس نے جواب دیا تو میں نے اسے صورت حال بتا دی اور اسے سمجھا دیا کہ اُن لوگوں نے کرنا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سرمد کو کال کی۔ وہی سرمد جو روہی میں تھا اور پچھلے ایک برس سے اپنے نیٹ ورک کے ساتھ لاہور میں رہ رہا تھا۔ وہاں لاہور میں قدم جمانے کے لیے شروع شروع میں اس کی میں نے مدد کی تھی۔ پھر وہ خود ایک کامیاب ٹیم بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں یہ مانتا تھا کہ وہ جس تیزی اور صفائی سے کام کرتے تھے میں خود حیران تھا۔ ان کے پاس معلومات حیران کن حد تک تھیں۔ وہ گاہے بگاہے مجھے کسی نہ کسی کام کے لیے کہتا رہتا تھا لیکن اس سے متعلق کوئی ایسا کام نکلا ہی نہیں تھا۔ جب سے اجنبی کا فون مجھے ملا تھا، اور اروند نے مجھے بتایا کہ وہ اجنبی لاہور میں ہے تب میرے ذہن میں فوراً آ گیا تھا کہ تانی پر حملہ ضرور ہو گا۔ جس کا بندوبست میں نے بروقت کر دیا تھا۔ تانی کسی ضرر کے بغیر نور نگر پہنچ گئی تھی۔ اس حملے میں ملک حیات کا نام سامنے آیا تو میں نے سرمد کو اسی کام پر لگا دیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ملک حیات اتنی تیزی سے ری ایکشن دکھائے گا۔ اس کے دو بندے افضل رندھاوا نے پکڑ لیے تھے۔ ان کی یہاں موجودگی ہی مجھے کھٹک گئی تھی۔

’’ہاں سرمد! اس نے طارق نذیر کو پکڑ لیا ہے، یہ کیسے ہوا؟‘‘ میں نے اسے بتایا۔

’’اس نے نہیں پکڑا، وہ میرے پلان کے مطابق وہاں گیا ہے۔ اس نے وہاں یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک کرپٹ آفیسر ہے۔ دولت کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ آپ کو گھیرنے کا پلان کر رہا ہے۔ میں ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں کچھ دیر

بعد آپ کو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔" اس نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو میری پریشانی کافی حد تک ختم ہوگئی۔ میں نے اس کے بھیجے ہوئے بندوں کے بارے میں اُسے بتایا اور فون بند کر دیا۔

اروند سنگھ گھر کی طرف تیزی سے کار بھگائے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے سرمد سے ہونے والی بات کے بارے میں بتایا لیکن اس نے کار کی رفتار کم نہیں کی۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا اضطراب کم نہیں ہوا بلکہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس نے کار پورچ میں روکی اور مجھے آنے کا کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ اس نے جاتے ہی اپنا لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔

"اروند! تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟" میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو اس نے اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے جواب دیا

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اجنبی اس کے آس پاس ہے یا نہیں؟"

"وہ اس کے پاس نہیں ہوگا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ میری جانب دیکھ کر بولا۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ سامنے نہیں آئے گا۔ ویسے تم دیکھ لو، اور ہاں میں شہر جا رہا ہوں۔ مجھے جو بھی اپ ڈیٹ ہو بتاتے رہنا۔" میں نے اس کے پاس سے اُٹھتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"او کے، میں بتا تا رہوں گا۔"

میں نے جنید کو کال کی اور پورچ تک آ گیا۔ وہ پہلے ہی وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس کے پاس چوہدری اشفاق بھی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھی کار میں بیٹھنے لگا تو میں نے کہا۔

"اشفاق! یہاں رہو اور اپنے بندوں کو بھی الرٹ رکھنا، نجانے کیوں مجھے یہاں پر حملے کا احساس ہو رہا ہے۔"

"بات اس حد تک ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ اسے فوری طور پر کرنا کیا ہے۔ وہ اُتر گیا تو جنید نے کار بڑھا دی۔ میں اور جنید اسی پر بات کر رہے تھے کہ اس دوران سرمد کا فون آ گیا۔

"جمال جی! یہاں کی فکر نہیں کرو، بلکہ اپنے علاقے کو سنبھالو، وہاں آپ کے لیے زیادہ خطرہ ہے۔ صرف ملک حیات ہی کے بندے وہاں پر نہیں، کچھ دوسرے بھی ہیں۔"

"یہ کیسے پتہ چلا؟" میں نے پوچھا۔

"ملک حیات نے بتایا ہے طارق نذیر کو اور میں سُن رہا ہوں۔ معاہدے کے مطابق یہ بات وہ آپ کو نہیں بتائے گا، بلکہ وہیں بیٹھا پلان بنا رہا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"کیا اسے نہیں پتہ کہ اس کے دو بندے پکڑے گئے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے پتہ نہ ہو؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی تو بات ہے۔ وہ پکڑے ہی اسی لیے گئے ہیں کہ دھوکا ہو جائے۔ آپ وہاں دیکھیں، میں یہاں دیکھتا ہوں، شام تک ان کا بندوبست کر لیتے ہیں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں افضل رندھاوے کے سرکاری گھر جا پہنچا۔ جنید مجھے اتار کر چلا گیا تھا۔ اسے میں نے ایک اہم کام کے لیے بھیج دیا تھا۔ وہیں پر ظہور مرزا بھی آ چکا ہوا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی رندھاوا خوشی سے کہنے لگا

"وہ دو لڑکے میں نے......"

"مجھے ان کی ضرورت نہیں، ان جیسے کئی اس علاقے میں موجود ہیں، مجھے وہ سب چاہئیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”وہی جو تم سن رہے ہو۔ اور جس کے پاس سے تم نے یہ لڑکے پکڑے ہیں، اسے بھی یہاں بلاؤ۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھ کر کہا۔

”یار، وہ اس وقت ایم این اے، یہ تو جب میں نے جا کر کہا کہ مجھے فلاں لڑکے......“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اب مجھے اس کے گھر بھی جانا پڑے گا؟“

”میں کہہ رہا ہوں نا، میں اس سے بات کرتا ہوں، پھر جانا پڑا تو چلے جائیں گے۔“ وہ تیزی سے بولا اور اپنا سیل ملا کر نمبر پش کرنے لگا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ظہور مرزا بڑے اعتماد کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا تھا۔ کال مل گئی، جس پر رندھاوے نے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سلیم خان نے ساری بات سن کر کہا۔

”دیکھو، رندھاوا صاحب، مجھے وہاں آپ کے پاس آنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر جمال صاحب میرے پاس آتے ہیں تو بھی مجھے خوشی ہو گی۔ عرض میری یہ ہے کہ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ دونوں لڑکے کس نیت سے یہاں پر ہیں، میں نے فوراً آپ کے حوالے کر دیئے۔“

”یہاں ظہور مرزا صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں، اگر آپ آ جائیں تو میرا خیال ہے بیٹھ کر جو بات ہو جائے وہ زیادہ بہتر ہے۔“

”جی میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور کال بند کر دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ وہاں پر تھا۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت ہی سے لگتا تھا کہ وہ دولت مند اور حوصلے والا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے ملا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔

”یوں تو بہت ساری باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات کہوں گا۔“ میں نے سلیم خان اور ظہور مرزا کی جانب دیکھ کر کہا۔

”بولیں۔“ ظہور مرزا نے جواب دینے میں پہل کی تو میں نے کسی تردد کے بغیر کہا۔

”یہ جو دو لڑکے پکڑے گئے ہیں، یہ محض دھوکا ہیں، انہیں آپ چھوڑ بھی دیں تو وہ مجھے نقصان پہنچانے والے نہیں، مجھے وہ لوگ چاہئیں، جو ان کے علاوہ یہاں اس علاقے میں موجود ہیں اور وہ بھی دو گھنٹے میں مل جانے چاہئیں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنے شارٹ وقت میں ایسا ممکن نہیں، دوسرا، ہمیں نہیں علم کوئی اور لوگ بھی ہیں یہاں۔“ سلیم خان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”ظہور مرزا صاحب کیا کہتے ہیں آپ؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

”وہی جو سلیم خان کہہ چکے ہیں اور پھر یہ آپ ہمیں ہی کیوں کہہ رہے ہیں، ایسے جرائم پیشہ لوگوں کو تلاش کرنے کے لیے آپ پولیس کو کہیں۔“

”آپ دونوں سے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ دونوں کے بارے میں بہت اچھی طرح جان گیا ہوں۔ اس علاقے میں کوئی بھی جرم ہوتا ہے، اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں جا کر آپ لوگوں سے ضرور ملتے ہیں۔ میرے قتل کے لیے یہاں آنے والے، دو گھنٹے میں یہاں ہوں۔ آپ لوگ ہی انہیں تلاش کر کے لے آئیں، اس سے پہلے کہ میرے لوگ انہیں یہاں تک لے آئیں۔“

”آپ کے لوگ اگر لا سکتے ہیں تو پھر ہمیں کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہ میں نہیں سمجھا۔“ سلیم خان نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

”اس لیے کہ میں ابھی وقت دینا چاہ رہا ہوں۔

میں یہاں کسی بھی قسم کی کوئی دشمنی پالنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ لیکن اگر اب کوئی دشمنی پالنا چاہتا ہے، تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ دوسرا یہ میرا خیر سگالی کا پیغام ہوگا، آپ دونوں کے لیے۔ صرف دو گھنٹے۔" میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ کیونکہ جنید باہر آچکا تھا اور اس نے مجھے کام ہو جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔

"یہ تو آپ ہمیں سیدھے الزام دے رہے ہیں کہ وہ لوگ ہمارے پاس ہیں اور ہم دے نہیں رہے۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ ......" سلیم خان نے غصے اور جھنجلاہٹ میں کہا تو میں اس کی سنی ان سنی کرتا ہوا باہر آگیا۔

میں جنید کے ساتھ نور نگر کی طرف جانے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ اس نے مجھے ان دونوں لڑکوں کا سیل فون لے آنے کے بارے میں بتایا جو وہاں کے منشی کے پاس جمع تھے۔ اس نے ان لڑکوں کے ساتھ بات کر کے ان کی آواز ریکارڈ کر لی تھی۔ رندھاوا کے ساتھ سلیم خان اور ظہور مرزا سے ہونے والی ساری باتیں میرے سیل فون میں محفوظ ہو گئی تھیں۔ وہ میں نے جنید کے فون میں منتقل کر دیں۔

نور نگر پہنچتے ہی جنید سیدھا اروند سنگھ کے پاس چلا گیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے سرمد سے رابطہ کرنا تھا۔ میں کمرے میں گیا تو سوہنی بیڈ پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ میرے چہرے پر دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"خیر ہے، آپ یوں؟"

"میرے ساتھ خیر ہی ہے، بس کچھ مسئلے ہیں، تم ایسا کرو میرے لیے چائے لے کر آؤ۔" میرے یوں کہنے پر وہ سمجھ گئی کہ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہی سرمد کو کال ملائی۔ وہ جیسے میرے ہی انتظار میں تھا۔

"میں نے ملک حیات کو گھیر لیا ہے۔ اس کے ارد گرد سیکورٹی بہت زیادہ ہے۔ میں اگلے دو منٹ میں اسے مار سکتا ہوں ......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"نہیں اسے زندہ پکڑنا ہے۔"

"مجھے بھی احساس ہے کہ اسے زندہ پکڑنا ہے۔ مجھے پانچ سے دس منٹ مزید دیں، وہ جیسے ہی باہر نکلتا ہے، میں اسے قابو کر لیتا ہوں۔"

"اوکے میں انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ دو منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ اروند کی کال مجھے آگئی۔

"ان لڑکوں کے سیل فون بالکل بے کار ہیں۔ چند لوگوں کے سوا ان میں سے کسی کا رابطہ نمبر نہیں جو ہمارے کام کا ہو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے، وہ سارے نمبر ہی کام کے ہیں۔ انہیں نظر انداز مت کرو۔ انہی سے ہی باقی لوگوں کے بارے میں پتہ چلنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں آیا۔ "وہ اجنبی اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ لاہور ہی میں ہے، جوہر ٹاؤن کے علاقے میں صبح سے وہیں ہے، ایک ہی جگہ پر۔"

"گاہے بگاہے اسے دیکھتے رہنا۔" میں نے اسے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی چوہدری اشفاق کا فون آگیا۔

"ہاں بولو، کوئی......"

"دو مشکوک بندے ملے ہیں، نور نگر سے باہر نہر کے پاس ڈیرے پر موجود تھے۔ وہ مہمان ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اس بندے کے بارے میں بتایا، جن کے وہ مہمان تھے اور وہ ان کے کزن تھے۔ وہ دونوں ہی سیالکوٹ کے قریب شمال کی جانب کسی گاؤں سے

آئے تھے۔ انہیں تقریباً دس دن ہو چلے تھے یہاں آئے ہوئے۔ وہ زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہتے تھے۔ بہت کم گاؤں میں آتے تھے۔"

"انہیں چیک کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ڈیرے سے دو جدید اے کے فورٹی سیون ملی ہیں۔ میں انہیں اور ان کے کزن سمیت لے کر آ رہا ہوں، تھوڑے اکھڑ لگتے ہیں۔"

"ان کے پاس سیل فون ہوں گے، وہ حویلی بھیج دو۔ انہیں یہاں حویلی میں مت لانا، بلکہ مسافر شاہ کے تھڑے پر لے چلو، وہیں بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے کچھ کچھ سمجھ آ گئی تھی کہ یہ معاملہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ایسے میں سوہنی چائے لے کر آ گئی۔ وہ دو کپ بنا کر لائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھے گی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتی، میں نے اسے بتا دیا کہ معاملہ کیا ہے۔ تبھی وہ تشویش سے بولی۔

"ان کا فوراً پتہ کریں، کہیں وہ حویلی پر حملہ......"

"اب حویلی پر حملہ کرنے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا، یہاں ان کے لیے موت کے سوا کچھ نہیں، اگر ایسا کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے، اتنا وقت نہ لگاتے، مطمئن رہو۔"

"ایسا کیا ہے یہاں پر؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں کافی دور تک سیکورٹی کا بندوبست ہے، وہ بھی جدید الیکٹرونکس آلات کا۔ اگر اس کی تفصیل پوچھنی ہو تو مہوش سے پوچھ لینا۔ میں نے اب تک بتایا اس لیے نہیں کہ یہ بات عام نہیں ہونی چاہیے، اگر کوئی بری نیت رکھتا بھی ہے تو پتہ چل جائے گا۔ اس نظام کے بارے میں یہاں کے سیکورٹی والوں کو بھی نہیں پتہ، ورنہ وہ، اسی نظام پر بھروسہ کرنے لگیں گے۔" میں نے اسے سمجھایا اور خالی کپ رکھ کر اٹھ گیا۔ سرمد نے جو وقت دیا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں اس کی کال کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، اس کی کال آ گئی۔

"سوری بھائی میں تین منٹ لیٹ ہو گیا۔"

"ہوا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے پاس ہے اور میں اسے اپنے سیف ہاؤس کی طرف لے جا رہا ہوں۔ وہیں جا کے اس سے گپ شپ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، یہاں بھی کچھ مشکوک لوگ پکڑے گئے ہیں، میں انہیں دیکھ لوں، پھر بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں جنید کے ساتھ مسافر شاہ کے تھڑے تک جا پہنچا۔ تمام راستے ہم دونوں بالکل الرٹ رہے۔ کسی طرف سے بھی کوئی حملہ ہو سکتا تھا۔ پندرہ منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی چوہدری اشفاق ان دو لڑکوں کو لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ درختوں کے نیچے، بھی چار پائیوں کے پاس وہ کھڑے تھے۔ ان کے کزن کو بھی قریب ہی کھڑا کیا ہوا تھا۔ فرید اور درویش کے ساتھ چند پہلوان اور بھی تھے۔ میں جا کر بیٹھا تو ان لڑکوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر سامنے کی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ تبھی میں ان میں سے نسبتاً بڑے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"گر ساری بات سچ بتا دو گے تو وعدہ رہا کہ تم لوگوں کو کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ ابھی اور اسی وقت جانے دوں گا لیکن اگر جھوٹ بولا تو پھر معافی نہیں ہو گی۔ ایک اذیت ناک موت ہو گی۔ اب فیصلہ تم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہم یہاں اپنے کزن سے ملنے کے لیے آئے ہیں، اس کے علاوہ ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ اسلحہ ہم ہر

وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ کہیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اس نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا تو میں نے غور سے دیکھا، وہ نگاہیں چرا گیا۔ میں نے چھوٹے کی طرف دیکھ کر یہی سوال کیا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ ہمارے پاس فرید اور درویش بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔میں نے فرید سے کہا۔

''یار انہیں پانی یا شربت پلاؤ۔ جب تک ان کے بارے میں تصدیق نہیں ہو جاتی، یہ ہمارے مہمان ہیں۔'' میں نے کہا تو فرید فوراً اٹھ گیا۔

''تصدیق، کیسی تصدیق؟'' وہ کزن بولا۔

''دیکھ میں تیرا لحاظ اس لیے کر رہا ہوں کہ تو میرے علاقے کا ہے، میرا اپنا ہے۔ ان پر شک ہے، تصدیق تو بنتی ہے نا؟'' میں نے کہا۔

''بالکل، بنتی ہے۔'' اس نے جواب دیا

''ان سے پوچھ لو، تصدیق ہو جانے تک ان کے پاس وقت ہے، پھر نہیں ہوگا۔'' میں نے پھر انہیں وقت دے دیا۔ وہ ذرا سا کسمسائے لیکن بات کوئی نہیں کی۔ میں نے وقت دیکھا، دو گھنٹے گزر چکے تھے ۔فرید شربت بنا کر لے آیا۔ جو ابھی پی رہے تھے کہ اروند کا فون آ گیا۔

''ان دونوں کے ظہور مرزا اور سیالکوٹ کے پاس کسی بندے کے ساتھ رابطہ ہے۔ ابھی ذرا دیر پہلے ظہور مرزا نے اسی نمبر پر کال کی تھی۔ کچھ نمبر ایسے ہیں، جو یہیں اسی علاقے کے آس پاس کے ہیں۔''

''کتنے ہیں،؟''

''ابھی تک تو تین ہیں۔'' اس نے بتایا

''تو پھر ایسے کرو، وہ سب چوہدری اشفاق کو بتا دو، انہیں اٹھانا ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ چوہدری اشفاق نے میری بات سن لی تھی۔ وہ اٹھ کر کار کی جانب چل دیا۔ تبھی میں نے ان دونوں لڑکوں سے کہا۔

''گلاس رکھ دو اور کھڑے ہو جاؤ۔''

''کیا...... یہ......'' کزن ہکا بکا رہ گیا۔

''ہاں ان سے پوچھو، ظہور مرزا کو جانتے ہو؟'' وہ خاموش رہے۔ تبھی میں نے فرید سے کہا۔

''انہیں درخت سے الٹا لٹکا دو اور بڑا سا راڈ ڈنڈا لے آؤ، انہیں شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔''

''جی ہم جانتے ہیں، ہم بتاتے ہیں پوری بات؟'' ان میں سے چھوٹا تیزی سے بولا۔

''اب مجھے نہیں سننی، کیونکہ میں جان گیا ہوں۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ جمال بھائی جو ہو سکتا ہے، ان کے ساتھ کریں، میرے لیے جو حکم ہو، میں ویسے ہی حاضر ہوں۔ انہیں چھوڑنا نہیں، یہ تو مجھ پر اور میرے بچوں پر ظلم کرنے آئے تھے۔''

''تم ادھر ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا اور انہیں دیکھنے لگا۔ فرید نے بڑے کو اٹھایا اور اوپر اچھال کر زمین پر پٹخ دیا۔ پھر چند ٹھڈے اس کے سر میں مارے تو کملا گیا۔ باقی پہلوانوں نے اسے باندھ دیا، دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ چند منٹ بعد وہ درختوں کے ساتھ اُلٹے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ چیخنے چلانے لگے۔ میں نے افضل رندھاوا کو فون ملایا

''یہ آوازیں سُن رہے ہو؟''

''کون ہیں یہ، تو وہ......'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی تو میں نے کہا۔

''ہاں یہ سب تیرے ظہور مرزا کی سازش ہے، وہ ان لوگوں سے ملا ہوا ہے اور دھوکا دے رہا ہے۔ اسے پکڑو، دیر کی تو وہ بھاگ جائے گا۔''

''میں پکڑتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون رکھ دیا۔ میں اس وقت سلیم خان کو فون کرنا چاہتا تھا، لیکن

کچھ دیر کے لیے رُک گیا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے، جس سے اس کی نیت کا پتہ چل جاتا۔

وہ دونوں لٹکے ہوئے بے حال ہو چکے تھے۔ ان کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ تب میں نے فرید کو اشارہ کیا کہ انہیں اتارو، پہلوانوں نے انہیں اتارا تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکے، گر گئے۔

''بولو صرف سچ بولنا ہے۔''

''بتاتا ہوں۔'' بڑے نے کہا اور بتانے لگا۔

وہ دونوں بھائی سیالکوٹ کے قریب ''لوہاراں دی کوٹلی'' کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اگرچہ وہ وہاں کاشتکاری کرتے تھے لیکن ان کا زیادہ تر کام اسمگلنگ تھا۔ یہ حوصلہ انہیں غنڈہ گردی سے ملا۔ وہ اپنے علاقے کے بدمعاشوں میں شمار ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے انہی کے علاقے کے ایک سیاست دان نے کچھ زیادہ ہی نوازشیں شروع کر دیں۔ اِدھر اُدھر مال لے جانا، انہیں کھپانا اور اشتہاری مجرموں کو پناہ دینا ان کا کام تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ڈیرہ بنایا ہوا تھا، جو سیکورٹی کے اعتبار سے کافی مضبوط تھا۔ تقریباً پندرہ دن پہلے ایک بھاری رقم کے عوض انہیں نے میرے قتل کا ٹاسک دے دیا۔ انہیں ٹاسک دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں بھائیوں کے رشتے دار نور نگر میں رہتے تھے۔ وہ یہاں آ گئے۔ تب سے لے کر اب تک انہیں موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ وہ ابھی اسی تاڑ میں تھے کہ پکڑے گئے۔

''اگر یہی بات پہلے بتا دیتے تو اتنی اذیت نہ سہنی پڑتی، لیکن اب معافی نہیں ہے، انہیں دوبارہ الٹا لٹکا دو۔'' میں نے کہا تو منت کرنے لگے۔ جس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے باقی تین لوگوں کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

جسپال کے ساتھ وہ سبھی ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان چائے کے مگ پڑے تھے۔ وہ بھی خوش تھے۔ انہوں نے پوری طرح رونیت کور کے معاملے پر بات کر لی تھی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟ یہ سارا معاملہ اصل میں تھا کیا۔

''یار رونیت کور! یہ جو سب ہوا اور تو نے کیا، ایک بہت بڑے طوفان سے ہم بچ گئے، جس سے کسی صورت نکلا نہیں جا سکتا تھا، اگر ہم پھنس جاتے، تم نے یہ کیا کیسے؟ یہ کچھ ماورائی سا نہیں لگتا، جیسے ہم کوئی جادوئی کہانی سن رہے ہوں؟'' بانیتا کور اب تک مطمئن نہیں ہو پائی تھی، اس کے دماغ میں کچھ تھا۔

''دیکھ بانیتا! تمہیں سمجھ اس لیے نہیں آ رہی کہ یہ سب تم پر نہیں گذرا۔ اسی لیے میں نے تم سب سے الگ یہ کام کیا تھا، مجھے تم لوگوں کو سمجھانے میں بہت وقت لگ جاتا۔ اب جبکہ یہ ہو گیا ہے تو تمہیں ماورائی لگ رہا ہے۔'' رونیت نے کہا۔

''پھر بھی کچھ پتہ تو چلے؟'' بانیتا کور نے اصرار کیا۔

''تو سنو، یہ جو کمپیوٹر کی دنیا ہے نا، بہت زیادہ ہی ایڈوانس ہو چکی ہے اور ابھی پتہ نہیں اس نے کیا کیا کرنا ہے۔ ہم جو ہیکرز ہوتے ہیں، یہ دنیا کی ایڈوانس ترین ٹیکنالوجی کے لیے مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں، ہر وقت یہی چیز ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ اسی کا استعمال کرتے ہیں۔''

''تم نے کیا کیسے؟'' بانیتا کور آرام سے بولی۔

''ہم یہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اس کی بنیاد دو وجوہات ہیں۔ ایک اپنی بقا، ہمیں زندہ رہنا ہے۔ ہم خود اور اپنی قوم کے ساتھ۔ دوسرا انتقام، جو ہم نے ان سے لینا ہے، جنہوں نے ہم پر ظلم کیا۔ مجھے فوج سے اس لیے نفرت ہے کہ انہوں نے میرے ماں اور باپو کو میرے سامنے زندہ جلایا۔ اندرا گاندھی مرگئی، لیکن

میرے باپو نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے کیوں زندہ جلا دیا گیا۔ میں بے غیرت نہیں جو خاموش ہو جاؤں، میں سنگھنی ہوں اور میں نے انتقام لینا ہے، جب تک میری سانس ہے۔ پھر میرے پتا سمان پروفیسر دیوندر سنگھ کو مارا۔ تب سے میں انہیں تلاش کر رہی تھی۔ میرے لیے سب سے بڑا ذریعہ یہی تھا کہ میں ان کے کمپیوٹر کھنگالتی رہوں۔ میں وائرس کی طرح چمٹی رہی اور مجھے پتہ چل گیا کہ دیوندر سنگھ کا ہی چیلا، اس کی موت کا ذمہ دار ہے۔ اب میں نے اسے مارنا تھا، تم لوگ اپنا نیٹ ورک داؤ پر لگا کر مجھے کبھی بھی یہ سب نہ کرنے دیتے، جبکہ میری راتوں کی نیند اُڑ چکی تھی۔ میں نے کرنا تھا، چاہے میری جان چلی جاتی۔ صرف اروند سنگھ اس سے واقف تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں، اس سے میں نے مدد لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ سب کر کے کینیڈا بھاگ جاؤں، لیکن حالات کچھ دوسرے بن گئے۔ یہ تھی بات ساری۔" اس نے تفصیل سنا دی۔

"یار واقعی یہ ماورائی لگ رہا ہے۔" سندیپ ہولے سے بولی تو رونیت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں یا کسی بھی آدمی کو یہ ماورائی لگنا ہی ہے۔ اس کی وجہ میں بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر کہتی چلی گئی۔ "صدیوں سے یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ انسان اسی سے خوف کھاتا ہے، جسے وہ سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ انسان نے ستاروں کی پوجا کی، چاند سورج، زمین، حتیٰ کہ تم دیکھتی نہیں ہو، ہندو لوگ، چوہے، اور سانپوں کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ لیکن جسے سمجھ آتی گئی، اس نے پوجا چھوڑ دی۔ دنیا ہر لمحے ایڈوانس ہو رہی ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں ٹیکنالوجی اتنی ایڈوانس ہوئی ہے کہ آج سے سو برس پہلے والا انسان خوف ہی سے مر جائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جنہیں سمجھ نہیں آتی وہ آج بھی یہ نہیں مانتے کہ ریڈیو سے آواز کیسے نکل سکتی ہے۔ لیکن اب بات تو اس سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ یہ بڑی معمولی سی مثالیں ہیں۔ اب دنیا میں وہ کچھ ہو رہا ہے کہ آج کے عام آدمی کو پتہ چلے تو وہ بھی نہ مانے۔ کیونکہ اسے سمجھ نہیں۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ یار یہ اتنی تیزی سے ہو کیسے رہا ہے۔" سندیپ نے پوچھا۔

"خیال، سوچ۔ ایک خیال ہی نا جو انسان کے دماغ میں آتا ہے۔ وہی حقیقت کا روپ دھارتا چلا جا رہا ہے۔ کمپیوٹر کی دنیا میں جا کر مجھے اپنی ضرورت کے مطابق خیال آتا ہے، میں اسے حقیقت کا روپ دینا چاہوں گی، وہ ہو جاتا ہے۔ جسے سمجھ نہیں ہے وہ اسے ماورائی خیال کرتا ہے۔" رونیت نے جواب دیا

"ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر حقیقت کے پیچھے ایک سوچ موجود ہوتی ہے؟" سندیپ نے پوچھا۔

"بالکل، جیسے یہ مکان، کسی کی سوچ ہی تھی، یہ دنیا، یہ کائنات ربّ کا خیال ہی تو ہے۔" رونیت کور نے جواب دیا تو گرلین بولی۔

"یہ سوچو اس وقت دنیا بھر کے انسانوں کے دماغوں میں جو سوچیں ہوں گی، اس سے دنیا کتنی ایڈوانس ہو سکتی ہے۔ اگر وہی سب انسانوں پر ظاہر ہو جائے تو......"

"یہ ہو رہا ہے، دنیا ایک صفحے پر آ رہی ہے اپنی سوچیں لے کر، کیا کمپیوٹر پر ساری دنیا کے لوگ اپنا اپنا حصہ نہیں ڈال رہے ہیں؟، وہاں سے ان کی سوچ کا پتہ نہیں چل رہا ہے؟ ہم سوچ دے بھی رہے ہیں اور وہاں سے لے بھی رہے ہیں۔ ایسے ہی ہمارے گرو مہاراج نے کہا کہ اک اونکار۔ (ربّ ایک ہے) اس کی ایکتا سے ساری کثرت ہے اور اسی کثرت میں

میرے رَبّ کا ایک ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ ماورائی کچھ نہیں، جو سوچ ہے وہی حقیقت ہے، دیکھو، اب جو تم سوچ رہی ہو، وہ ہو رہا ہے، کوئی بھی سوچ ہے، وہ حقیقت کا روپ دھارتی ہے، جسے ادراک، سمجھ نہیں، یا جسے علم نہیں، وہ اسے جھوٹ اور ماورائی سمجھتا ہے۔"
رونیت نے کسی جذب سے کہا تو جسپال نے کہا۔
"اچھا بس کرو گرو مہاراج، اب میری بات سنو۔"
"سنائیں جی، ہم سن رہی ہیں۔" بانیتا کور نے کہا۔
"میں نے ایک پلان کیا ہے اگر تم لوگوں کو پسند ہو تو؟" جسپال بولا۔
"وہ کیا؟" سندیپ کور نے چونک کر کہا۔
"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چندی گڑھ چھوڑ دینا چاہیے، چاہے کچھ عرصے کے لیے سہی۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"میرے خیال میں ہمارے لیے ابھی یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے، سوائے رونیت کے، وہ اگر باہر کہیں نکلے گی تو ہی نگاہوں میں آئے گی۔" بانیتا کور نے کہا تو نوتن کور نے پرسوچ لہجے میں کہا۔
"جسپال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں غیر محتاط ہو جانا ہی ہوتا ہے۔ اس کی تلاش تو ہوگی اور بھرپور طریقے سے ہوگی۔"
"وہی تو کہہ رہی ہوں کہ فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا وقت گزار لیں، پھر نکل جائیں گے۔" بانیتا کور اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی
"چلو ٹھیک ہے، جیسے تم کہو، لیکن مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔" جسپال نے کہا۔
"کیوں، تمہیں یہاں سے کیوں جانا ہے، یار ہم لڑکیاں اکیلی رہ جائیں گی، تو ہی تو ایک کھلونا ہے ہمارے پاس، ہمارا جی کیسے لگے گا۔" بانیتا کور نے جان بوجھ کر بچوں کی مانند کہا تو جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"فضول بکواس مت کرو، یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے سے......"
"نہیں، ہم فضول نہیں بیٹھے، میرے پاس ایک بہت بڑا کام ہے، وہ اگر سن لو تو؟" رونیت کور نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
"اچھا سناؤ۔" بانیتا کور نے تحمل سے کہا تو رونیت اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔
"جسپال سنگھ ٹھیک کہہ رہا ہے کہ اسے یہاں سے جانا ہوگا، شمس الدین اور قمر الدین کو بچانا بہت ضروری ہے، وہ بہت جینئس ہیں، وہ پتہ نہیں کیا کیا چمتکار دکھا سکتے ہیں۔ تم چاروں ادھر رہو، یا بعد میں جالندھر آ جاؤ، یا جہاں بھی، وہیں سے بیٹھے سب آپریٹ ہو جائے گا، بس ان دونوں کو بچانا ہوگا۔"
"اوکے ڈن، تو پھر تم دونوں نکلو یہاں سے۔" بانیتا کور نے فیصلہ کرنے میں لمحہ لگایا۔ تبھی وہ دونوں اٹھے اور نکلنے کے لیے تیاری کرنے لگے۔

☆......☆......☆

وہ تینوں میرے سامنے تھے۔ انہوں نے ان دونوں بھائیوں کو درخت سے بندھے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ان میں سے دو بالکل نوجوان تھے۔ ان کی مسّیں بھیگ رہی تھیں۔ ایک قدرے اُدھیڑ عمر تھا۔ میں نے ان کا جائزہ لیا اور فرید کو اشارہ کر دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی پہلوان آگے بڑھے، انہوں نے گدی سے پکڑ کر آگے لانا چاہا تو وہ نوعمر لڑکے مزاحمت کرنے لگے۔ پہلوانوں نے انہیں پکڑ لیا۔ انہیں اٹھایا، سر پر سے گھمایا اور زمین پر دے مارا۔ یکے بعد گرے ان کے حواس ہی مختل ہو گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر ادھیڑ عمر نے کہا۔

”ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“
اُس کے اِس طرح پوچھنے پر فرید نے پوری قوت سے گھونسہ اس کی گردن پر مارا، وہ چکرا گیا۔ تبھی پاس کھڑے جنید نے پوچھا۔
”تم بتاؤ، تم اس علاقے میں کیوں ہو؟“
”ابھی نہیں پوچھنا، فرید کو تھوڑا ان کی مالش کر لینے دو، پھر یہ بات کرنے کے قابل ہوں گے۔“
میں نے کہا تو ان پہلوانوں نے ان تینوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کے چند منٹوں ہی میں وہ اَدھ موئے ہو گئے، شاید ابھی تک وہ اس لیے نہیں بول رہے تھے کہ انہوں نے باقی دو کو درختوں سے لٹکتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ ان کے گمان میں تھا کہ انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہوگا تو وہ بھی پکّے ہو جائیں۔ میں نے درختوں سے لٹکتے ہوئے دونوں لڑکوں کو اُتروا لیا۔ وہ زمین پر گر گئے۔
”تم لوگوں کو یہ ٹاسک کس نے دیا؟“
”ہمارے سردار صاحب ہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں، انہوں نے ہمارے ذمے کام لگایا اور ہم یہاں آ گئے۔“
”کتنی دولت ملنی تھی؟“
”کام کے ہو جانے کے بعد جتنی مانگ لیتے، دس سے پندرہ لاکھ۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ رقم اس کے لیے بہت بڑی ہو۔ تب میں نے پوچھا۔
”اگر اس سے دوگنا رقم میں دوں تو کیا تم اپنے اس سردار صاحب کو مار دو گے؟“
”وہ تو ہمارے مائی باپ ہیں نا جی، ہمارا سب کچھ انہی کی وجہ سے تو چل رہا ہے نا جی۔“
”ٹھیک ہے، کرتے ہیں اس سے بھی بات۔“ میں نے کہا اور پھر ان تینوں لٹکتے ہوئے بندوں کر اُتارنے کا اشارہ کیا۔ پہلوانوں نے انہیں اُتار لیا۔ ان کی حالت بری ہو رہی تھی۔
”تم دونوں بھی اس ان کے ساتھی ہو یا تمہیں کسی دوسرے نے بھیجا ہے؟“
”ہم تو یونہی سیر کرنے آئے تھے ادھر؟“ ادھیڑ عمر اب بھی اَڑا ہوا تھا۔ جنید نے اس کی گردن پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔
”لگتا ہے تمہیں اپنی زندگی نہیں چاہیے۔“
”ٹھیک ہے، یہ اگر اس طرح نہیں مانتے تو انہیں پورا ثبوت دو، ان کے جرم کا، یہ ثابت کر دو کہ یہ یہاں کس کام کے لیے آئے ہیں۔ پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دینا۔“ میں نے جنید کی طرف دیکھ کر کہا اور اُٹھ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر ذرا وقت لے گا، باقی وہ نئے لڑکے جلدی بول پڑیں گے۔ میں اکیلا ہی کار میں بیٹھا اور حویلی کی طرف چل پڑا۔
مجھے پورا یقین تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور وہ ہو کر رہے گا، کیا ہو سکتا ہے، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں حویلی پہنچ گیا۔ میں اس وقت لاؤنج ہی میں تھا کہ مجھے چوہدری اشفاق کا فون ملا۔
”وہ تینوں بول پڑے ہیں، کہہ رہے کہ ان نوجوانوں کا تعلق پسرور سے ہے اور وہ ادھیڑ عمر لاہور کے نواح کا ہے۔ تینوں ہی تمہیں قتل کرنے کی غرض سے اس علاقے میں آئے تھے۔“
”یہ پوچھا، انہیں کس نے بھیجا ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا
”ہاں پوچھا لاہور میں ایک بزنس مین ہے، چوہدری رفاقت اس نے انہیں یہ ٹاسک دیا تھا۔“
”وہ کوئی سیاست دان ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”جی، اسمبلی کا رکن ہے۔ پارٹی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

میں ایک لمحہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ اچانک سیاست دان میرا گھیراؤ کیوں کر رہے ہیں۔ یہ تین لوگ تو میرے سامنے آ گئے تھے۔ ممکن ہے اب بھی علاقے میں کئی ایسے لوگ ہوں، جن کے بارے میں ابھی پتہ نہ لگا ہو۔ ملک حیات، سردار صاحب اور چوہدری رفاقت۔ تینوں ہی میں مشترک بات یہ تھی کہ وہ سیاست دان تھے، ایک ہی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور تینوں کا ریکارڈ کرپشن کے حوالے سے خراب ہی تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ان کا کردار اپنی جگہ، لیکن میری ان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے، وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟ اسی سوال کے پردے میں سب چھپا ہوا تھا اور اسے میں نے ہی تلاش کرنا تھا۔

میں حویلی پہنچا ہی تھا کہ سلیم خان کے آنے کی اطلاع ملی۔ میں نے اسے اندر ہی بلا لیا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر آن بیٹھا اور بڑی حیرت اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت میں بولا۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ کے بارے میں کوئی اتنا برا پلان کرے گا۔ میں اب تک اسے یونہی سمجھ رہا تھا، اگر آپ چوکنا نہ ہوتے تو اب تک یہ لوگ اپنا کام کر جاتے۔“

”آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ اس کے پیچھے کوئی بڑا پلان ہے، خطرہ ابھی ختم نہیں ہوا، میرے خیال میں ابھی تو یہ شروعات لگتی ہیں۔ اگر ظہور مرزا انہیں راہ نہ دیتا تو شاید وہ اس علاقے میں آنے کی جرات بھی نہ کرتے۔“ وہ اپنی رُو میں کہتے ہوئے ایک دم سے چونک گیا، پھر صفائی دینے والے لہجے میں بولا۔

”دیکھیں، میری ظہور مرزا سے سیاسی مخالفت اپنی جگہ لیکن ہم علاقے کے لوگ ہی ایک دوسرے کو مروانے لگے تو یہاں کیا بچے گا، میں یہاں کوئی صفائی دینے یا ظہور مرزا کی مخالفت میں نہیں آیا، میں اس لیے آیا ہوں کہ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے، میں آپ کے ساتھ ہوں، میرے لائق جو بھی خدمت ہو میں حاضر ہوں۔“

”بہت شکریہ سلیم خان، اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں ضرور کہوں گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے اس کا چہرہ افسوس زدہ سا لگا۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھا رہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں اجازت چاہتا ہوں، میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔“

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چلا گیا۔ میں اٹھا اور اروند سنگھ کے پاس جا بیٹھا۔

سرمد نے ملک حیات کو پکڑ لیا تھا اور وہ اس کے سیف ہاؤس میں تھا۔ اس نے کسی خوف کے بغیر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس نے مجھے قتل کروانے کے لیے بندے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر آدھے گھنٹے میں اسے نہ چھوڑا گیا تو سرمد پکڑا جا سکتا ہے۔ سرمد بھی اور میں بھی یہ بات سمجھ رہے تھے کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان، دونوں طرف کی صورت حال واضح تھی۔ وہ ملک حیات کی ساری دھمکیاں بڑے سکون سے سن رہا تھا۔ وہ صرف میری اجازت کے انتظار میں تھا کہ میں اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہوں۔

یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ وہ تینوں ہی کسی کے مہرے تھے۔ بات میرے قتل کی بھی نہیں تھی۔ انہیں مجھے قتل کروانا ہوتا تو اب تک کوئی بھی اندھی گولی مجھے چاٹ چکی ہوتی۔ وہ کرنا کیا چاہتے ہیں، یہی بات سمجھنا تھی۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔ افضل رندھاوا نے ظہور مرزا کو

گرفتار تو نہیں کیا، ویسے ہی تھانے میں پابند کرلیا تھا۔ مسافر شاہ کے تھڑے پر موجود پکڑے ہوئے لوگوں نے اقرار کرلیا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے ہیں۔ان کا یہاں پر سہولت کار کون تھا۔ساری تفصیل جان لینے کے بعد جنید اور چوہدری اشفاق انہیں شہر افضل رندھاوے کے پاس لے گئے ۔ وہاں بھی انہوں نے اقرار کیا،ان کے خلاف ایف آئی آر درج ہوگئی اور انہیں حوالات سے جیل بھیج دیا گیا۔میں نے جان بوجھ کر انہیں پولیس کے حوالے کیا تھا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حاکم وقت اس سازش میں کس حد تک شریک ہیں۔شام ہونے تک ایسا سکون چھا گیا،جس کے پیچھے ایک طوفان چھپا ہوا ہوتا ہے۔

شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہوگئی تھی۔میں نے سب کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔کچھ دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ لگائی اور کمرے میں آگیا۔میرے پیچھے ہی سوہنی آگئی۔اس نے آتے ہی پوچھا۔

''کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہے ہیں، خیر تو ہے نا،کوئی......''

''نہیں،ایسا کچھ نہیں ہے،ایک سازش بُنی جارہی ہے،بس اسے ختم کرنا ہے۔''

''سازش،کیسی سازش؟''سوہنی نے پوچھا۔

''مجھے لگ رہا ہے، اس کے پیچھے کچھ ہے، وہ سامنے آجانے پر ہی پتہ چلے گا نا۔''میں نے کہا۔

''کیسے پتہ چلے گا؟''اس نے پوچھا۔

''میں ابھی نکل رہا ہوں، دیکھتے ہیں۔''میں سکون سے کہا تو وہ حیرت سے بولی۔

''یہ کیا بات ہوئی، ابھی تانی کی شادی ہے،آپ نے خود کہا کہ سادگی سے شادی کردی جائے ، دو دن بعد اس کی شادی ہے،سب لوگ آرہے ہیں، یہاں تک کہ مہر خدا بخش بھی،اب......''

''میرا جانا ضروری ہوگا، ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اتنے سارے لوگ یہاں ہوں گے، میں اگر یہاں نہ ہوا تو یہ اچھا ہوگا، دشمنوں کو میری ضرورت ہے، وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں،سوتانی کی شادی آرام سے ہوجائے گی، میں دشمنوں کو دوسری طرف مصروف......''میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

''نہیں، میں نہیں جانے دوں گی ، یہ وقت نہیں ہے،آپ کو ادھر ہی رہنا ہوگا۔میں اماں سے کہتی ہوں۔''اس نے اپنی بات منوانے کے لیے مجھے دھمکی تک دے ڈالی۔ میں خاموش ہوگیا۔ مجھے راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ مجھے کرنا کیا ہے۔میں نے سوہنی کی طرف دیکھا، پھر بیڈ پر لیٹ گیا۔میں سوچنا چاہتا تھا۔وہ میرے قریب ہوکر بیٹھ گئی۔اس نے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنا شروع کردیں۔ میں خاموش رہا۔کچھ دیر بعد بولی۔

''سوری میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہوں۔''

میں خاموش رہا۔وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔

☆......☆......☆

جگتار سنگھ کی کار پورے پروٹوکول کے ساتھ چنڈی گڑھ سے نکل رہی تھی۔جسپال سنگھ اور رونیت کور اسی کار میں تھے۔ آگے اور پیچھے پولیس سیکورٹی تھی ۔رونیت کور نے اپنے آپ کو کافی حد تک بدل لیا ہوا تھا۔اس نے بہترین تراش کا سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس سے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ ان کے ساتھ ہی کی کوئی اسمبلی رکن ہو۔وہ موہالی انڈسٹریل ایریا سے کھرار جا رہے تھے۔تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک قصبہ نما جگہ تھی۔ آبادی سے پہلے ہی سڑک سے اتر کر وہ ایک حویلی میں چلے گئے۔ جہاں کچھ دیر بیٹھ کر جگتار سنگھ تو واپس چلا گیا، جبکہ

انہیں وہاں سے جدید ماڈل کی ایک کار مل گئی۔ کھرار سے جالندھر کا راستہ تقریباً تین گھنٹے کا تھا، سہ پہر ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں پہنچ گئے۔

فارم ہاؤس دیکھنے میں یوں لگ رہا تھا، جیسے وہاں پر کوئی ہو ہی نہیں۔ چند ملازم وہاں تھے۔ وہاں پر موجود مینجر کو پتہ تھا کہ وہ آرہے ہیں۔ وہ ان کے انتظار ہی میں تھا۔ پورچ میں وہ کار کھڑی کر کے اندر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ تبھی جسپال سنگھ نے مینجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے یہاں رہنا نہیں ہے، ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔ یہ کار واپس جائے گی، لیکن انہیں یہ نہیں بتانا کہ یہ جالندھر سے واپس آئی ہے، کسی بھی شہر کا نام لے دینا، دوسرا ایک مضبوط کار ہمیں چاہئے ہوگی، جو اپنی نہ ہو، اس کا بندوبست کرو۔ شمس اور قمر کو تیار کر کے لے آؤ، کہنا ابھی جانا ہے اور سورج ڈھلنے سے پہلے پہنچنا ہے۔''

''مجھے صرف دس منٹ دیں، میں سب کر دیتا ہوں، ایک کار ہے ہمارے پاس ایسی، جو کچھ دن پہلی ہی ہمارے پاس آئی تھی۔'' مینجر نے کہا اور الٹے قدموں واپس چلا گیا تو رونیت کور نے پوچھا۔

''جسپال، یار انہوں نے سرحد پار کرنی ہے، کچھ بندوبست بھی ہے یا یونہی چل رہے ہو؟''

''سب ہو گیا ہے، اب بس انہیں یہاں سے خیریت کے ساتھ نکالنا ہے۔'' اس نے جواب دیا تو رونیت کاندھے اُچکا کر رہ گئی۔

دس منٹ کے بعد دو لمبے قد کے کسرتی جسم والے نوجوان ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ان دونوں کے نین نقش کافی حد تک ملتے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ ان کا تعارف کمپیوٹر کے ذریعے ہو چکا تھا

''ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہئے، جہاں ہم نے جانا ہے وہاں تک کا راستہ بھی ڈھائی گھنٹے کا ہے۔''

''ٹھیک ہے نکلیں۔'' شمس الدین نے کہا تو وہ چاروں باہر پورچ تک آئے جہاں ایک نئی کار کھڑی تھی۔ جسپال ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو باقی تینوں بھی بیٹھ گئے اور کار چل دی۔ ان کا سفر جالندھر کے جنوب مشرق کی طرف تھا۔ راستے میں انہوں نے سیٹوں کے نیچے پڑا ہوا اسلحہ دیکھ لیا تھا۔ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ جسے بہر حال نبھانا تھا۔

سوا دو گھنٹے کے لگ بھگ وہ ایک بڑے سارے گاؤں ڈھال میں جا پہنچے۔ ابھی سورج ڈھلا نہیں تھا۔ لیکن مغرب کے قریب تھا۔ کافی سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ آبادی پار کرنے کے بعد انہیں وہاں سکھی رام حوالدار سے ملنا تھا۔ جسپال اور اس کے درمیان فون پر بات ہو چکی تھی اور وہ اب تک دونوں ہی لائین پر تھے۔ تقریباً ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں ایک شخص کیس اوڑھے دکھائی دیا، جس نے لاٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چوکیدار ہو اور اپنے علاقے کی طرف جا رہا ہو۔ وہ سکھی رام حوالدار ہی تھا۔ اس نے پہلے ارد گرد غیر محسوس انداز میں دیکھا، اپنی لاٹھی اندر کی، پھر خود شمس اور قمر کے ساتھ آ بیٹھا۔ اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

''کتنے لوگوں نے جانا ہے؟''

''تین نے۔'' ایک دم سے رونیت کور بولی جسپال نے حیرت سے رونیت کور کی طرف دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا سکھی رام حوالدار بولا۔

''نو لاکھ لگیں گے؟''

''ابھی دوں یا واپسی پر؟'' جسپال نے پوچھا۔

''ابھی، ابھی دو گے تو میں اس طرف لے کر جاؤں گا نا، یہ رقم زیادہ نہیں ہے، دوسروں کو بھی دینا

ہے۔ اور ہاں ایک بات سن لو، یہاں سے گیٹ پار کرنے کے ایک قدم بعد کچھ بھی ہو جائے، ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" جسپال نے کہا تو ڈیش بورڈ میں رکھی ہوئی رقم نکال کر اس میں سے نوگڈیاں سکھی رام حوالدار کو تھما دیں۔ اس نے ایک نگاہ انہیں دیکھا اور انہیں اندر کسی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے فون پر رابطہ کرنا شروع کر دیا۔

اس وقت وہ باڑ سے چوتھائی کلومیٹر کے فاصلے پر درختوں میں کھڑے تھے۔ باڑ پر لگی ہوئی روشنیاں ابھی روشن نہیں ہوئی تھیں۔ سامنے چوکی پر چند لوگ تھے، جو ایک جیپ نما گاڑی پر بیٹھ رہے تھے۔ تبھی سکھی رام حوالدار نے کہا۔

"اس وقت چوکی پر صرف ایک آدمی ہے۔ نئے لوگوں کو آنے میں دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔ وہ جان بوجھ کر لیٹ آئیں گے۔ یہ تینوں یہاں سے فوراً جائیں۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور تم؟" جسپال نے پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ واپس جاؤں گا، ڈھال تک۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے؟" جسپال نے کہا تو رونیت کور نے حسرت بھری نگاہ سے جسپال کو دیکھا، پھر اس کے گلے لگ کر رو دی۔ اُن دونوں بھائیوں نے قدم بڑھا دیئے تو جسپال نے اسے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"فون ہے نا تمہارے پاس؟"

"ہاں ہے۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان کے ساتھ چل پڑی۔

سکھی رام حوالدار بتانے لگا کہ باڑ کے پار کام کرنے والے لوگ آدھا گھنٹہ پہلے یہاں سے چلے گئے ہیں۔ گیٹ کی چابی اسی بندے کے پاس ہے۔ وہ نئے آنے والوں کو دے کر چلا جائے گا۔ جبکہ جسپال اس کی بات کم سن رہا تھا اور ان تینوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ سکھی رام حوالدار سے پوری طرح چوکنا تھا۔

وہ تینوں تیزی سے بڑھتے ہوئے چوکی کے پاس چلے گئے۔ وہ انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک باوردی شخص نکلا، اس نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خود وہیں کھڑا رہا، وہ تینوں آگے بڑھے، اور جیسے ہی گیٹ کے پاس پہنچے، چوکی ہی کی عمارت میں سے چند لوگ نکلے اور انہوں نے ان تینوں کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی لمحے جسپال سنگھ کا دماغ گھوم گیا۔

"سکھی رام! یہ کیا؟"

"پتہ نہیں، پھنس گئے وہ لوگ؟" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا تو جسپال نے پسٹل کی نال اس کے سر پر رکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"وہ ہی نہیں تم بھی، چل، انہیں چھڑاؤ، ورنہ تو بھی مارا جائے گا۔"

"مم...... میں نہیں جا سکتا، وہاں دھوکا......" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ جسپال نے پوری قوت سے اس کی گردن پر کھڑا ہاتھ مارا، وہ سیدھا زمین بوس ہو گیا۔ جسپال نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور چلنے کو کہا، وہ سمجھ گیا کہ یہاں تو موت ہے، ممکن ہے آگے بچت ہو جائے۔ وہ اس کے آگے لگ کر چلنے لگا۔ جیسے ہی اس کے قدم نرم پڑتے، وہ اس کی پسلی میں زور سے گھونسہ مار دیتا۔ اس نے پسٹل واپس رکھ لیا۔ چند منٹوں میں وہ چوکی کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں دو سکھ اور دو ہندو فوجی موجود تھے۔ پانچواں وہ تھا، جو بر۔جی سے اتر کر ان کے پاس آ گیا تھا۔ انہیں یوں آتا دیکھ کر ان میں سے سینئر نے آگے بڑھ کر کہا۔

"اب او سکھی رام! کتنی رقم لی ہے ان سے؟"

"نولاکھ۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"بات تو دو بندوں کی ہوئی تھی، یہ تیسری کون ہے، چھمک چھلو۔" اس نے رونیت کور کی طرف دیکھ کر ہوس بھرے لہجے میں کہا۔

"صاحب جانے دیں انہیں، رقم میرے پاس ہے، دوسرے آتے ہوں گے۔" سکھی رام نے محتاط لہجے میں کہا۔

"یہ سکھی رام، ہمیشہ دوسروں کو پیسے دیتا ہے اور ہمارے ساتھ بات ہی نہیں کرتا، جتنی رقم میرے حصے میں آنی ہے، اتنی تو سرکار بھی دے دے گی۔ ترقی الگ، سیدھے ہو جاؤ، فائر ماروں گا۔" اس نے سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے کہا تو رونیت کور نے میری طرف دیکھا۔ شمس اور قمر بھی پریشان ہو گئے۔ تبھی جسپال سنگھ نے تیزی سے کہا۔

"زیادہ رقم چاہتے ہو تو میں ابھی دے دیتا ہوں، انہیں جانے دو۔"

"یہ دونوں چلے جائیں، یہ لڑکی رات ادھر رہے، صبح اسے جانے دیں گے، کہو سودا منظور ہے؟" اسی سینئر نے کہا تو جسپال کا دماغ کھول اٹھا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور بڑے سکون سے کہا۔

"دیکھ، رقم میری کار میں پڑی ہے، تین چار لاکھ تو ہوں گے، اپنے کسی بندے کو ابھی بھیج دے، وہ لے آتے ہیں، انہیں پار جانے دو، اگر نہیں قبول تو یہ رقم بھی رکھو اور ہمیں واپس جانے دو، کہو کیا کہتے ہو۔" جسپال نے پھر کہا۔

"یہ رقم والی بات ٹھیک لگتی ہے، چل ٹھیک ہے، لے آتا ہے۔" اس نے اپنے ایک بندے کو اشارہ کیا تو ساتھ میں ایک دوسرا بندہ بھی چل پڑا۔ جسپال نے کار کی چابی اسے تھما دی۔ وہ دونوں چابی لے کر تیزی سے کار کی جانب جانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا، جب سکھی رام نے سامنے کھڑے سینئر کو مخصوص اشارہ کیا۔ جسپال سمجھ گیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے، انہوں نے رقم بھی لے لینی ہے اور سب کو مار بھی دیں گے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ وہ الرٹ ہو گیا۔ جیسے ہی چابی ان کے ہاتھ میں آئی، انہوں نے گنیں تان لیں۔

"بات یہ ہے بھائی، ہم یہاں اتنی دور بیٹھے ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں اردگرد کی کوئی خبر نہیں، یہاں سے وہی جاتا ہے، جو سیدھے راستے سے نہیں جا سکتا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ جاؤ۔ چلو۔" سینئر نے حقارت سے کہا۔

"میں کہتا ہوں ہمیں جانے دو۔" جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر غضب ناک لہجے میں بولا۔

"جو کہا ہے وہ کرو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے زمین پر فائر کر دیا، جسپال نے بے بسی سے رونیت کور کی جانب دیکھا، دونوں کی نگاہیں ملی، جس میں انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ جسپال نے آگے بڑھ کر منت کرنے والے انداز میں کہا۔

"یار ایک بار پھر سوچ لو، ہم پار نہیں جاتے، یہیں سے واپس لوٹ جاتے ہیں، رقم بھی رکھ لو۔"

"چار دہشت گرد مریں گے تو ہم کو ترقی ملے گی نا، لاشیں کون سا بولتی ہیں۔" سینئر نے حقارت سے قہقہہ لگایا، مگر اس کا قہقہہ اس کے لبوں ہی میں رہ گیا۔ انتہائی سرعت سے اس نے پسٹل نکالا اور فائر کر دیا جو اس کے کاندھے پر لگا۔ یہی کچھ رونیت کور نے کیا، ایک لمحے میں دو ڈھیر ہو گئے۔ اسی لمحے قمر اور شمس آگے بڑھے اور دو کو لے کر زمین بوس ہو گئے۔ جسپال نے فائر کرنے کے بعد جگہ چھوڑ دی تھی، جہاں پر فائر آ لگا۔ تب تک رونیت کور اس پر فائر کر چکی تھی۔ سکھی

رام حیرت سے کھڑا، چشم زدن میں ہونے والا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ جسپال نے اسے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اس نے جا کر اس کی گردن ناپ لی۔

فائرنگ سے اس وقت تک مرا کوئی نہیں تھا، سینئر شدید زخمی تھا۔ دوسرے کے ہاتھ پر فائر لگا تھا۔ جسپال سینئر کے پاس جا کر بولا۔

"مرنا ہے یا گیٹ کھولتے ہو؟"

"گگ...... گیٹ۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"چلو پھر،" اس نے اشارہ کیا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ پار جاؤ گے، چل سکھی رام۔"

دونوں نے انہیں پسٹل پوائنٹ پر رکھ لیا۔ زخمی وہیں پڑا تڑپ رہا تھا۔ جسپال کے ذہن میں تھا کہ باڑ کی ان تاروں میں کرنٹ ہوتا ہے۔ اگر اس وقت ہوا تو سینئر ہاتھ لگانے والا نہیں تھا۔ اگلے منٹ میں وہ باڑ کے پار تھے۔ جس کے آگے کافی دور تک بھارت ہی کا علاقہ تھا۔ وہ سکھی رام اور سینئر کو لے کر جا رہے تھے۔ انہیں یہ ڈر بھی تھا کہ عقب سے فائر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ سینئر چیخ اٹھا

"آگے نہیں جا سکتے ہم، شوٹ ہو جائیں گے۔"

"تو جاؤ، پھر پلٹ جاؤ۔" جسپال نے کہا تو وہ دونوں پلٹے اور تیزی سے جانے لگے۔ تبھی اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"جتنی جلدی ہو آگے بڑھ کر چھپ جاؤ، کہیں سے بھی فائر ہو سکتا ہے۔"

سامنے پاکستان کی سرزمین تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی جسپال کو سرحد پار کرنا پڑی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر جا کر ایک ٹیکری کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ بھارتی چوکی سے چند فائر ہوئے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ رونیت نے اپنی صورت حال کے بارے میں بانیتا کور کو بتا دیا۔ وہ ساری باتیں سن چکی تو اس نے دوبارہ فون کرنے کا کہا۔ کچھ دیر بعد اس کا فون آ گیا۔

"وہ لوگ رشوت خور تھے، اور لالچ میں آ گئے تھے، اچھا ہوا کہ تم لوگ نکل گئے، ورنہ ان کا ارادہ مارنے ہی کا تھا، یہ چوکی بدنام ہو چکی ہے۔ غلطی کی جو یہاں کے لوگوں کے ساتھ بات کی۔ اب تو وہ بھگتیں گے۔" اس نے غصے میں کہا تو جسپال بولا۔

"وہ جو بھی ہوگا، بعد کی بات ہے، ابھی کیا کرنا ہے، یہاں تو رینجرز دیکھتے ہی گولی مار دے گی۔"

"تم لوگ اس وقت تک چھپے رہو جب تک میں نہ کہوں، میں رابطہ کر رہی ہوں۔ ذرا سا انتظار، دوسری طرف خبر ہے دو بندوں کی، چار کی نہیں تھی، اس لیے شک پڑ سکتا ہے، پھر......" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہاں سے کافی دور گاڑیوں کی لائیٹس دکھائی دیتیں اور پھر غائب ہو جاتیں تھیں، وہ چاروں دبکے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ تب کہیں جا کر بانیتا کور کا انہیں فون ملا۔ اس نے بتایا

"میری جمال سے بات ہو گئی ہے، تم لوگوں کو یہاں سے پیدل نکلنا ہوگا۔ سمت میں تمہیں بتا دیتی ہوں، یہیں قریب ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں پہنچ جانا۔ وہاں سے کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ اس سے آگے جگہ ہے جاہمن، وہیں گرودواہ روڑی صاحب ہے، وہاں پہنچنا ہے۔ اس کے گیانی سے ملنا۔ وہاں سے آگے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر کوئی رستے میں مل جائے تو اسے یہی بتانا ہے کہ گرودوارہ روڑی صاحب جا رہے ہیں، آسانی ہو جائے گی۔ یہ علاقہ محفوظ ہوگا تم لوگوں کے لیے۔"

وہ پیدل ہی چل پڑے تھے۔ تقریباً دو کلومیٹر آ

جانے کے بعد انہیں ایک گاؤں دکھائی دیا۔ وہ اس کے قریب جا پہنچے۔ گاؤں کے باہر ہی ایک گھاس پھونس اور مٹی سے بنی ایک کٹیا تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ایک کتا زور سے بھونکا۔ وہ ٹھٹک گئے۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے نرم سے لہجے میں پوچھا۔

"مسافر ہیں، آگے جانا ہے، ہم سے کسی نے گاڑی چھین لی ہے۔" جسپال تیزی سے بولا۔

"کہاں جانا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جالندھر۔" جسپال ہی نے جواب دیا

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی گاڑی، یا......"

"کوئی کار تو یہاں نہیں ہے، ٹریکٹر ٹرالی ہے، وہ مٹی لینے جاتے ہیں اس طرف، کہو تو ان سے کہہ دیتا ہوں، وہ لے جائیں گے۔" اس نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" جسپال نے فوری ہاں کر دی۔

"تو پھر بیٹھ جاؤ، پانی پیو، وہ ادھر سے گذریں گے تو، میں کہہ دوں گا۔" اس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور کٹیا میں چلا گیا۔

کافی دیر بعد ایک ٹریکٹر ٹرالی نکلی، اس ادھیڑ عمر شخص نے اسے کہا تو وہ انہیں لے کر چل دیئے۔ رات گئے وہ گردوارہ روڑی صاحب پہنچ گئے، گیانی نے ان کے لیے پہلے ہی سے کار کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ اس میں بیٹھے اور چل دیئے۔ اس وقت پو پھوٹ رہی تھی جب وہ لاہور میں داخل ہو گئے۔ انہیں بتائے گئے ماڈل ٹاؤن کے محفوظ گھر تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ جاتے ہی سو گئے۔

☆......☆......☆

اس وقت دن رُوشن ہو رہا تھا، جب میں لاہور میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ جنید تھا، جو کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے نور نگر سے نکلنے میں صرف یہی مشکل تھی کہ اماں مجھے نہ روک دے۔ یہ نوبت ہی نہیں آئی تھی اور میں نے سوہنی کو سمجھا لیا تھا کہ میرا جانا کتنا ضروری ہے۔ جب اسے پتہ چلا کہ جسپال کے ساتھ رونیت کور بھی پاکستان میں آ چکی ہے تو اس نے پھر تردد نہیں کیا۔ میں جنید کے ساتھ لے کر نکل آیا تھا۔

مجھے ماڈل ٹاؤن تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں جب وہاں پہنچا تو چاروں سو چکے تھے۔ ملازمین میرے انتظار میں تھے۔ میں سو نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں گیا، فریش ہونے تک چائے آ گئی۔ تبھی میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہی سرمد سے رابطہ کیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ میں نے اپنے پہنچ جانے کی اطلاع دی تو وہ بولا۔

"گیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ یہ جو آپ نے تینوں نام بتائے ہیں، یہ مہرے ہی ہیں، ان کے پیچھے کوئی دوسرا ہی ہے۔"

"ملک حیات، سردار صاحب اور چوہدری رفاقت، یہ تینوں ایک ہی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، تینوں مختلف پارٹیوں سے ہیں، لیکن ان کا ایک ہی جگہ متفق ہو جانا، کچھ اور ہی بتاتا ہے، تم ایسا کرو، ملک حیات کو ٹٹولنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

"وہ میں کر چکا ہوں۔ وہ کچھ نہیں بتا رہا، میرا خیال بھی یہی ہے کہ اسے زیادہ نہیں پتہ۔ اسے بس یہی ٹاسک دیا گیا کہ فلاں کو قتل کر دو۔ میں نے ابھی اس پر تشدد نہیں کیا، آپ کا انتظار تھا۔" سرمد نے بتایا

"ٹھیک ہے پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا اور فون بند کر کے چائے پینے لگا۔

میرے ذہن میں کئی خیال آ رہے تھے۔ لیکن دو

خیال ایسے تھے، جن پر میں سوچنا چاہتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہی اجنبی، جو سیالکوٹ کے شمال میں کہیں ہے، یہ ساری اس کی چال ہو، اس نے مجھے اگر قتل کرنا ہوتا تو اس طرح مجھے الجھن میں نہ ڈالتا، اب تک مجھ پر حملہ ہو چکا ہوتا۔ اب تک تو اس کا یہی ارادہ لگ رہا تھا کہ وہ مجھے گھیر کر مجھے الجھنا چاہتا ہے، اس کا اصل مقصد کیا ہے، یہ اسی کو پتہ ہو سکتا تھا۔ دوسرا یہ ممکن تھا کہ گیم کچھ دوسری ہی ہو جس کا مجھے ابھی تک گمان بھی نہ ہو۔

میں مانتا ہوں کہ مجھے اپنی صلاحیتوں کا ادراک نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے یہ پتہ تھا کہ میں اندر سے کیا ہوں ۔ لیکن انتہائی مشکل وقت میں میری کہیں نہ کہیں سے مدد ہو جاتی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اگر ہے بھی تو وہ میری ریاضت یا محنت کا نتیجہ نہیں، کسی کی بھی عنایت ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات مجھے خود حیرت ہوتی تھی کہ یہ سب ہو کیسے گیا؟ لیکن میں ایک بات جانتا ہوں، جو ادراک انسانی سوچ میں آ سکتا ہے، وہ حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے، اس پر انسانی تاریخ گواہ ہے۔ محیر العقول واقعات سے انسانی تاریخ بھری پڑی ہے، دراصل، آج کا دور مادی ہے اور انسان نے مادی ترقی کیسے اور اس کی عقل میں بھی وہی شے سما سکتی ہے، جس کی کوئی نہ کوئی مادی بنیاد ہو۔ لیکن ماضی میں دور مادی نہیں تھا۔ ایک وقت تھا کہ یہ سوچ دی گئی کہ شیشے میں دنیا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آج حقیقت ہے۔ اب اصل معاملہ کیا ہے، جو کچھ بھی ظاہر ہو رہا ہے، وہ انسانی صورت میں سے ہی ہو رہا ہے۔

میں نے یہی سوچتے ہوئے چائے ختم کی اور اٹھ گیا۔ میں سرمد کی طرف جانا چاہتا تھا۔ میں اٹھا ہی تھا کہ طارق نذیر کا فون آ گیا۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”سر جی آپ کے ساتھ حکومتی پارٹی کے ایک وزیر ملنا چاہتے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اصل میں یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ ظہور مرزا سے لے کر ملک حیات، سردار صاحب اور چوہدری رفاقت ان کی کارکردگی ان کے سامنے آ گئی ہے۔ انہیں چوہدری رفاقت نہیں مل سکا، میں نے بھی رپورٹ کر دی ہے، معاملہ اوپر تک چلا گیا ہے۔ میرے خیال میں معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے کوئی بات چیت ہو سکتی ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے کہا۔

”لیکن میں ابھی ان سے ملنا نہیں چاہتا۔“

”سر جی وہ کیوں؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”ابھی وقت نہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ اس نے دوسری طرح سے پوچھنے کی کوشش کی تو میں نے پوچھا۔

”کیا انہوں نے یہ بتایا کہ وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟“

”یہ تو نہیں بتایا۔“ وہ دھیمے سے بولا۔

”تو پھر پتہ کرو۔ جب پتہ چل جائے تو مجھے بتانا، پھر بات بھی کر لیں گے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اب طارق نذیر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میں ساری سوچیں جھٹکیں اور اروند سنگھ کو فون کیا۔ اس سے اجنبی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

”وہ لاہور چھوڑ چکا ہے۔ اب وہ وہیں پر ہے جہاں وہ پہلے تھا۔ میرا مطلب سیالکوٹ کے شمالی علاقے میں۔“

”ٹھیک ہے رابطے میں رہنا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے اس سارے معاملے کے پیچھے وہی لگ رہا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ جسپال اور

رونیت ابھی جاگنے والے نہیں ہیں۔ میں انہیں بتائے بنا ہی نکلنا چاہتا تھا، مگر ان سے ملے بغیر جانے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اسی کشمکش میں بیٹھا تھا کہ طارق نذیر کا پھر سے فون آ گیا۔ اس کا وہی پیغام تھا۔ میں نے پھر وہی جواب دے کر فون بند کر دیا۔ مجھے اب طارق نذیر پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں سرمد کی طرف جانے کے لیے اٹھ گیا۔

وہ اس وقت مغل پورہ سے کافی آگے ایک نئے ٹاؤن میں نو تعمیر شدہ بنگلے میں تھا۔ وہیں اس نے ملک حیات کو وہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ میرے انتظار ہی میں تھا۔ ہم بہت عرصے بعد ملے تھے۔ وہ کافی صحت مند ہو گیا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط لگ رہا تھا۔ وہ انتہائی خوشی سے مجھے ملا۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ ملک حیات؟''

''تہہ خانے میں رکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کچھ بتایا، کوئی اہم بات؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے تو کچھ نہیں بتایا، آپ دیکھ لیں اسے۔'' وہ بولا تو میں اٹھ گیا۔ ایک کمرے میں سے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتی تھیں۔

ملک حیات دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک لوہے کی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور کافی حد تک نڈھال لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھالیں اور یوں دیکھنے لگا جیسے اسے بہت زیادہ غصے میں ہو۔ میں اسکے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بڑے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ابھی تک کوئی حکومتی بندہ تجھے چھڑانے نہیں آیا، بڑے دعوے کر رہے تھے تم؟''

''تم کون ہو؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''وہی جو تیرے سارے کالے دھندوں سے واقف ہے، بول، میرے سوال کا جواب دے۔'' میں نے اس کی ٹھوڑی کو انگلیوں کی پور سے اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ نہ بولا تو سرمد نے کہا۔

''یہ سمجھتا ہے کچھ نہیں بولے گا لیکن اب بولے گا، کیونکہ میں نے ابھی تک اسے کچھ نہیں کہا۔''

''یہ چیخ چیخ کر بولے گا۔'' میں نے کہا اور ایک زوردار گھونسہ اس کے سینے پر مارا، وہ کھانستا ہوا دہرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی سانس بند ہونے لگی ہے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''بول، جمال کو مارنے کے لیے کس نے کہا تھا؟''

''ب..... بتا...... بتاتا ہوں۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''بولو۔'' میں نے پوچھا تو وہ کچھ دیر تک سانس بحال کر کے بولا۔

''میرا کچھ باہر کے لوگوں کے ساتھ رابطہ ہے، انہوں نے آفر کی تھی۔''

''جانتے ہو وہ کون ہے؟''

''بس فون پر رابطہ ہے، ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، ہم کون سا ان سے ملتے ہیں۔''

''بات کرا سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''میرا فون دو، میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے سرمد کی طرف دیکھ کر کہا تو سرمد نے اپنی جیب سے اس کا جدید فون نکالا اور اسے دے دیا۔ اس نے جلدی سے فون پکڑا، نمبر تلاش کیا اور پش کر دیا۔ میں نے فون اس سے لے کر اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر بعد نمبر ملا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا کارروائی ہے۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے کسی نے ہیلو کہا تو ملک حیات بولا۔

”میں تمہاری وجہ سے پھنس گیا ہوں اور مجھ......“

”تو پھر میں کیا کروں؟ تم پھنسو یا نکلو، تم نے رقم لی ہے کام کی، یا تو کام کرو ورنہ میری رقم مجھے واپس دے دو۔“ صاف اردو میں پوچھا گیا تو اس نے حیرت سے کہا۔

”یہ کیا بات کر رہے ہو تم؟“

”وہی جو تمہیں سمجھ جانا چاہئے۔ میری رقم واپس نہ کی تو میں واپس لینا جانتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم کام نہیں کر سکتے ہو، وہ جمال تم تک پہنچ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے پاس بیٹھا، یہ بات سن رہا ہو۔ اب مجھے فون کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

ملک حیات کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ میں گیم سمجھ رہا تھا اس لیے میں نے سرمد سے کہا۔

”اسے واپس بھیج دو۔ اب اسے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور واپس چل دیا، تبھی ملک حیات کے منہ سے نکلا

”تو......تم جمال ہو؟“

میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور سیڑھیاں چڑھ کر لاؤنج میں آ گیا۔ میں کچھ دیر سرمد کے ساتھ رہا اور اسے تیار رہنے کا کہہ کر ماڈل ٹاؤن چل دیا۔

میرے وہاں پہنچنے تک دوپہر ہو گئی تھی۔ لاؤنج میں جسپال کے ساتھ شمس اور قمر دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان سے ملا اور کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں رونیت بھی آ گئی۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں میرے گلے لگ گئی

”ویرے، میں نے تمہیں بہت مس کیا۔“

”سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا، خیر اچھا ہوا، تم آ گئی ہو، اب ان دونوں بھائیوں کو لے کر نکلو نور نگر، ہمیں کچھ کام ہے، وہ کر کے آتے ہیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جسپال نے نہیں پوچھا کہ کدھر جانا ہے۔ وہ خاموش رہا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں، جسپال اور جنید چل پڑے۔ جس وقت ہم نے فور وہیل میں دریائے راوی کا پل پار کیا تو جسپال نے پوچھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”سیالکوٹ۔“ میں نے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔

☆......☆......☆

ہم سیالکوٹ شہر سے نکل کر دریائے چناب پر موجود ہیڈ مرالہ تک جا پہنچے تو شام اتر رہی تھی۔ ہم وہاں رک گئے۔ پانی میں خاصی طغیانی تھی۔ پانی کا رنگ اتنا مٹیالا نہیں تھا لیکن ڈھلتے ہوئے سورج میں پانی پر سنہرا پن اُتر آیا تھا۔ دریا کنارے بیٹھنے کے لیے بینچ رکھے ہوئے تھے۔ میں فور وہیل سے اُترا اور دریا کنارے جا کھڑا ہوا۔ میرے سامنے ایک دلکش منظر تھا۔ میں کچھ دیر محویت سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ میرے پاس جنید اور جسپال بھی آ کھڑے ہوئے۔

”یہاں کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟“ جسپال نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا تو میں نے کہا۔

”ابھی یہاں ایک نوجوان آنے والا ہے، ہمیں اس کا انتظار ہے۔“

”اس کے بعد کیا کرنا ہے، کوئی......“ جسپال نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”سکون سے بیٹھیں تو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔“ میں یہ لفظ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ فور وہیل سے چند قدم کے فاصلے پر سفید کار میں ایک درمیانے قد کا وجیہہ اور صحت مند نوجوان اُترا۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا تو ہمارے قریب آ گیا۔ وہ سیدھا میری جانب

آیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ جمال صاحب ہیں۔''

''نہیں صرف جمال ہوں وسیم کھوکھر صاحب۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ پھر پرجوش لہجے میں بولا۔

''تو چلیں پھر میرے گاؤں۔''

''چلو۔'' میں نے کہا اور فوروہیل کی جانب بڑھا۔

کچھ دیر بعد ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈھلے وال تک جا پہنچے۔ وہیں گاؤں سے ہٹ کر اس کا ڈیرہ تھا۔ جہاں معمول سے ہٹ کر انتظام تھا۔ بڑے سارے صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی مہمان داری شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ ذرا تھما تو میں نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار، ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں، کیوں نا اس پر بات کرلیں۔''

''جی بسم اللہ، ضرور کریں بات۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں موجود ملازمین کو ہٹا دیا۔ ہم چاروں ہی تھے۔ میں نے اس سمیت سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اس علاقے میں ایک شخص ہے، جسے مجھے پکڑنا ہے۔ وہ انتہائی چالاک، ذہین اور زیرک ہے۔ اس نے مجھے گھما کر رکھ دیا ہے، لیکن کیوں وہ ایسا کر رہا ہے، اس کی مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔ اب تک ملکی سطح کے تین سیاست دانوں کو اس نے سمجھو خرید لیا ہے، ان سے کام لے رہا ہے۔ وہ بھی انتہائی معمولی نوعیت کا کام، جو وہ خود بہت آسانی سے کروا سکتا ہے۔ وہ اسی علاقے میں ہے۔''

''کوئی نشانی، کوئی نام پتہ......'' وسیم کھوکھر نے پوچھا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نام پتہ ہوتا تو میں اب تک جا کر اسے گردن سے نہ پکڑ لیتا۔''

''تو پھر کیسے تلاش کریں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہ تو بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے، یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن، میں اس تک پہنچ جاؤں گا، تمہاری مدد سے یہ مجھے یقین ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم اپنے علاقے کے بارے میں جانتے ہو، میری ٹامک ٹوئیوں پر بتاتے جانا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ پھر کچھ دیر تک اسی موضوع پر بات ہوتی رہی۔ ہم چاروں پلان کرتے رہے کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔

رات کا کھانا کھا کر ہم فوروہیل پر نکل پڑے۔ اروند سنگھ نے مجھے گائیڈ کیا تھا کہ دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر موجود گاؤں میں وہ شخص موجود ہے۔ میں حیران تھا کہ جس لوکیشن پر اس نے مجھے اس اجنبی کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ جگہ گنگوال گاؤں بنتی تھی۔ وہاں اور اس کے اردگرد مختلف فورسز ہمہ وقت رہتی تھیں۔ ایسے میں کسی کا نیٹ ورک چلانا، گویا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ اس علاقے میں ایسا کون ہو سکتا ہے جو یہ نیٹ ورک چلا رہا تھا۔ وسیم کھوکھر نے ایک بات مزید کہی تھی کہ ایسا کوئی بھی نیٹ ورک ان فورسز کی نگاہوں میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یا تو یہ بہت جدید قسم کا ہوگا، جو رینج میں نہیں آرہا، لیکن ایسا کیا جدید ترین نظام فورسز کے پاس نہیں، جو وہ اسے پکڑ نہ سکیں۔ مجھے بھی یہی الجھن تھی، مگر میں رکا نہیں، میں ایک بار اسے دیکھنا چاہتا تھا جو یہ جدید ترین نیٹ ورک پر کام کر رہا تھا، ممکن ہے ابھی فورسز میں انفرادی طور پر

کوئی اس سطح پر پہنچا ہو، لیکن آفیشلی ایسا نہ ہوا ہو۔ کئی خیال ذہن میں آتے چلے گئے۔

ہم دریا کنارے چلتے چلے جارہے تھے۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جس سے دریا کا پانی چاندی جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ اروند سنگھ مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم وہاں کے مقامی لوگوں سے بھی بچنا چاہتے تھے اور اس اجنبی کو تلاش بھی کرنا تھا۔ اس لیے آبادی سے دور دور چل رہے تھے۔ ہمیں یہ خطرہ بھی تھا کہ یہاں موجود کسی بھی فورس کے ہتھے چڑھے تو بہت سارا وقت ضائع ہوگا۔ دوسرا بہت دور تک جائے گی۔ جبکہ میں ایک اہم وزیر سے ملاقات کرنے سے انکار کر کے آیا تھا۔

ہم چاروں گنگوال کے قریب پہنچ گئے۔ وہیں سے اروند سنگھ نے مجھے بتایا کہ اس کی نشاندہی جنوب کی طرف ہو رہی ہے۔ ہم اس طرف چل پڑے۔ وسیم کو اس علاقے سے پوری طرح واقفیت تھی۔ وہ پوری طرح راہنمائی کر رہا تھا۔ ہم گنگوال سے باہر کی طرف سے آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ گنگوال پار کر گئے۔

''بھاء جی، آگے صدر پور ہے، اس کے درمیان جنگل ہے۔ دیکھیں وہ کہیں یہاں نہ ہو؟'' وسیم نے بتایا۔ لیکن اروند کے مطابق وہ آگے آنے والی آبادی سے بھی آگے تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ سمت کا اندازہ تھا، لیکن وہ بالکل ویرانے میں پڑتا تھا۔ ہم صدر پور کی آبادی بھی پار کر گئے تھے۔

''وہ یہیں کہیں ہوسکتا ہے۔'' میں نے ویرانے میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا، چاہے چاندنی تھی لیکن رات ہونے کی وجہ سے زیادہ دور تک نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

''میری معلومات کے مطابق یہاں آگے غازی پور کی تھوڑی سی آبادی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دو یا چار لوگوں کے کھیتوں میں ڈیرے ہیں۔ کوئی مکان نہیں، کوئی عمارت نہیں۔'' وسیم نے بتایا

''لیکن نشاندہی ادھر کھیتوں ہی میں ہو رہی ہے۔'' میں نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر تو کوئی، تہہ خانہ بنا کر ہی کام کر رہا ہوگا۔'' وسیم کھوکھر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر ایسا کریں، یہ گاڑی یہیں روک دیں۔ ادھر نکلتے ہیں، ممکن ہے کوئی ڈیرے میں اپنا سیٹ اپ جما کر بیٹھا ہو۔'' جسپال ہنستے ہوئے بولا۔

''چلو۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا تو جنید نے گاڑی روک دی۔ ہم اترے اور اسی سمت چل پڑے۔ اروند سنگھ کا اصرار تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے یہیں ہے، یہاں سے اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتا۔ ہم چاروں آگے پیچھے قطار میں چل پڑے۔ میں حیران تھا کہ دور دور تک کوئی ڈیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی گھر تک نہیں تھا۔ ایسے میں کیا وہ کہیں کھیتوں میں بیٹھ کر اپنا نیٹ ورک چلا رہا ہوگا۔ وہاں سامنے دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اروند سنگھ کو کوئی شدید غلط فہمی ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے، ورنہ سامنے کی صورت حال کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ ہم چلتے چلے جا رہے تھے۔ میرا رابطہ اروند سنگھ کے ساتھ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کہتا کہ تمہارا اندازہ غلط ہو گیا ہے، وہ تیزی سے بولا۔

''بالکل قریب ہو آپ، سمجھو، چند گز پر۔''

میں نے اس کی بات تو سن لی لیکن مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ میرے چاروں طرف کھیت تھے۔ ایک کھیت میں بھوسہ جمع کیا ہوا ''کپا'' تھا۔ اس کے اردگرد کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ٹھٹک گیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور

دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔
''اروند! جس طرف میں چلوں، مجھے بتانا میں درست جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں چل پڑا تو وہ تیزی سے بولا۔
''بالکل ٹھیک، آپ بالکل قریب ہیں۔''
مجھے شک پڑ گیا کہ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے تو اسی بھوسے کے ڈھیر میں ہے، وہ جو مذاق کر رہے تھے کہ ممکن ہے کوئی تہہ خانہ ہو، وہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں محتاط انداز میں بھوسے کے اس کُپّے کے پاس پہنچ گیا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کے ارد گرد پھرتا ہوا وہ جگہ تلاش کرنے لگا، جس سے بھوسہ نکالا جا سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے وہ جگہ مل گئی۔ میں نے اسے آہستگی سے کھولا تو ایک دم سے حیرت ہوئی۔ وہاں بیٹھنے کے لیے چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی کی تو ایک کپڑے میں کچھ لپٹا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو حیرت دو چند ہو گئی۔ اس میں ایک لیپ ٹاپ پڑا تھا، جس کے ساتھ ایک سیل فون دھرا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی اسے ہلایا، وہ سیل فون بج پڑا۔ میں نے اسے ویسے ہی چھوڑ دیا۔ میں نے پلٹ کر جسپال کو بلایا اور اسے دکھایا۔
''یہاں کوئی آدمی آ کر بیٹھتا ہے اور وہی نیٹ ورک چلاتا ہے۔'' وہ تیزی سے بولا۔
''تو اب کیا کیا جائے، یہ سیل فون کیوں بجا؟''
میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے سوال کیا تو وہ بولا۔
''سیل فون کا تو مجھے پتہ نہیں کہ کیوں بجا، لیکن یہ ضرور یقین ہے کہ کھوج یہیں سے نکلے گا۔'' لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک دم سے ہم روشنیوں میں نہا گئے۔ روشنیاں سامنے کی طرف تھیں۔ اس میں چاندنی بھی دب گئی، کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تبھی کسی نے کڑک دار آواز میں کہا۔
''خبردار! کوئی بھی ہلنے کی ہمت نہ کرے، ورنہ گولی مار دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ رُکا پھر بولا۔
''اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو۔''
ہم چاروں نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ تبھی روشنیوں کے پار اندھیرے میں سے چند لوگ سامنے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں پسٹل تھے۔ ایک بندے نے آگے بڑھ کر مجھے باندھنا چاہا تو میں نے اس سے کہا۔
''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو۔''
میرے سوال کے جواب میں ایک فائر میرے قدموں کے پاس آ لگا۔ تبھی سامنے کھڑے بندے نے میرے ہاتھ سے سیل فون لے لیا۔ اس نے اروند کی کال بند کی تو سیل فون بج اٹھا اس نے کال ریسیو کی اور فون مجھے واپس دے دیا۔
''آخر وہیں پر آن پہنچے ہو، جہاں میں تمہیں لے کر آنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں تمہاری اوقات بتانا چاہتا ہوں کہ تم کتنے ذہین اور کتنے طاقتور ہو۔ ایک چیونٹی کی مانند ہو تم میرے سامنے۔ اب فضول بکواس مت کرنا کہ سامنے آؤ، اور جذباتی باتیں۔ چاہو تو ابھی ایک گولی تمہارے بھیجے میں اتار دوں۔ صرف ایک گولی تمہاری قیمت ہے۔'' اجنبی نے نہایت نفرت سے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔
''کیا چاہتے ہو؟''
''میں تو بہت کچھ چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آرام سے میری بات سننے کے قابل رہ سکو تو جو یہ لوگ کرتے ہیں انہیں کرنے دو، ان کے ساتھ چلو۔ ورنہ اسی جگہ تمہاری موت ہو گی۔'' اجنبی نے انتہائی غرور اور تکبر سے کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے تم چاہو۔'' میں نے کسی بھی جذبے کے بغیر کہا تو وہ ایک دم سے بولا۔

''یہ ہوئی نا بات۔ چلو ان کے ساتھ۔''

میں نے اپنے سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا اور سر سے ہاتھ نیچے کرتے ہوئے، بڑے نرم لہجے میں اسے کہا۔

''چھوڑو، یہ رسی، چلو کہاں جانا ہے۔''

''باندھنے کے بغیر تو ہم نہیں لے کر جائیں گے۔'' سامنے کھڑے شخص نے کہا تو میں بولا۔

''چلو باندھ لو، اگر باندھ سکتے ہو تو۔''

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے۔ جسپال اور جنید میرے ہی انتظار میں تھے۔ وہ بجلی کی طرح لپکے اور اپنی جگہ چھوڑ گئے۔ جس وقت وہ اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے، اسی دوران انہوں نے اپنے پسٹل نکال لیے تھے۔ وہ ملگجی چاندنی میں دکھائی دے رہے تھے، لیکن زمین پر پڑتے ہی انہوں نے فائر کر دیئے، اس کے ساتھ ہی دو چیخیں بلند ہوئیں۔ تن تک میں سامنے والی کی گردن توڑ چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی ڈھال بنایا اور اپنا پسٹل نکال کر سامنے فائر کرنے لگا۔ اس طرف کی کئی روشنیاں گر چکی تھیں، میں نے دیکھا، دو لوگ بھاگ رہے تھے، میں تاک کر ان کے پاؤں میں نشانہ لگایا۔ وہ گر گئے۔ یہ سب ایک منٹ کے اندر اندر ہو گیا۔ شاید انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ سامنے سے اس شدت کے ساتھ بھی فائرنگ ہو سکتی ہے۔ جس نے بھی ان لوگوں کو بھیجا تھا، وہ کوئی تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے۔

میں ایک ٹارچ اٹھائی اور وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب زخمی حالت میں پڑے تھے۔ ایک شخص اپنی ٹانگ پر ہاتھ رکھے بلبلا رہا تھا، وہاں سے خون نکل رہا تھا، میں نے اس کے سر پر جا کر پسٹل کی نال رکھ دی۔

''کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟''

''سعید مار کر نے۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کون ہے، ہو؟''

''گنگوال میں رہتا ہے۔'' اس نے بتایا

''بات ہو سکتی ہے اس سے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتی ہے؟'' وہ بولا اور اپنی جیب سے فون نکالنے لگا، تبھی وسیم کھوکھر نے کہا۔

''میں جانتا ہوں اسے، زمانے کا ڈکیت اور غنڈہ ہے، میں جانتا ہوں اسے۔''

''مجھے وہ چاہئے۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''آئیں پھر۔'' اس نے کہا اور تیزی سے فور ڈھیل کی جانب چل پڑا۔ اس دوران جنید نے وہ لیپ ٹاپ اور فون اٹھا لیا تھا۔ ہم جیسے ہی وہاں سے چلے وسیم کھوکھر نے کسی کو فون کر دیا کہ سعید مار کر چاہئے۔

گنگوال پہنچنے تک ہمیں آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت لگا۔ وہ گاؤں دریائے چناب کے بالکل اوپر ہے۔ پرانی طرز کے گھر تھے۔ بالکل دریا کنارے ایک پرانی حویلی کے سامنے وسیم کھوکھر ہمیں لے گیا۔ اس حویلی کے سامنے چند لوگ کھڑے تھے۔ ہمارے اترتے ہی او وہ ہمارے پاس آ گئے۔

''کہاں ہے سعید مار کر؟'' وسیم کھوکھر نے پوچھا۔

''اندر ہے۔'' ایک بندے نے جواب دیا

''پکا پتہ ہے؟'' اس نے تصدیق چاہی

''وہ اپنے گھر سے ادھر ہی آیا ہے ابھی ابھی۔ میرے سامنے اندر گیا ہے، میں نے بندے بلوائے ہیں اسے اٹھانے کے لیے، بس وہ آتے ہی ہوں گے۔'' اس نے بتایا

''ٹھیک ہے، یہاں انتظار کرو۔'' اس نے کہا اور میری جانب دیکھا۔ جنید اندر جا چکا تھا۔ بڑے دروازے کے ساتھ ہی ایک شخص ڈھیر کرتے ہوئے

وہ آگے بڑھا، اس کے پیچھے جسپال تھا، اس کے بعد میں اور میرے پیچھے وسیم کھوکھر تھا۔ سامنے دالان میں چار بندے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، وہ ہمیں دیکھ کر تیزی سے اٹھے ہی تھے کہ جسپال اور جنید نے انہیں وہیں ڈھیر کر دیا۔ فائرنگ کی آواز سے ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ اچانک اوپر سے فائر ہونے لگے۔ ہمیں آڑ لینا پڑی۔

میں نے اشارے سے جنید کو بتایا کہ میں اوپر جا رہا ہوں، تم یہیں پر دیکھو۔ اور پرانی طرز کی چھوٹی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ان سیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ میں محتاط انداز میں چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرے سامنے کمروں کی ایک لمبی راہداری آ گئی۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک آدمی نکلا، وہ محتاط انداز میں جالیوں کے پاس آیا اور نیچے دیکھ کر فائر کرنے لگا تو میں نے اس پر فائر کر دیا۔ تب تک چھت پر سے ایک فائر نیچے ہوا۔ ایک لمحہ کو فائر کرنے والے کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ تبھی میرے پیچھے سے وسیم کھوکھر کی آواز ابھری۔

"وہ ہے سعید مارکر۔"

"چل پھر اوپر چلتے ہیں۔" میں نے ہولے سے کہا اور اوپر کی جانب چل پڑا۔ میں نے سیڑھیوں کے آخر میں جا کر احتیاط سے سر اٹھایا۔ سامنے لمبی چوڑی چھت کے کنارے پر دو لوگ کھڑے تھے۔ ان دونوں کا دھیان نیچے تھا۔ وہ دکھائی دینے والے حملہ آور پر فائر کرنے کے لیے پوری طرح تیار کھڑے تھے۔ میرا اور ان کا فاصلہ اتنا تھا کہ اگر میں بھاگ کر انہیں پکڑنا چاہتا تو وہ مجھ پر فائر کر سکتے تھے۔ میرے پاس فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو میں نے میگزین دیکھا۔ اس میں ابھی گولیاں تھیں۔ میں نے فون نکالا اور جنید کو کال کر کے اسے اوپر آنے کو کہا۔ دو منٹ کے دوران وہ اوپر آ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا اور ایک دم سے فائر کر دیئے۔ فائر ان کے ہاتھوں پر لگے تھے، جس سے ان کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل نجانے کہاں اُڑ گئے تھے۔ دونوں ایک ساتھ چیخے۔ ان کے منہ سے بے اختیار مغلظات برآمد ہونے لگیں۔ تب میں ایک دم سے ہنس دیا۔ میں اجنبی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ابھی انتہائی تکلیف کے ساتھ بلبلاتے ہوئے حیران ہو رہے تھے کہ ہم ان تک پہنچ گئے۔ ان میں تو ایک مقامی لگ رہا تھا جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ یہ سعید مارکر ہے، دوسرے نے جین کے ساتھ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، وہ اپنا ہاتھ پکڑے ہوئے اب بھی گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کے منہ پر زوردار گھونسہ مارا، وہ پیچھے ہٹ دہرا ہوا اور مجھ پر پل پڑا۔ میں نے پسٹل جنید کی طرف اچھالا اور اس کے وار کو کلائی پر روک لیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بغل میں ہاتھ دے کر فرش پر دے مارا، وہ گرتے ہی اسپرنگ کی مانند اچھلا اور میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں سمجھ چکے تھے کہ ہم کون ہیں۔

وہ واقعی ہی فائیٹر تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کی تکلیف نظر انداز کر کے میرے مقابلے پر اتر آیا تھا۔ وہ طوفانی انداز میں میری جانب بڑھا، مگر میں اسے زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے میری جانب بڑھا تھا، میں گھوما اور پوری قوت نے کہنی اس کے سر پر دے ماری، وہ چکرا گیا تو میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر اس کی گردن پر مارے۔ وہ چھت پر چت ہو گیا۔ اسی لمحے جسپال چھت پر آ گیا۔ وہ سیدھا سعید مارکر کی جانب بڑھا تو اس نے سامنے سے ہاتھ نہیں اٹھایا، وہ سمجھ گیا تھا۔

میں نے اس اجنبی کو اٹھایا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

نیچے حویلی میں جو لوگ تھے وہ پکڑے جا چکے تھے۔ انہیں مقامی پولیس کا انتظار تھا، اصل میں وسیم کھوکھر کے بہت قریبی رانا عارف اقبال ایک محب وطن سیاست دان تھا۔ یہ ساری مدد انہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ کچھ انسانیت کے دشمن پکڑے گئے ہیں۔ وہ خود بخود مدد کو آن پہنچے۔ میں نے اس اجنبی کو ہوش میں لانے کے لیے اس کا سانس بند کیا تو وہ ہڑبڑا کر ہوش میں آ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ تب میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا، جن میں کوئی خوف نہیں تھا۔

"یہ چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیل رہے تھے؟"

"مزہ آیا نا کھیل میں؟" اس نے کہا اور منہ میں بھر جانے والا خون تھوک دیا

"کیوں کھیل رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ایویں ہی، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کتنے پانی میں ہو؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تو دیکھ لیا؟" میں نے پوچھا۔

"کسی ٹی وی اینکر کی طرح سوال ہی کرتے رہو گے یا کام کی بات بھی کرو گے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے یہ بتاؤ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"اسی میں تیرے سوال کا جواب ہے۔"

"بولو۔!" میں نے کہا۔

"ہمارے راستے میں مت آؤ۔ ہم جو بھی اس ملک میں کرنے جا رہے ہیں، وہ کرنے دو۔ تمہیں وہ سب ملے گا جو تم چاہو۔" وہ بولا۔

"میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ مجھے کوئی اپنی راہ پر نہیں لگا سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو اب تک تمہیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ تمہیں احساس دلایا ہے ہماری رسائی کہاں تک ہے۔ میں جب چاہتا تمہیں مروا سکتا تھا لیکن ابھی صرف سمجھایا ہے۔ اور یہ جان لو، تم اپنی مرضی کے مالک نہیں ہو۔"

"اور تم؟" میں نے پوچھا۔

"میں آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام ہوں، جس سسٹم میں ہوں، وہاں سے بھاگ نہیں سکتا، مر کر ہی آزاد ہوں گا، جیسے تم، تم بھی غلام ہو، چند گھڑی ہوئی بنیاد پرست خیالات کی فرسودہ عمارت بنا رکھی ہے تم نے۔ تم بھی غلام ہو۔" اس نے آخری لفظ بڑی نفرت سے کہے تو میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ باتیں چھوڑو، اور میری بات کا جواب دو، یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟"

"بتایا تو ہے، رستے سے ہٹ جاؤ، یا پھر ہمارا ساتھ دو، ورنہ ہم تمہیں ہٹا دیں گے۔" اس نے کسی خوف کے بغیر کہا تو میں نے اس کے ماتھے پر انگلی رکھتے ہوئے دباؤ دے کر کہا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگا کہ میں تمہیں ختم کر سکتا ہوں۔ تمہیں اور ان کو جنہوں نے تمہیں بھیجا ہے۔"

"تم مجھے مار سکتے ہو، جس طرح تم نے راشد کو مارا، اس کی جگہ میں آ گیا ہوں اور میری جگہ کوئی بھی آ سکتا ہے۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا، ہم ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے میری بات مانو اور......" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میں نے ہاتھ کی پوروں سے اس کا چہرہ پکڑ لیا۔

"ایک ہی سانس میں بتا دو کہ کس کے غلام ہو۔"

"مجھے مار کر میری ہڈیوں سے پوچھ لو، میرے گوشت کے ریزے ریزے سے پوچھ لو، میں بتا نہیں سکتا، کیونکہ مجھے پتہ ہی نہیں۔" اس نے یہ کہا تو میں نے اسے جنید کے حوالے کر دیا۔ اس نے اسے پکڑ

لیا۔ وہ بے حال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس نے آگے سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا مار کھاتا رہا، یہاں تک کہ وہ چھت کے کنارے تک جا پہنچا۔ جیسے ہی چھت کے کنارے پہنچا، وہ ایک دم سے یوں ہو گیا جیسے اس پر ہلکا سا بھی تشدد نہیں ہوا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے چھت کے کنارے بنی جالیوں پر چڑھا اور وہاں سے کود گیا۔

وہ یونہی نہیں کودا تھا۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ دوسری طرف دریائے چناب بہہ رہا ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ سے نکلا تو پھر ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ میں اسے یوں کیسے جانے دے سکتا تھا۔ میں بھی جالیوں پر چڑھا اور کود گیا۔ چند لمحے ہوا میں بدن بے وزن ہوا، پھر جہاں پر چھپاک کی زوردار آواز آئی تھی، وہاں سے چند فٹ کے فاصلے پر میں دریا میں جا پہنچا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے میں دریا کی تہہ میں اتر جاؤں گا۔ لیکن جلد ہی میں نے تیرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ میں سطحِ آب پر آ گیا اور تیرنے کی کوشش میں اس اجنبی کو دیکھنے لگا کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا اور میری طرح ہی لہروں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ پانی کی روانی میں تیزی تھی۔ وہ پانی کے بہاؤ میں بہہ رہا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ اس وقت مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ میں اتنا ماہر تیراک نہیں ہوں، جتنا وہ تیراک تھا۔ میں نے اپنی ہمت جمع کی اور اسے پکڑنے کے لیے زور لگا دیا۔ ہم آگے پیچھے تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بار تو مجھے لگا جیسے میں اسے پکڑ نہیں پاؤں گا۔ اس وقت مجھے حوصلہ ہونے لگا جب وہ تھک گیا اور اس کے ہاتھ غلط سلط پڑنے لگے۔ مجھے اس کا فائدہ مل گیا۔ میرا ابھی سانس نہیں اکھڑا تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بے دم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے جا لیا اور اسے گردن سے پکڑا ہی تھا کہ وہ یوں ہو گیا جیسے اس میں جان ہی نہیں رہی۔ میں نے اسے قابو میں کر لیا۔

اب میرے لیے مصیبت یہ تھی کہ مجھے خود کو سنبھالتے ہوئے، اُسے بھی قابو میں رکھنا تھا۔ اس ساری کشمکش میں مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ جنید بھی میرے پیچھے دریا میں کود چکا ہے۔ مجھے اس وقت پتہ چلا جب اس نے مجھے آ کر چھوا۔ اس نے ہمیں سہارا دے دیا۔ ہم لہروں پر بہہ رہے تھے۔ میری کوشش تھی، ہم جلد از جلد کنارے تک جا لگیں۔ پانی پر بہتے ہوئے ہم کنارے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

دریا کے کنارے تک پہنچتے ہوئے میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ میں کچھ دیر تک اپنی سانس بحال کرتا رہا۔ ہم سے پہلے ہی وسیم کھوکھر کے ساتھ جسپال وہاں پہنچ گیا تھا۔

"انہیں جلدی اٹھاؤ، قریب ہی ریسٹ ہاؤس ہے، وہاں چلتے ہیں۔" وسیم کھوکھر کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اٹھنے میں پتہ نہیں کس نے مدد دی۔ جلد ہی میں پانی میں بھیگا ہوا گاڑی کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگائی تو گاڑی چل پڑی۔

ریسٹ ہاؤس میں کپڑے بدلنے کے بعد میں اور جسپال لاؤنج میں گئے تو رانا عارف اقبال وہیں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اجنبی کو بھی وہیں لے آیا گیا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے بھی بدلوا دیئے گئے تھے۔ اسے قالین پر بٹھا دیا گیا اور اس کے پاس جنید بیٹھ گیا۔

"مان لیا کہ تُو بہادر ہے، جی دار ہے اور اپنی جان پر کھیل سکتا ہے۔ لیکن تمہیں شاید نہیں پتہ تھا کہ تمہارا واسطہ کن لوگوں سے پڑنے والا ہے۔" میں نے کہا اور

اس کی طرف دیکھنے لگا۔اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے پھر سے پوچھا۔

''ہاں تو پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟''

''کسی بھی نام سے پکارلو، نام میں کیا رکھا ہے۔''
اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں مسکرادیا،تبھی جنید نے اس کے بال پکڑ کر جھنجوڑنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''نہیں جنید،اسے،اس وقت کچھ نہیں کہنا۔جب تک یہ ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دیتا۔ہاں اگر ہٹ دھرمی کی تو پھر یہ نہیں،اس کی روح تک بولے گی ہمارے سامنے۔''میں نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے نگاہیں چرالیں۔ جیسے مجھے کہہ رہا ہو کہ تم جو چاہو کرلو۔تب میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''چلو،تمہارا کوئی نام بھی ہے،ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں،مگر یہ تو بتا سکتے ہو تمہیں کس نے ہمارے پیچھے لگایا؟''

''میں یہاں کے کام کا خود ذمے دار ہوں۔میں جو چاہوں سو کروں۔''اس نے دھیمے سے لہجے میں بتایا تو میں نے پوچھا۔

''ہم نے تمہیں کیا نقصان......''

''نہیں،تم ہماری راہ کی رکاوٹ ہو، میں نے تمہیں بتایا بھی ہے۔''اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''کیسی رکاوٹ؟''میں نے پوچھا۔

''تم مجھے مار بھی دو نا تو میں نہیں بتاؤں گا۔ہاں، ہمارے لیے کام کرو، جو چاہو،وہی ہوگا۔''

''تمہاری یہ بکواس تو میں نے پہلے بھی سن لی ہے، کیا کام لینا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''انقلاب!ہم اس ملک میں ایسا انقلاب لانا چاہتے ہیں، جس میں ہر انسان کو اس کا بنیادی حق ملے،کسی بھی قسم کا کوئی جبر نہ ہو۔'' اس نے انتہائی دردمندی سے کہا۔

''کیوں؟ تم ہی ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟''میں نے پوچھا تو طنزیہ انداز میں بولا۔

''یہی سوال اگر میں تم سے کروں کہ تم کیوں یہ سب کر رہے ہو، کس لیے؟''

''میری یہ مٹی ہے، میں اس وطن کا باسی ہوں، میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں اس میں وہی نظام لاؤں، جو اس وطن کو بنانے کی وجہ ہے۔''میں نے کہا۔

''کس نے دی ہے ذمہ داری تمہیں؟''اس نے پھر اسی لہجے میں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور مجھے کس ٹریک پر لے کر آنا چاہتا ہے۔

''میرے وطن نے۔''میں نے کہا۔

''تو میں بھی اسی مٹی سے ہوں، یہ بھی میرا وطن ہے، میرا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ میں یہاں کہ انسانوں کے لیے کام کروں۔بتاؤ مجھے، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، اپنے ضمیر کو حاضر ناظر جان کر کہو، کیا یہاں انسانیت سسک نہیں رہی، کیا یہاں پر انصاف ہے، کیا یہاں کے سیاست دان کرپٹ نہیں ہیں۔کیا یہاں کے عوام کو بنیادی سہولیات میسر ہیں۔جس عوام سے جتنا ٹیکس لیا جاتا ہے، اتنا اسے سہولت دی جاتی ہے، کیا ٹیکس لیتے ہوئے یہاں کے حکمرانوں کو شرم نہیں آتی، کیا جاگیرداری نظام نے اس پارلیمنٹ کو یرغمال نہیں بنا رکھا۔ایک فہرست ہے، جسے گنواتے میں تھک جاؤں گا مگر کسی بندے کو شرم نہیں آئے گی کہ وہ اسی ملک میں رہتے ہوئے، یہیں کا کھاتے ہوئے، اسی عوام کے ساتھ ظلم کرتا چلا جا رہا، اور ایسا ہونا چاہیے۔جس ملک کے عوام کو شعور نہیں، جو اپنا برا بھلا خود نہیں جانتے، جو ظلم سہتے ہیں، لیکن آواز بلند نہیں کرتے ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے اور

تیرے جیسے وطن پرست آنکھیں بند کر کے، غیر ملکی قوتوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ اپنے عوام پر ظلم کر کے اس ملک کو مضبوط کرتے چلے جارہے ہیں، تم ملک کو نہیں یہاں کے حکمرانوں کو مضبوط کر رہے ہو، ان کی دولت میں اضافہ کا باعث بن رہے ہو۔" اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو ایک لمحے کو میں اس کی باتوں میں آگیا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"کیا یہ سب تم اکیلے کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میرے ساتھ پوری دنیا کے لوگ ہیں، ہر ملک میں کام ہو رہا، یہاں بھی ہو رہا ہے۔ جس دن اس عوام کو شعور مل گیا، یہ تیرے سارے حکمران نہیں رہیں گے، عوام کی حکومت ہو گی، جمہوریت ہو گی صحیح معنوں میں، جسے جمہوریت کہتے ہیں۔" اس نے کہا تو میں ہنس دیا اور اسے کہا۔

"بہت جذباتی باتیں کرلیں تو نے بیٹا، اب اگر سچ نہیں بتاؤ گے تو میں خود پتہ کرلوں گا۔"

"یہی سچ ہے۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو میں نے جنید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے فورسز کے حوالے کردو، اس سے اب لاہور ہی میں باتیں ہوں گی۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا جمال۔ میری جگہ اور آجائے گا۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"اور جڑ ہی ختم کروں گا۔ اب باتیں وہیں ہوں گی۔ چلو۔" یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا تو رانا عارف نے کہا۔

"یہ میری ذمے داری ہے کہ اسے وہاں تک پہنچا دوں، اب یہاں بھی سب دیکھنا ہوگا۔"

جنید اسے لے کے باہر چلا گیا، جہاں اسے وصول کرنے کے لیے لوگ آچکے تھے۔

چائے پینے کے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا جب ہم ہیڈ مرالہ کا پل پار کر رہے تھے۔ میں ان مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا۔ اس لیے جنید کو گاڑی آہستہ چلانے کو کہا۔ وہ دھیمی رفتار سے جا رہا تھا، پل ختم ہو گیا تو میں دیکھا۔ سفید کرتے اور تہبند میں ایک بزرگ سا بندہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا اسا را عصا تھا۔ اس نے سفید چادر سے اپنے چہرے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ ہمیں رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے جنید کو گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ رک گیا۔ میں نیچے اترا تو اس نے مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے کہا۔

"جی بزرگو، فرمائیں۔"

"یار، ہمارے علاقے میں آئے ہو اور ہمیں ملے بنا ہی جا رہے ہو۔ آؤ، ادھر بیٹھیں۔" انہوں نے دریا کنارے پڑے بینچ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں اس جانب بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ چل پڑے۔ ان کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ ہم دونوں بینچ پر بیٹھ گئے تو انہوں نے اپنے چہرے پر سے چادر ہٹادی تب میں حیران رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ تھے، جن سے میں شاہ جمال لاہور میں ملا تھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرانے لگے تو میں نے بے ساختہ کہا۔

"بابا جی آپ؟"

"یار! اگر پھر سے ملاقات ہوگئی ہے تو اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔"

"نہیں نہیں، یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو بولے۔

"کچھ باتیں ہیں جو تم سے کہنا تھیں، وہ لے لو، سمجھ لو۔ تیری امانت ہے میرے پاس۔"

"جی فرمائیں۔" میں ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا تو میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولے

"انسان عشق سے آگاہی کے بعد جب اپنے

باطن میں اترتا ہے تو جان بھی شکستہ ہو جاتی ہے۔ جس سے دل ظاہر ہوتا ہے۔ جو جان سے انتہائی اعلیٰ و بلند ہے جو جان کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ پھر جب دل شکستہ ہوتا ہے تو اندر کے نور و انوار سے محکم ہو کر فتح نور سے جان و جسم کو تسخیر کر کے جان و جسم کو حق سے بناتا ہے۔ عالم کو اپنی مرضی سے تعمیر کرتا ہے۔ جس سے ایک مومن کی صورت جنم لیتی ہے۔ مومن کائنات میں رَبّ تعالیٰ کی مرضی ہوتا ہے، اس میں سے رَبّ تعالیٰ کی مرضی نظر آتی ہے، اور اس کی مرضی رَبّ تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے۔''

''شکستگی کے بعد تعمیر تو ہے، اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا تو وہ اسی جذب سے کہنے لگے

''وہ چہار عناصر جن سے زندگی کا مادی وجود ظاہر ہوا ہے، وہی چہار عناصر اس کی مخالف قوتیں تھیں، وہی قبضہ میں آ کر کارآمد ہو جاتی ہیں۔ آگ جو دشمن تھی، اسے قبضے میں کر کے اس سے فوائد حاصل کئے جا رہے ہیں۔''

''جی بجا فرمایا یعنی آگ گلزار بن جاتی ہے۔ تیل اور گیس اس کی واضح مثال ہے۔'' میں نے اپنے طور پر کہا تو سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''جب مادی سوچ اس کی اندرونی انسانی سوچ کو بند کر دیتی ہے، تو دردمندی، سوز و گداز، نرمی کی جگہ سختی آ جاتی ہے۔ جبکہ انسانی فکر و سوچ ان بندشوں کو توڑ کر اس میں احساس، ہمدردی اور ہمت پیدا کر دیتی ہے۔ مادی جسم شکستہ ہوگا تو عالم صورت ظاہر ہوگی۔ عالمِ صورت شکستہ ہوگی تو دل ظاہر ہوگا۔ دل کے شکستہ ہونے سے عالمِ دل ظاہر ہوتا ہے، تبھی دل کے اندر دیدار ہوتا ہے۔''

''مادی جسم کی شکستگی سے زندگی برقرار رہتی ہے؟'' میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا۔

''مادی جسم ظاہر ہے جو چہار عناصر ہیں اسے تصویرِ زندگی نے محیط کیا ہوا ہے۔ ان چہار عناصر کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ جب بڑی قوت ظاہر ہوتی ہے تو چھوٹی قوت شکستہ ہو جاتی ہے اور اسے اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔ مادی وجود ظاہر اور زندگی اس میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کا عکس جسم سے ظاہر ہے۔ جو دھڑکن اور رگوں کی حرکت و عمل سے ظاہر ہے۔ جسم اپنے آپ کو زندگی میں سے دیکھ رہا ہے۔ زندگی اپنے مادی جسم سے اپنے اعمال کو دیکھ رہی ہے۔ کیونکہ زندگی، زندگی میں فکر و نظر میں مادی جسم ظاہر ہے۔ جسم ظاہر ہے اور جسمانی اعمال و سوچ ظاہر ہو رہے ہیں۔ زندگی چونکہ خود کو نہیں دیکھ رہی ہے۔ اپنی قوتوں کا ادراک نہیں ہے۔ اس لیے خود کو جسم کی قید میں دیکھ رہی ہے۔ اس نے مادی جسم کو ہی اپنا ہونا سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ مادی جسم کی حرکت زندگی سے ہے۔ کیونکہ بوقت موت جسم مادی بے حس و حرکت پڑا ہوا ہوتا ہے۔ جب جسم کا تعلق جان سے ہوتا ہے تو جسم بھی زندہ ہوتا ہے۔ مردہ دل کی نسبت جب زندہ دل سے ہو جاتی ہے وہ بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ یوں جو حرکت ہے وہ خود کو مجبور سمجھ رہی ہے اور جو بے حرکت ہے اسے خود پر مسلط کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اس کی خود اپنے آپ پر نظر نہیں ہے۔ جسم اس کے لیے کوہ گراں نظر آ رہا ہے۔ حالانکہ زندگی کی قوت کے آگے مادی جسم کی کوئی وقعت نہیں ہے۔''

''اور یہ زندگی......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے

''زندگی کائنات کو دیکھ رہی ہے، اسے سمجھ رہی ہے۔ زندگی جو خود مادی وجود کا باطن ہے، اپنے آپ کو نہیں دیکھ رہی۔ حالانکہ ذات پاک نے انسان کو اندر دیکھنے کی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہوا ہے۔ ظاہر کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور مادی جسم سے آگے

باطن میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس سے عام انسان بے خبر ہے۔ اس کی خبر کسی خبر دار سے لے۔ زندگی کو دیکھنا ہے تو وہ تیرے اندر ہے۔ اندر دیکھ، جب انسان کی نظر اپنی زندگی پر جاتی ہے، تو پھر یہ انسان سمجھتا ہے کہ کائنات، جسم، مادی اس کا ایک جز ہے۔ زندگی کی قوت، اعمال و فکر ظاہر ہوتے ہیں۔ جب اس کی نگاہ زندگی پر پڑتی ہے تو اس کا مادی جسم شکستہ ہو جاتا ہے ۔کیونکہ جان، صورت ہے۔ جس میں تمام عالم کی صورتیں پڑی ہیں۔ اس نقش سے تمام نقوش ظاہر ہو رہے ہیں اور چھپ رہے ہیں۔ ظاہر میں حرکت کرتا ہوا مادی جسم نظر آتا ہے۔ جب زندگی پہ نگاہ جاتی ہے تو پھر زندگی حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ وہ جیسے قلندر لاہوری نے کہا ہے کہ چوں حس دگر شد ایں عالم دگر شد...... سکون و سیر وکیف وکم دگر شد۔"

(ترجمہ۔ جب حس بدل گئی تو یہ جہاں بھی بدل گیا۔ سکون، حرکت، کیفیت اور کمیت (کس طرح اور کیسے) بھی بدل گئی۔)

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، پھر اسی جذب میں یہ شعر پڑھنے لگے۔

حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ۔
گردش ماہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
پرورش دل کی اگر مدنظر ہے تجھ کو
مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

"اور سن، دل کے رستے سے روکنے والا کون ہے اسے پہچان، بدل کے بھیس آجاتے ہیں ہر زمانے میں...... اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات' وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے آدمی کو دیتا ہے نجات۔ سنو! انسان خدا کا بھید ہے۔ اشرف المخلوقات ہے۔ خود کو دیکھ، خود کو دیکھ لے، خود کو پہچان لے اور خود کو پالے۔ خود سے بیگانہ نہ ہو، خود کا محرم ہو خود کا انکار نہ کر خود کو مان لے۔ تو سچ ہے، سچ کو ظاہر کر دے۔۔ کائنات کا وجود، وجود انسان ہے اور کائنات کی جان انسان کی جان ہے۔ کائنات کی جان انسان ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے اٹھ گئے۔ یوں جیسے مجھے پہچانتے نہ ہوں۔ وہ پل کی جانب بڑھ گئے۔ میں انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا، جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ میں آہستہ قدموں سے گاڑی میں جا بیٹھا تو جنید نے گیئر لگا دیا۔ ہم لاہور کی طرف جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

میں اور جسپال ماڈل ٹاؤن والے گھر کی چھت پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کافی دیر تک اس اجنبی کے بارے میں باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ اپنی باتیں کرتا رہا۔ ہم دیر تک دونوں ملکوں میں ہونے والی زیر زمین کارروائیوں پر بات کرتے رہے۔ اس نے جس حد تک سمجھا، وہ کہتا رہا۔ وہ کافی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ اس کا خالصتان والا وہ خواب کہیں بہت دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سکھ کمیونٹی واضح طور پر دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ عام سکھ ڈرا اور سہما ہوا ہے ۔نوجوان نسل کو کہیں کا کہیں بھٹکا دیا گیا ہے۔ مگر میرا اسے یہ کہنا تھا کہ نہیں، آگ چاہے بجھ جائے، اگر دھواں اٹھ رہا ہے تو اس میں چنگاری ضرور موجود ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد بھڑکنے والی ہے۔ ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ جنید میرا نیا فون لے کر آ گیا۔ پہلا فون دریائے چناب کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ فون بج رہا تھا۔ میں اسکرین پر نگاہ ڈالی، سوہنی کا فون تھا۔

"میں اسی لیے فون لے کر بھاگا آیا ہوں کہ آپ کی حکومت کا فون ہے۔" جنید نے شرارت سے کہا

میں مسکرا دیا۔ میں نے کال ریسیو کی

''فون کیوں بند تھا؟'' سوہنی نے غصے اور تشویش سے پوچھا تو میں نے کہا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے آ کر سناؤں گا۔''

''کب آنا ہے اور بتانے سے پہلے سوچ لینا کہ تانی کی شادی ہے۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''میں نے کب انکار کیا ہے۔ بس یہ جسپال سے باتیں کر رہا تھا، بس نکلتے ہیں کچھ دیر بعد نور نگر کے لیے۔'' میں نے کہا۔

''یہ باتیں یہاں آ کر بھی ہو سکتی ہیں۔'' اس نے غصے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ جسپال میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تبھی میں نے بتایا

''وہ بلا رہی ہے۔''

''چلو پھر چلتے ہیں۔'' اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو میں نے جنید سے چلنے کو کہا۔ وہ پلٹ گیا تو ہم بھی چھت سے لاؤنج میں آ گئے۔ انہی لمحات میں طارق نذیر کا فون آ گیا۔

''کہاں ہیں آپ، مجھے آپ سے بہت ضروری ملنا ہے۔''

''کوئی خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آپ سے مل کر بتاتا ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے اسے آنے کا کہہ دیا۔ اب مجھے اس کا انتظار کرنا تھا۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ آن پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک فربہ مائل، نفیس شخصیت والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ بڑی متانت کے ساتھ مجھے ملا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو طارق نذیر نے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے فرزند علی صاحب کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان سے ایک بار ملنے سے منع کر چکے ہیں۔ چونکہ ملنا ضروری تھا اس لیے مجھے یوں......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو کیا یہ وہ وزیر ہیں جن سے ملنے کی بابت کہا تھا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں وہی ہوں۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ نے انکار کیوں کیا تھا، وہ ضروری تھا، مجھے رانا عارف اقبال نے بتا دیا ہے۔ اسی لیے میں خود چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔'' اس نے بڑے دھیمے لہجے میں یوں کہا جیسے وہ شرمندہ ہو، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تبھی میں نے کہا۔

''جی آپ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''آپ جو ملک و قوم کے لیے کر رہے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے، آپ وہ کچھ کر رہے ہیں، جو ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ سے مدد ہی مانگ سکتے ہیں۔'' اس نے پھر اسی لہجے ہی میں کہا۔

''جی فرمائیں۔'' میں تحمل سے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ سارے ہی سیاست دان کرپٹ نہیں ہیں، بہت سارے ایسے بھی ہیں جو ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ سسٹم انہیں کچھ بھی نہیں کرنے دے رہا ہے اصل میں جب میں نے آپ سے ملنا چاہا تھا، اس وقت میرے ذہن میں صرف شک تھا، مجھے ایسی اطلاعات مل رہی تھیں کہ خاص طور پر پنجاب میں بہت ساری جگہوں پر ایسے ناسور پھوٹ رہے ہیں، جن کا کوئی علاج نہیں ہے۔ کوئی ایسی بیرونی طاقت ہے جو یہاں کے لوگوں کو شک میں مبتلا کر رہی ہے۔''

''شک میں مبتلا، مطلب میں سمجھا نہیں؟'' میں نے وضاحت کے لیے پوچھا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو سانس لینے رُکا اور پھر کہتا چلا گیا۔" کوئی بیرونی طاقت ،ہمارے وطن میں ایسا کھیل کھیل رہی ہے، جس سے لوگ اپنے نظریات اور افکار میں شک و شبہ محسوس کرنے لگیں۔ یہ جو شطرنج کی نئی بساط بچھائی گئی ہے، یہ کئی پہلو رکھتی ہے۔ مہرے اس بساط پر پھیلا دیئے گئے ہوئے ہیں۔ یہ جو آپ نے بندہ پکڑا ہے، میرے خیال میں ایک معمولی پیادے جیسا ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"پچھلے دو مہینے سے میرے پاس جو اطلاعات آ رہی ہیں وہ یہ ہیں کہ جہاں بھی انہیں کوئی محبِ وطن ملتا ہے یا اس وطن سے اسے کوئی گلہ شکوہ ہے، انہیں لوگ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوئی واضح بات نہیں تھی۔ مگر ہمیں یہی سمجھ آ رہی تھی کہ کوئی نیا گروہ بن رہا ہے، اس کا طریقہ کار اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی ایک پیغام نہیں رکھتے۔ وہ لوگوں کی نفسیات سے کھیل رہے ہیں۔ کسی کو ڈرا دھمکا کر، کسی کے کام آ کر، روپے پیسے کا لالچ دیکر، جسے بھی۔ وہ صرف نظریات پر وار کر رہے ہیں۔" اس نے اس بار پورے جوش سے کہا تھا

"نظریات پر وار؟" میں نے بات مزید سمجھنا چاہی تو اس نے میرے طرف دیکھا تو اس نے پہلے سے زیادہ جوش سے کہا۔

"اگر کوئی یہ کہے کہ محمود غزنوی نے سومنات پر قبضہ کب کیا؟ تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر اسے یوں کہا جائے کہ محمود غزنوی نے سومنات کب فتح کیا تو اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

"بالکل میں سمجھ گیا، قبضہ اور فتح کا فرق۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"ان دو لفظوں سے پوری تاریخ کیا نیت تک بدل جاتی ہے۔ بات وہاں جا پہنچتی ہے کہ جب رسالت مآب ﷺ نے مکہ فتح کیا۔ ذرا سوچیں، بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"دماغ میں شک کا کیڑا داخل ہو جائے تو وہ بنیادی نظریات کو چاٹ جاتا ہے۔ پھر درست اور غلط کی تمیز نہیں رہتی اور یہیں سے تعصب پھوٹتا ہے۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"یہی، یہی کچھ وہ کر رہے ہیں۔ پنجاب میں کئی جگہوں پر یہی چل رہا ہے، جو جرائم پیشہ ہیں، وہ زیادہ نزدیک آ رہے ہیں۔ کوئی دوسرا بس نہیں چلا تو پاکستان اور پاکستانیت پر اوچھے طریقے سے وار کیا جا رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"ایسا تو فقط بھارت ہی کر سکتا ہے۔" خاموش بیٹھا ہوا جسپال بولا۔

"بالکل، وہاں کے پنجاب میں بھی کچھ ایسا ہی چل رہا ہے، سکھ مت کے بارے میں شکوک ڈالنے کے لیے، اسے بالکل ایک نیا مت بنا کر پیش کرنے کے لیے انہوں نے ادارے بنا دیئے ہیں۔ انہیں صرف خالصتان تحریک سے خوف ہے۔" وہ مزید بولا۔

"میں ایسا ہی ایک ادارہ تباہ کر چکا ہوں۔" جسپال نے سکون سے کہا تو وہ چونک گیا

"بس تو پھر، وہ لوگ اسی لیے آپ لوگوں کو اپنی راہ کی رکاوٹ خیال کر رہے ہیں۔" وزیر نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا۔

"اسے ختم کرنا ہوگا۔ یہ تو ایک نسل کو تباہ کر دیں گے۔"

"لیکن اس سے بھی پہلے یہ افراتفری بھی مچائیں گے۔ تا کہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ کام کر رہے ہیں۔" جسپال نے جواب دیا تو میں نے کہا۔

"ہم ہی انہیں ختم کریں گے۔ میں ان کی جڑ تک پہنچوں گا۔ مجھے آپ تھوڑا سا وقت دیں۔"

''بالکل ٹھیک ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے آپ مجھے ملیں۔ پھر اس پر کام کا آغاز کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں نے انہیں رکنے کو نہیں کہا۔ ہم اکٹھے پورچ تک آئے۔ وہ اپنی راہ ہو لیے اور ہم نور نگر چل دیئے۔

☆......☆......☆

آدھی رات ہو چکی تھی، جب ہم نور نگر حویلی پہنچے۔ جیسے ہی پورچ میں گاڑی رکی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ گھر میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔ ہم لاؤنج میں آئے تو سوہنی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ جسپال سے ملی اس کا حال احوال پوچھا پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''فریش ہو کر آ جائیں ٹیبل پر، میں کھانا لگاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لاؤنج سے نکل گئی۔

ہم تینوں فریش ہو کر ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ رونیت کور کے ساتھ شمس اور قمر بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ ہی اروند سنگھ بھی سیڑھیاں اترتا ہوا دکھائی دیا۔

''او تم سب لوگ بھوکے ہو؟'' جسپال نے خوشگوار حیرت سے پوچھا تو رونیت نے کہا۔

''سوہنی بھابی نے کہا کہ تم لوگ آ رہے ہو، تو ہم نے کہا اکھٹے ہی کھانا کھائیں گے۔ اروند کے پاس بیٹھے پتہ ہی نہیں چلا، اتنا وقت گذر گیا۔''

''ہاں، بہت دنوں بعد یہ ملے ہیں نا تینوں۔'' میں ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ویسے جمال ویرے! جوان کے بارے میں سنا تھا، یہ ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ابھی یہی باتیں چل رہی تھیں۔'' رونیت کور نے ان دونوں کی تعریف کی تو سوہنی کے ساتھ ملازم کھانا لے آئے۔ کھانے کے دوران باتیں چلتی رہیں۔ ہم کہاں گئے تھے۔ یہ بتاتے رہے۔ دل نہیں کر رہا سونے کو۔ اس لیے چائے لے کر لاؤنج ہی میں بیٹھ گئے۔ تبھی سوہنی نے سب کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تم سب کو صبح ایک سرپرائز دینے جا رہی ہوں۔ اگر رونیت کور کو اس پر اعتراض نہ ہو تو۔'' اس پر رونیت کور خاموش رہی تو سوہنی نے دبے دبے جوش سے کہا۔

''صبح تانی کے ساتھ رونیت کور اور اروند سنگھ کی شادی بھی ہو رہی ہے۔''

''واؤ' یہ تو کمال ہو گیا۔'' جسپال نے حیرت سے کہا۔

''دونوں راضی ہیں نا۔'' میں نے اتمام حجت کے لیے پوچھا، ویسے میں سمجھ گیا تھا۔

''یہ بہت راضی ہیں، ہمیں پتہ ہی نہیں چلا اور ان دونوں کے درمیان چکر چل گیا۔'' سوہنی نے کہا۔

''ایک اور کام بھی کر دیں لگے ہاتھوں۔'' اروند سنگھ نے سب کی طرف دیکھ کر سوہنی سے کہا۔

''وہ کیا؟'' سوہنی نے پوچھا۔

''یہ جو اپنی مہوش ہے نا، اس کی شادی فہیم سے کروا دیں، میں گواہ ہوں۔'' اس نے اس قدر بے چارگی سے کہا کہ سبھی ہنس دیئے۔

''چل صبح ان کا کام بھی کر دیتے ہیں۔'' جسپال نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

''اچھا اب سب سو جائیں، صبح بہت سارے کام کرنے والے ہیں۔''

''نہ بھائی نہ ہمارے ویر کو لے جانا چاہو تو لے جاؤ، ہم تو ابھی جاگیں گے۔'' رونیت کور نے کہا تو سوہنی کچھ بولے بغیر ہونٹوں میں ہنسی دبائے اٹھ گئی۔ وہ لاؤنج سے چلی گئی تو میں بھی اٹھ گیا۔ جاتے ہوئے جسپال کو کہہ گیا کہ خیال رکھنا۔

میں اپنے بیڈ روم میں گیا تو سوہنی الماری میں سے کپڑے نکال رہی تھی۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا

رہا اور پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آ گئی۔ تب میں نے پوچھا۔

"رونیت اور مہوش کی شادی کے بارے میں بات تو ہو گئی، ان کے بارے میں کوئی تیاری کی تم نے۔"

"میں نے سب تیار کیا ہوا ہے۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" اس نے کہا۔

"چلو اچھی بات ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اگر آپ آرام کرنا چاہو تو سو جائیں۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"تم اگر پاس ہو تو پھر نیند کا کیا سوال۔" میرے یوں کہنے پر وہ زیر لب مسکرا دی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ سوہنی جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا انداز بالکل اماں کی طرح تھا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر اماں کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ وہ ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا، جیسے بچپن میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان چند لمحوں میں میرا سارا بچپن میری آنکھوں سے سامنے گذر گیا۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ اماں میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ہمارے درمیان بات نہیں ہو رہی تھی لیکن ان کے ہاتھ کا لمس مجھے بتا رہا تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہی ہیں۔ ایک نئی توانائی میرے اندر آ گئی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ ابھی ان کے مزید معمولات ہیں، اس لیے میں وہاں سے اٹھ گیا۔

سورج نکلتے ہی حویلی میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے میں نے سیکورٹی کے بارے میں دھیان دیا تھا۔ جسپال نے سب دیکھ لیا تو مطمئن ہو گیا۔ دوپہر سے ذرا پہلے مہر خدا بخش آ گئے۔ ان کے ساتھ چند لوگ تھے۔ وہ ملے تو روہی کا سارا زمانہ یاد آ گیا۔ تانی ان کے گلے لگ کر بڑی دیر تک روتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ ان سے الگ ہوئی تو سوہنی اسے تیار کرنے کے لیے لے گئی۔ شادی کی تقریب کا اہتمام لان میں کیا ہوا تھا۔ جہاں ایک بڑی ساری اسکرین لگی ہوئی تھی۔ اس کا اہتمام اکبر اور زویا نے کیا تھا۔ وہ علی الصبح کراچی سے آ گئے تھے۔

تقریباً گیارہ بجے کے قریب چوہدری اشفاق دولہا بنا پنڈال میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ یہ تقریب ہر اس جگہ دیکھی جا رہی تھی، جو ہم سے متعلق تھا۔ ان کے ساتھ ہی مہوش اور فہیم کو بٹھا دیا گیا۔ تانی اور مہوش کی طرف سے مہر خدا بخش ولی بنا تو مولانا صاحب نے باری باری ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ وہ شور ذرا کم ہوا تو اروند سنگھ اور رونیت کور کی باری آئی تو ان کا رخ اس بڑی ساری اسکرین کی طرف کر دیا جو خاص اسی مقصد کے لیے لگائی گئی تھی۔ اس پر سب سے پہلے ہرپریت کور نمودار ہوئی۔ وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

"ست سری اکال، اسلام علیکم، سب کو دھن واد۔ میری طرف سے اشفاق، تانی، مہوش اور فہیم کو مبارک باد۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اروند ویر کی شادی ہو رہی ہے۔ رونیت کور، بڑا دل کر رہا ہے تو میرے پاس ہوتی، میں تجھے دلہن بناتی، پر میں خوش ہوں، میری بہن سوہنی وہاں موجود ہے کوئی کمی نہیں ہو گی، جمال ویرا وہاں پر ہے۔ میں اس وقت اوگی گردوارے میں ہوں اور میرے ساتھ گیانی ہیں اور اوگی کے دوست۔ تم دونوں کی شادی گیانی کروائیں گے۔" یہ کہہ کر اس کا کیمرہ رُخ بدل گیا۔ اسکرین پر ایک گیانی بیٹھا ہوا تھا، اس کے آگے گرنتھ صاحب تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ رسم کے مطابق رونیت

اور اروند آ گے آ گئے۔ وہ گرنتھ صاحب کے آ گے جھک گئے۔ تب گیانی نے شادی والے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ وہ دونوں سمجھ رہے تھے۔ جسپال سنگھ ان کے ساتھ تھا۔ اس نے اروند کی پگڑی کا پلّو، رونیت کے آنچل کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ پھیرے لینے لگے۔ گیانی پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد ان کی شادی کا بھی اعلان ہو گیا۔ سوہنی نے ساری رسمیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ رسمیں نبھانے لگی۔ اس کی صرف یہی نیت تھی کہ انہیں یہاں اکیلا پن محسوس نہ ہو۔ اسکرین پر ہر پریت کور کے ساتھ پھوپھو کلجیت کور بھی تھی۔ کچھ دیر بعد اسکرین بھی صاف ہو گئی۔ نور نگر والوں نے ایسی شادی پہلی بار دیکھی تھی۔ گھر میں رسمیں ہوتی رہیں اور میں مہر خدا بخش کے پاس جا بیٹھا۔ ان کے ساتھ بہت ساری باتیں چلتی رہیں۔ کچھ دیر بعد جسپال بھی آ کر بیٹھ گیا۔ سہ پہر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس کے بعد مہمان جانے لگے، مہر خدا بخش بھی چلے گئے۔ جب شام اتری تو حویلی میں وہی مخصوص افراد تھے

☆......☆......☆

تیسرے دن، تینوں بیاہے ہوئے جوڑے، ایبٹ آباد جا رہے تھے۔ میں نے ہی انہیں چند دن سیر کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہیں سے اسلام آباد آ کر تانی نے اکیلے لندن چلے جانا تھا۔ ان کی فلائیٹ رات کی تھی۔ رات گئے وہ لاہور پہنچ گئے تھے۔ اگلے دن انہوں نے آ گے جانا تھا۔ اس وقت رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ میں اور جسپال چھت پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

''اب تم بھی شادی کر لو جسپال۔'' میں نے یونہی اس سے کہا تو جذباتی ہو گیا

''نہیں، میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا، جب تک خالصتان نہیں بن جاتا۔''

''اس کے لیے ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ ابھی سنگھ اور کور، خوف کے تلے دبے ہوئے ہیں، وہ ابھی تحریک چلانے، کے قابل نہیں ہیں۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ بولا۔

''یہی تو بات ہے، اس خوف کو تو ان سے دور کرنا ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ کیسے کرنا۔ مجھے اس نیٹ ورک پر اعتماد آ جائے جو مجھے سردار سرجیت سنگھ بندیال نے دیا تھا۔ اصل میں پروفیسر دیوندر سنگھ کے بھی وہی وچار تھے، جو سردار سرجیت سنگھ بندیال کے ہیں۔ مجھے انہیں جیسے چند مزید لوگوں سے ملنا ہے۔ میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔ ان لوگوں سے مل کر ان سے مشورہ کر کے پھر آ گے چلوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ میں بہت محتاط ہوں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے یوں کہا جیسے شادی اس کے لیے منع ہو چکی ہے اور یہ اس کے بارے میں دلائل دے رہا ہے۔

''لیکن اس سارے کام میں شادی رکاوٹ نہیں ہے، یقین مانو۔'' میں نے کہا تو سمجھ گیا کہ میں اسے کیا منوانا چاہتا ہوں۔ سو وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی خاموشی رہی تو اس نے کہا۔

''چل آ، ذرا وہ شمس الدین اور قمر الدین کو دیکھیں۔ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان سے بھی گپ شپ کر کے دیکھ لیں۔''

''چلو۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور نیچے ان کے پاس آ گئے۔ وہ دونوں ہی اکبر کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں وہاں آتا دیکھ کر اکبر بولا۔

''ان بندوں کو تو کراچی میں ہونا چاہیے۔''

''اس کی وجہ؟'' جسپال نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

''سمجھ لو کہ جس طرح ایک کار مکینک کوئی نیا ماڈل متعارف کراتا ہے تو اسے نت نئے پرزوں کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں نورنگر میں بیٹھ کر یہ مارکیٹ سے بچ تو ہیں، لیکن مارکیٹ تک وہ رسائی نہیں جو ہونی چاہیے۔''

''کیا یہ وہاں جانا ضروری سمجھتے ہیں۔'' میں نے اکبر کی طرف دیکھ کو پوچھا۔

''نہیں بھائی، اب ہم کہیں نہیں جانے کے، بہت مشکل سے یہاں سکون ملا ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر بھی مارکیٹ سے بچ ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔'' شمس الدین نے تیزی سے اپنے دل کی بات کہہ دی

''آج کل ہو کیا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا پہلا ٹارگٹ یہی ہے کہ میں جس حد تک 'را' کو نقصان پہنچا سکوں۔ میرے ذہن میں وہ بھی ہے جو آپ کو یہاں کے وزیر نے بتایا۔ یہی ذہن میں رکھ کر میں ہر ممکن حد تک تلاش میں ہوں، تاکہ مجھے کہیں سے بھی کوئی سرا پتہ مل جائے۔'' شمس الدین نے بتایا تو قمر الدین بولا۔

''اروند سنگھ نے جو اب تک کام کیا ہے، اس کا ٹریک درست ہے، اس نے ہمیں بھی بہت حد تک رسائی دی ہے۔ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے، یہ منصوبہ ہم آپ کو نکال دیں گے۔ کیونکہ اب یہ راز نہیں رہا۔''

''یہ خیال رکھنا، مجھے بھارت سے نہیں، یہاں سے وہ لوگ چاہئیں جو ان سب کو چلا رہے ہیں۔ شطرنج کی اس بازی پر وہ بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔''

''سب مل جائیں گے۔ ایک بھی ہاتھ آ گیا تو......'' شمس الدین نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تو مجھے ایک دم سے یاد آیا۔ تب میں نے جمال سے پوچھا۔

''او یار! وہ جو لیپ ٹاپ اور سیل فون ملا تھا، ڈھاری سے، وہ کدھر ہے؟''

''اوئے وہ تو میرا خیال ہے جنید نے سنبھالا تھا، اسی کے پاس ہوگا۔'' جسپال نے یاد کرتے ہوئے اپنا سیل فون نکال لیا تو شمس الدین نے چمکتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ تیزی سے پوچھا۔

''ایسا کوئی کچھ ملا ہے؟''

''ہاں، ملا ہے۔'' جسپال نے کہا اور جنید کے نمبر پش کر دیئے۔ کچھ ہی لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ میں شمس الدین اور قمر الدین کو سمجھانے لگا کہ انہوں نے ہمارا ہی طریقہ ہم پر آزمایا تھا۔ ہم نے انہیں سیل فون کے ذریعے تلاش کیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے ہمیں گھیرنے کے لیے بھی سیل فون ہی کا سہارا لیا۔ انہی باتوں کے دوران جنید وہ لیپ ٹاپ اور سیل فون لے آیا۔ شمس الدین اور قمر الدین دونوں اسے کھول کر دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں کام کرنے دیا اور ان کے پاس سے اٹھ کر لان میں آ گئے۔ میں، اکبر، جسپال اور جنید وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے درمیان وہی اجنبی موضوع تھا۔ جسپال سنگھ کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وزیر نے جو وجہ بیان کی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بھارت ہر محاذ پر پاکستان کے ساتھ حالت جنگ میں ہے۔ اس نے ثقافتی جنگ بہت پہلے کی شروع کر رکھی ہے۔ میڈیا اور خاص طور پر نیٹ کے آ جانے سے اس نے یہ جنگ بہت تیز کر دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اثرات پاکستانی قوم میں دکھائی بھی دے رہے ہیں۔ ہمارے ہی علاقے میں لسانی تعصب کو اس طرح ابھارا گیا تھا کہ نوجوان نسل میں پاکستان کے وجود پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا۔ چند حکمرانوں کی بے وقوفی اور احمقانہ حرکتوں نے اس تعصب کو مزید ہوا دی تھی۔ وقت کے ساتھ یہ دب گیا، لیکن چنگاریاں اب بھی موجود ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ کون قیام پاکستان کا مخالف تھا یا کون نہیں، پاکستان بن جانے کے بعد، پاکستان میں

رہ کر، یہیں کا کھا کر اسی کی مخالفت کرنا، غداری کے مترادف ہے۔

اصل میں مضبوط قوم کو کوئی دشمن نہیں پچھاڑ سکتا۔ وار وہیں پر ہوتا ہے جہاں خامی ہو۔ اگر مفاد پرستی پاکستانی قوم میں ہے تو یہ بھارتی لوگوں میں کہیں زیادہ ہے۔ پاکستانی قوم کو یہ کریڈٹ بہر حال جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وقت پڑا اس نے اپنے آپ کو قوم ثابت کیا ہے، ایسا بھارت میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ حکمرانوں کی مفاد پرستانہ پالیساں اپنی جگہ، ان دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ ایک قوم بن کا مضبوط تصور راسخ کریں۔

انہیں باتوں میں رات کا دوسرا پہر بھی گذر گیا۔ جسپال سنگھ بھی اپنے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اسے جن حالات کا سامنا تھا وہ کہتا رہا۔ وہیں بیٹھے اچانک یہ پروگرام بن گیا کہ یہاں سے اٹھیں اور لاہور چلیں۔ میں نے سوہنی کو بتایا اور وہاں سے نکل پڑے۔ سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا کہ ہم لاہور ماڈل ٹاؤن پہنچ گئے۔ اس وقت طارق نذیر صبح کی سیر کے بعد اپنے گھر آ چکا تھا۔ اسے سیف ہاؤس تک پہنچنے کو کہا۔ فریش ہو کر ناشتہ کرتے ہی ہم اس کی طرف چل دیئے۔

وہ اجنبی ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ٹھنڈے فرش پر ایک دری پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ زنجیر سے باندھے ہوئے تھے۔ وہ الٹا پڑا ہوا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ سن کر ایک بار اس نے ہماری طرف دیکھا، پھر یوں لیٹ گیا جیسے ہمیں نظر انداز کر رہا ہو۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

"یہ اسے باندھا کیوں ہے؟"

"اس نے دو بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی ہے، ہمارے بندوں کو بھی زخمی کیا ہے۔" طارق نذیر نے بتایا تو میں نے کہا۔

"کھول دو اسے۔"

میرے کہنے پر ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے اسے کھول دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے میری بات کہنے کا منتظر ہو۔ تبھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں مانتا ہوں کہ تم جو کر رہے ہو، اپنے کسی بھی مفاد میں کر رہے ہو، وہ چاہے تمہارا ذاتی ہے یا ملکی یا جو بھی، میں ایسے لوگوں کی قدر کرتا ہوں کہ اندھیروں میں مارے جانے والے لوگ بہر حال قابل تعریف ہوتے ہیں، وہ اپنی قوم کے لیے لڑتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تم پر تشدد کروں۔ تمہیں اذیت دے کر تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں۔ کیوں نا ہم اچھے ماحول میں، بات کریں۔"

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ مگر اس کی آنکھیں مجھے بتا گئی تھیں کہ اسے میری بات اچھی لگی تھی۔ شاید ان آنکھوں پر اسے قابو نہیں تھا کہ لاشعور کی جھلک اس میں آ گئی تھی۔ پھر بولا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"میں پوچھوں گا تم سے، لیکن اچھے ماحول میں، اگر تم چاہو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اپنی کلائیوں پر زنجیر سے بن جانے والے زخموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے طارق نذیر سے کہا۔

"یہیں اس کے نہانے کا بندوبست کرو، اس کے لیے صاف کپڑے لاؤ۔ میں یہیں ہوں، باقی سب جاؤ۔ ناشتے بھی۔"

میرے کہنے پر سب چلے گئے۔ فوراً ہی پانی اور باقی چیزیں آ گئیں، وہ نہانے لگا۔ وہ خوب نہایا تھا۔

اس دوران کپڑے بھی آگئے۔ اس نے وہ پہنے اور تیار ہو گیا۔ میں اسے کمرے سے باہر لے آیا۔ دوسرے کمرے میں فرشی چٹائی بچھی تھی۔ وہاں ناشتہ لگا ہوا تھا۔ وہ بیٹھ گیا اور ناشتہ کرنے لگا، میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اطمینان سے کھا پی کر کہا۔

''بولو کیا پوچھتے ہو؟''

''مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے تھے؟''

''تم اور تمہارا نیٹ ورک بھارت میں ہمیں ڈسٹرب کر رہا ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''تو تم بھارتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میں بھارتی ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگوں کو یہ وہم کیوں ہو گیا کہ میرا وہاں نیٹ ورک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر آپ سچ نہیں بولیں گے تو میں بھی خاموش ہو جاؤں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، میرا کوئی نیٹ ورک نہیں ہے۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویرتا، کس کی تنظیم ہے، جو بھارت میں کام کر رہی ہے؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''تم ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو یا پھر غلط فہمی میں مجھ تک آ پہنچے ہو۔ مجھے تمہاری تلاش پر کوئی اعتراض نہیں، مجھ تک آنے پر بھی غصہ نہیں لیکن......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''میں غلط نہیں پہنچا ہوں اور نہ ہی مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، میرا ڈیپارٹمنٹ دھوکا نہیں کھا سکتا۔''

''اوکے' تم ثابت کر دو، میرا وعدہ رہا کہ نہ صرف میں تجھے جانے دوں گا، بلکہ میں تمہاری بات بھی مان لوں گا۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا تو اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرے سامنے کوئی معمولی آدمی نہیں بیٹھا، بلکہ ایک تربیت یافتہ جاسوس بیٹھا ہے۔ اسے مطمئن کرنا بہت مشکل ہے۔ میں دل ہی دل میں اسے داد دے رہا تھا کہ وہ 'ویرتا' تک پہنچ گیا تھا۔

''ایسا ہو نہیں سکتا۔'' وہ تذبذب میں بولا۔

''دیکھو، میں تمہیں وقت دیتا ہوں، جو چاہو، وہ سہولت بھی دیتا ہوں۔ ثابت کرو، اگر نہ کر پائے تو پھر......'' میں جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ یہ ایک طرح سے میرا اس پر نفسیاتی وار تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''میں اس وقت تمہیں کوئی دلیل نہیں دے سکتا، لیکن میرا ڈیپارٹمنٹ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ تم ہو، لوکیشن وہی تمہارے نور نگر کی ہے اور چندی گڑھ سے تمہارا رابطہ ہے۔ ہم تمہیں اب سے نہیں، پچھلے ماہ سے واچ کر رہے ہیں۔ اسی سے تمہارا طریقہ سمجھ میں آیا کہ تم کیسے یہ سب کر رہے ہو۔'' اس نے بھی پورے اعتماد سے بتایا۔

''میں پھر کہتا ہوں کہ تمہارا ڈیپارٹمنٹ ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ سندیپ کور کو جب سے جانے دیا گیا ہے، تم لوگ اسی تناظر میں دیکھ رہے ہو۔ وہ لڑکی تو مظلوم تھی، جسے تم لوگوں نے استعمال کیا تھا، اس کے اندر کی سلگھنی کو جگا دیا تو اس نے وہاں جا کر آگ لگا دی۔ اس نے اپنا انتقام لیا ہے۔ اب فائلوں کو بھرنے کے لیے، انہوں نے تمہاری بلی چڑھا دی۔ خیر، میں تمہیں ایک دو دن مزید دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ رابطہ کر لو۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں مسٹر......''

''جے لکشمن۔'' اس نے اپنا نام بتا دیا۔

''اوکے، بھاگنا نہیں، سکون سے رہو۔'' میں اٹھا تو طارق نذیر کے لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

جسپال میرے ساتھ بیٹھا ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ اٹھ گیا۔ میں نے طارق نذیر کو اس

کے بارے میں چند خصوصی قسم کی ہدایات دیں اور وزیر سے ملنے چل پڑا۔ جسے میری آمد کے بارے میں طارق نذیر نے بتا دیا ہوا تھا۔ میں نے جسپال سنگھ کو جے لکشمن کے پاس چھوڑ دیا کہ اُسے مزید کرید سکے۔ ممکن ہو تو کوئی بات نکال سکے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اروند سنگھ کو فون کر دیا۔ جب میں نے اروند سے اسی حوالے سے بات کی تو وہ بھی ایک دم سے پریشان ہو گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد فون کرنے کو کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔

وزیر اپنے گھر ہمارے انتظار میں تھا۔ وہ صوبائی سطح کا وزیر تھا، سو اس کے پاس اسی سطح کی فورسز کے کچھ آفیسر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے جاتے ہی بات شروع ہو گئی۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ سبھی وہی باتیں، جو اس نے پہلے ہی بتا دی تھیں۔ مجھے لگا کہ یہ ملاقات بس نشستن برخاستن ہی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایسا کیوں ہوا۔ کوئی دو گھنٹے ضائع کرنے کے بعد جب ہم وہاں سے نکلے تو مجھے وقت ضائع ہو جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ اجنبی نمبر تھا، میں کال ریسیو کر لی۔

''میں صفدر اسمعیل بات کر رہا ہوں، ابھی ہم ایک میٹنگ میں تھے۔'' دوسری طرف سے بھاری آواز میں کہا گیا۔

''جی صفدر صاحب فرمائیں۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں، مجھے آپ سے ابھی ملنا ہے۔ چاہیں تو یہاں کسی ریستوران میں گاڑی روک لیں، یا پھر ماڈل ٹاؤن میں ملاقات ہو جائے گی۔''

''کیا ایسی کوئی بات ہے کہ جو وہاں میٹنگ میں نہیں ہو سکی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ایسا ہی ہے کچھ۔'' اس نے کہا تو میں نے اس کے ساتھ مال روڈ پر موجود ایک فور سٹار ہوٹل کا طے کر کے اسی طرف جنید کو جانے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے سامنے تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور سامنے میز پر بیٹھ گیا۔ پھر اپنا فون نکال کر اس نے کال ملائی اور فون مجھے تھما دیا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔

''ہیلو، جمال کیسے ہو؟'' کرنل سرفراز کی بات سنی تو مجھے ایک دم سے خوشگوار حیرت ہوئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''یہ صفدر بہت اچھا جوان ہے، ہمارا ساتھی ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔'' انہوں نے تعریف کر کے گویا مجھے اس پر اعتماد کرنے کا کہہ دیا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا ہوگی ملاقات کچھ دنوں تک۔'' انہوں نے یہ کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون اسے واپس تھماتے ہوئے کہا۔

''جو بھی کہنا ہے بلا تمہید کہہ دو۔''

''ان سیاست دانوں کی بات پر نہیں جانا۔ یہ انتقام کے چکر میں ہیں۔ یہ آپ کو کہیں غلط جگہ پھنسانے جا رہے ہیں۔ یہ جو وزیر نے بریفنگ دی ہے، یہ ان کا مفروضہ ہے۔''

''یہ مجھ سے کیوں انتقام لیں گے؟'' میں نے پوچھا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ ان کے بندوں کو جب چاہے اٹھا لیتے ہیں، انہیں ذلیل کر دیتے ہیں، وہ یہ بھی، اگر انہیں ہمارا خوف نہ ہو تو یہ کب کے نور نگر پر بم چلوا چکے ہوتے۔ اور دوسری بات، جو بندہ آپ کے ہاتھ لگ چکا ہے، وہ اس سے بالکل الگ ہے، جو یہ کہانی سنا

رہے ہیں۔"

"مطلب ان کی کہانی اور وہ بندہ دو الگ الگ سمتیں ہیں۔" میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔

"بالکل، جیسے ہی وہ پکڑا گیا، یہاں ایک دوسری کہانی بیان کی جانے لگی۔ تاکہ آپ ان کی بات مان کر چل پڑیں اور یہ کسی بھی جگہ......" اس نے باقی بات ادھوری چھوڑ دی، جسے میں سمجھ گیا۔

"ان تین سیاست دانوں کا، میرے علاقے کے ظہور مرزا کا، یہ سب کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی، جو یہ سیاست دان کرتے ہیں۔ باہر کے ممالک میں، غنڈوں میں، عالمی تنظیموں سے بنا کر رکھتے ہیں، کسی بھی وقت کوئی کام آسکتا ہے، روپیہ پیسہ الگ ملتا ہے، کاروبار اور دوسری مراعات الگ ملتی ہیں۔ جیسے کوئی کسی کو دانہ ڈالتا ہے، ویسے یہ چُگ لیتے ہیں۔" اس نے چند لفظوں میں مجھے سمجھایا

"ہاں اگر ان کی توجہ اپنا مال بنانے کی طرف نہ ہو تو یہ عوام خوشحال نہ ہو جائے۔ پتہ ہے کہ ہر سال سیلاب آتا ہے، اس کا سدباب نہیں کر سکے، خیر آپ کے خیال میں ایسا کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جو ماورائے عدالت قتل ہوتے ہیں نا، یہ مجرم بھلے ہوں یا نہ ہوں، بحث اس سے نہیں، لیکن یہ کہیں نہ کہیں ان سیاست دانوں کے ساتھ رہے ہوتے ہیں، ان کی پشت پناہی کر چکے ہوتے ہیں، ان کے لیے معمولی غنڈہ گردی سے قتل تک کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ اُن کے اور وہ اِن کے راز جانتے ہیں، ایسے لوگ جب بھی بیکار تصور کیے جانے لگے، انہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ فورسز تک میں یہ بات ہے، خیر اسے چھوڑیں یہ لمبی کہانیاں ہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے یہ ذکر اسے دکھ دے رہا ہے۔

"آپ بتائیں اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے اس سے مشورہ لیا

"آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے، میں نے آپ کو بتانا تھا، باقی آپ میرا نمبر محفوظ کر لیں، یہ ایک محفوظ نمبر ہے، جب چاہئے بات کر سکتے ہیں۔" اس نے کہا اور اٹھنے کے لیے پَر تولنے لگا تو میں بھی اٹھ گیا۔ اب وہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم اٹھے اور وہاں سے چل دیئے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی جسپال کو فون کیا۔ اسے کہا کہ میں سرمد کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ جے لکشمن کو لے کر آ جاؤ، وہیں اس سے بات کریں گے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ کافی الجھ گیا ہے۔

میں سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنا ٹھکانہ شاندار بنایا ہوا تھا، سیکورٹی کے اعتبار سے وہ کافی مضبوط تھا۔ دو کنال میں دو منزلہ گھر تھا، جس کے نیچے تہہ خانہ تھا۔ دوسری منزل پر وہ مجھے ایک شاندار بیڈ روم میں چھوڑ کر خود جسپال کو لینے چلا گیا۔ میں جہازی سائز کے بیڈ پر پڑا سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ ایسے میں اروند سنگھ کا فون آ گیا۔

"وہ شخص درست کہہ رہا ہے۔ اس کا ڈیپارٹمنٹ ہماری غلطی کی وجہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ غلطی چندی گڑھ سے ہوئی ہے۔ اور وہ رونیت کور سے انجانے میں ہوئی۔ اس نے امیت سنگھ کو پکڑنے کے چکر میں، اس کے ساتھ کھیل کھیلتے ہوئے، خود کو ہیک کروا بیٹھی ہے۔ وہیں سے ویرتا کا پتہ چلا ہے۔"

"مطلب، ایک معمولی سی غلطی نے ہمارے بارے میں سب کچھ کھول کے رکھ دیا۔"

"سب کچھ نہیں، صرف ان کا اندازہ ہے اور اس اندازے کو بالکل پلٹ کر رکھ دینے کی صلاحیت ہے ہم میں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

''وہ تو لوکیشن پر یہاں آیا ہے نا، بالکل ایسے کہ جیسے کوئی کھوجی کتا، سونگھتے ہوئے کسی جگہ پر چلا جائے ،اسے تو یہ خبر نہیں ہوتی نا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اس مقام کا نام کیا ہے، میں اسے بدل کر بھارت ہی میں کوئی جگہ بنا دوں گا۔''

''خیر، جو کرنا ہے کرو، ممکن ہے مجھے اسے کمپیوٹر کی سہولت دینا پڑے، میں ابھی نہیں مان رہا، اسے ہی غلط کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''بس آپ ڈٹے رہو، باقی میرا کام ہے، میرا شمش اور قمر کے ساتھ رابطہ ہے، ابھی کچھ بتاتے ہیں ۔'' اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کچھ دیر خود کو سکون دینے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں دو طرف سے گھر رہا ہوں۔ اپنوں کی طرف سے بھی اور غیروں کی طرف سے بھی۔ ایک نا معلوم حصار میرے گرد بُنا جا رہا ہے، یہ حصار کون بنا رہا ہے، مجھے اس کی ذرا بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی ، جب کافی دیر تک مجھے کچھ نہیں سوجھا تو میں نے سب کچھ دماغ سے نکال دیا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ بیڈ روم میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے جسپال کو فون کیا ۔وہ سرمد ہی کے پاس تھا۔ کچھ دیر بعد میں فریش ہو کر نیچے لاؤنج میں آیا تو جنید ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک سختی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹی وی بند کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''کدھر ہیں سب؟'' میں نے پوچھا۔

''نیچے ہیں اب۔'' اس نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔ میں بھی اس کے ساتھ چلتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہاں ایک ہال تھا۔ ایک طرف جسپال سنگھ کے ساتھ سرمد بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے آگے جے لکشمن کے ساتھ اکبر نے اسکرین پر نگاہیں گاڑی ہوئی تھیں۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے جاتے ہی کہا تو سرمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے رابطے کی سہولت دی ہے، دیکھیں کیا کرتا ہے۔''

میں آگے بڑھا اور جے لکشمن کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''رابطہ ہوا تمہارا اپنے لوگوں سے یا ابھی تک ہمیں ہی الجھا رہے ہو؟''

''آپ لوگ چاہو تو مجھے ابھی قتل کر دو، لیکن آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، کوئی ایسا نہیں کر سکتا، میرا ایک اہم بندے کے ساتھ رابطہ ہو چکا ہے، وہ اپنی تحقیق کر رہے ہیں، جیسے ہی کوئی نتیجہ آتا ہے، میں آپکو بتا دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کرسی گھمائی اور اسکرین پر دیکھنے لگا۔ تبھی اس کی نگاہیں یوں ہو گئیں جیسے حیرت سے پھٹنے لگی ہیں۔ وہ بت بنا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ

عشق نامراد

عمر فاروق ارشد

پتے کب ہوا دیتے ہیں' آپ نے اس حوالے سے محاورے تو ضرور سننے ہوں گے لیکن دیکھا نہیں ہوگا حالانکہ ایسا ہر دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا ہے لیکن کوئی بھی اسے ماننے اور قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

ایک ایسی تحریر جس میں آپ کو ہوا کی سرسراہٹ نہ صرف سنائی دے گی بلکہ دکھائی بھی دے گی۔

''ٹھاہ......ٹھاہ......'' ابھی ابا جی کے دو جوتے میری تشریف پر پڑے تھے کہ میں جست لگا کر چارپائی سے زمین پر منتقل ہو گیا مگر آج ابا بھی پورے خشوع وخضوع کے ساتھ میرا محاسبہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسی لیے بھاری بھرکم جوتے کے ہمراہ کسی مجاہد اعظم کی طرح انہوں نے دوسری بار بھرپور انداز میں جوتا میری پشت پر رسید کر ہی دیا۔ میں نے خود کو بمشکل کراہنے سے روکا اور زقند بھر کر باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

''ہائے...... کیا خواب دیکھ رہا تھا...... میں اور پنکی ایک دوسرے کی کمرے میں بازو حمائل کیے تاج محل کی سیر کر رہے تھے۔ پاس ہی باراک اوباما بھی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بل گیٹس میرے لیے کولڈ ڈرنک تیار کر رہا تھا کہ ابا نے بیچ میں دخل در نامعقولات کر دیا۔''

خیر نہا کر باہر نکلا تو ابا کی اس جلالی کارروائی کا سبب بھی سامنے آ گیا۔ صبح کے دس بج چکے تھے اور بقول ابا کے میرا نامعقول قسم کا دوست ٹونی نا جانے کتنے چکر لگا گیا تھا۔ ہر چکر پر اس نے دروازہ اتنے تباہ کن طریقے سے بجایا تھا کہ ابا کے چودہ طبق روشن ہونے کے بعد فیوز ہونے کے قریب تھے اور اب وہ ٹونی کی اس تخریبی کارروائی کا غصہ مجھ پر اتار رہے تھے۔

''کام چور...... نکما...... دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے اور ایسے دوست بنا رکھے ہیں جو سحر خیزی کے کچھ زیادہ ہی شوقین ہیں اور اپنی اس سحر خیزی کا عملی مظاہرہ ہمارے دروازے پر آ کر کرتے ہیں۔ دیکھ فضلو! آئندہ اگر ٹونی میرے دروازے کے آس پاس بھی دکھائی دیا تو میں اس کو اُبال کر چبا جاؤں گا اور......''

''ابال لیا جائے تو چبانے کی ضرورت نہیں پڑتی ابا حضور!'' میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا اور جھکائی دے کر آنے والے جوتے سے خود کو بچا کر دروازہ کھولا اور گلی میں آ گیا۔

گلی میں کھڑے ہوئے پانی کے عکس میں اپنا حلیہ درست کیا' قمیص کا اکلوتا بٹن بند کرتے ہوئے ٹونی کے گھر کی راہ لی۔

❁......❁......❁
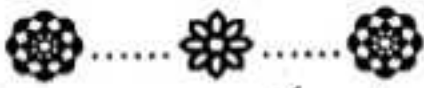
ٹونی اپنے مکان کی منڈیر پر بیٹھا ساتھ والے گھر میں تانکا جھانکی کر رہا تھا اور ساتھ والا گھر کسی اور کا نہیں میری گرل فرینڈ پنکی کا تھا۔ مگر یہاں ایک چھوٹا سا تکنیکی مسئلہ درپیش تھا کہ پنکی ہم

دونوں کی مشترکہ محبوبہ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے ابھی تک ہم دونوں میں سے کسی کو گھاس تو دور کی بات بھوسہ ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ ٹونی اس وقت پوری توجہ اور انہماک سے پنکی کے گھر میں نظریں جمائے بیٹھا تھا کہ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر جھینپ سا گیا۔

''وہ یار فضلو! ادھر فٹ بال چلا گیا ہے' ارے وہی سرخ رنگ کا جو مجھے......'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بس کر ٹونی! اب شرافت سے نیچے آ جا' یہ کیسا کم بخت فٹ بال ہے جو دن میں پچاس بار پنکی کے گھر ہی جاتا ہے پھر تو یہ سالا فٹ بال ہی ہم سے کامیاب عاشق نکلا۔ مجھے اب حسد ہونے لگا ہے تیرے اس فٹ بال سے۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا تو ٹونی بھی مجبوراً سنجیدہ سی شکل بنا کر بیٹھ گیا۔ میں نے کن اکھیوں سے اس کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میری چوٹ نشانے پر لگی ہے لیکن اپنی اس چوٹ کو مزید اثر انگیز بنانے کے لیے میں نے آنکھوں میں نمی بھری اور ہچکی لے کر کہا۔

''خیر' چل چھوڑ بتا کیسے گیا تھا میری طرف تو؟'' ٹونی مجرم بنا بیٹھا رہا۔

''یار فضلو! تیرا دل تو نہیں دکھا؟''

''میرا دل...... میرا دل کیوں دکھے گا؟'' میں نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔

''میں پنکی کے گھر جھانک رہا تھا نا' تجھے اچھا نہیں لگا ہوگا۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور منافقت کی آخری

حدوں کو عبور کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے نہیں ٹونی جگر! میرا کیا حق ہے اس پر' وہ ہم دونوں کی مشترکہ محبوبہ ہے اور ہونے والی مشترکہ بیوی بھی۔''

''مشترکہ بیوی......؟'' ٹونی اچھل پڑا۔ ''کیا مطلب تیرا فضلو؟'' میں چپ رہا۔ میرا مقصد حاصل ہوگیا تھا' ٹونی کے اس طرح اچھلنے سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ شرمندہ ہونے کی اداکاری کررہا ہے۔

''آہ...... کیسا المیہ ہے؟'' میں نے دل میں سوچا۔ ''یہ مجھے بے وقوف بناتا رہتا ہے اور میں اسے' کس کے لیے؟ پنکی کے لیے......پنکی...... پنکی......کیا چیز ہے یہ پنکی؟''

❁......❁......❁

درحقیقت ٹونی کی پنکی کے گھر تانکا جھانکی والی سرگرمیوں نے مجھے ٹونی کی طرف سے خطرے کا سگنل دے دیا تھا اور مجھے اپنی یہ ادھوری داستانِ محبت اب داستانِ غم والم میں بدلتی نظر آرہی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ بدقسمتی حالات سے ٹونی پنکی کا ہمسایہ تھا اور میری نسبت اسے پنکی کے دل میں نقب لگانے کے زیادہ مواقع میسر تھے اور ممکن تھا کہ ٹونی کا عاشقانہ ڈھیٹ پن پنکی کو اس کی طرف مائل کردیتا۔ مجھے لگا کہ اگر میں اسی رفتار سے پنکی کے ساتھ عشق لڑاتا رہا تو لازم بات ہے کہ ان کی شادی میں گاناگاتا پھروں گا ''اچھا...... صلہ دیا تُونے میرے پیار کا' یار نے ہی لوٹ لیا گھر یار کا'' اس سے آگے سوچنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

ٹونی اور پنکی کے بچوں کا بیک وقت ماموں اور چاچو بننے کے خیال نے تو میری جان ہی نکال دی۔ طویل غوروفکر اور مراقبے کے بعد اس درد ناک مسئلے کے دو حل میرے ذہن پر نازل ہوئے۔ پہلا حل خاصا ایموشنل اور اصول عشق کے تقاضوں کے عین مطابق تھا یعنی کہ ٹونی میرے ہاتھوں جام شہادت نوش کرجائے اور عالم بالا میں جاکر صدق دل سے پنکی کا انتظار کرے لیکن یہاں نکتہ اعتراض یہ سامنے آیا کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ٹونی ہی سفرآخرت پر روانہ ہوگا؟

وہ ہٹا کٹا ایسا تھا کہ گینڈے کو بھی شرمادے' مکاری اور چال بازی میں لومڑی بھی اسے سیلوٹ کرنے پر مجبور ہوجائے جبکہ ادھر میری صحت ناتواں کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی نے ذرا گرمجوشی سے ہاتھ ملالیا تو بخار آٹپکتا تھا۔ نزلہ د زکام نے تو ویسے ہی بچپن سے میری ناک پر مستقل مزاجی سے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ اب رہ گئی عقل تو وہ بھی کم کم ہی میرے پاس بھٹکتی تھی جبکہ کسی بھی قسم کے قتل کے لیے طاقت چاہے ہو یا نہ ہو مگر عقل اور اچھی منصوبہ بندی کا ہونا ضروری ہے۔ اس نتیجہ پر آنے کے بعد یہ تجویز میں نے خود ہی رد کردی۔

اب تھا دوسرا حل' جو کہ ذرا قابل قبول اور متوازن قسم کا تھا' علاوہ ازیں اس پر عمل کرنے کی صورت میں میرے جسمانی اعضائے مظلومہ کی سلامتی بھی یقینی تھی اور وہ تھا کہ میں پیر حیرت خان کے پاس جاؤں اور اسے اپنی مشکل سے آگاہ کروں۔ جی ہاں' پیر حیرت خان ہرفن مولا تھا' آستانہ شریف کے علاوہ وہ مفت مشورہ سینٹر بھی چلاتا تھا' فراست کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو وہ پراپرٹی ڈیلر بھی تھا۔ آستانہ شریف کے ساتھ ہی

منسلک ایک ڈبہ نما کمرے میں وہ حکمت کی پریکٹس بھی کرتا تھا۔ حیرت خان کے ڈھیر سارے پراجیکٹس کو عوام الناس نے اپنی سہولت کے پیش نظر مجموعی طور پر ایک ہی نام دے دیا تھا ''حیرت کی دنیا'' اس حیرت کی دنیا میں حیرت خان ایسی حیرت ناکیاں دکھاتا تھا کہ لوگ اس کی فہم وفراست کی داد دیتے نہیں تھکتے تھے اور اسی داد کے نتیجے میں اس کا بوریا بستر کئی مرتبہ گول ہوتے ہوتے بچا مثلاً پچھلے دنوں حیرت خان نے بخار کے مریض ایک لڑکے کو گرم پانی سے نہلا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کیمسٹری کے ایک پوشیدہ اصول کے مطابق جب گرم پانی جسم کی گرمی سے ملتا ہے تو جسم کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور واقعی وہ لڑکا شام تک ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ وہم کی ماری ایک خاتون کو جیسے یہ شک تھا کہ اس پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے' حیرت خان نے مشورہ دیا کہ اپنے سونے کنگن فلاں بند کنویں میں پھینک آئے' آسیب بھاگ جائے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں وہ کنگن وہاں سے حیرت خان کے آستانہ شریف میں منتقل ہو گئے' اسی طرح کے کمالات و عجائبات کی وجہ سے وہ علاقہ بھر میں شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا لیکن یہ شہرت ذرا دوسری قسم کی تھی جس کے متعلق کوئی شاعر کہہ گیا ہے ''بدنام ہوں گے تو کیا نام نہیں ہوگا''

مجھے امید تھی کہ حیرت خان میرے درد عشق کی کوئی نہ کوئی دوا ضرور کرے گا۔

❀ ❀ ❀

مجھے دور سے ہی نظر آ گیا تھا کہ آستانہ شریف پر کافی بھیڑ ہے' لوگ درختوں کی چھاؤں میں قطار بنا کر کھڑے تھے جن میں زیادہ تعداد

عورتوں کی تھی اور زیادہ تر عورتیں وہ تھیں جو اپنے بے لگام شوہروں کو نکیل ڈالنے کے لیے تعویز گنڈا کروانے آئی تھیں۔ کیسی ناانصافی ہے دنیا والو! حقوق نسواں کا ڈھنڈورا تو ہر کوئی پیٹتا ہے مگر حقوق شوہراں کا نام کسی کی زبان پر بھی نہیں آتا۔ بے چارے مظلوم و مقہور شوہر...... دن رات بیویوں کے ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہیں تو بھی شکوہ کناں نہیں ہوتے۔ بیوی کے ہاتھوں ان کی یخنی بن جائے سوپ' مردانگی کے بھرم میں شور ڈالنے کا حق بھی نہیں رہ گیا بے چاروں کے پاس۔

خیر یہ تو انسانی حقوق کے عالمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ ان شوہروں کی فریاد پر کان دھرتے ہوئے ان کے حق میں کوئی قرارداد منظور کروائے۔ میں نے سر جھٹک کر خود کو خدائی فوجدار بننے سے روکا اور خاموشی سے قطار میں کھڑا ہوگیا۔ پیر صاحب اپنے حجرہ خاص میں تشریف فرما تھے' ہر کوئی اپنی باری پر اندر جارہا تھا اور فیض یاب ہوکر واپس آرہا تھا۔ حجرے کے دروازے پر دو سانڈ قسم کے چیلے مستعد کھڑے تھے اور حاجت مندوں کی تلاشی کے بعد انہیں پیر صاحب کے پاس بھیج رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تظم و ضبط اور شرافت کا مظاہرہ کرنے سے میری باری شام کو ہی آئے گی۔

ضروری تھا کہ شارٹ کٹ استعمال کیا جائے' میں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے سامنے کھڑے کچھ لوگوں کو ڈاج دیتے ہوئے کافی آگے چلا گیا۔ پیچھے سے ایک بزرگوار نے مجھے اچھی خاصی توانا اور صحت مند گالی کا تحفہ عنایت کیا لیکن میں نے کان دھرے بغیر مزید ایک رسکی اڑان بھری اور بالکل حجرے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس مرتبہ دو تین صنف نازک میرے دھکوں سے مستفید ہوکر آہ فغاں کرنے میں مصروف تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد حجرے میں سے ایک حاجت مند شرف ملاقات حاصل کرکے باہر آیا میں نے جلدی سے اندر گھسنے کی کوشش کی تو دروازے پر کھڑے ایک چیلے نے میری گردن دبوچ لی۔

''اوئے تربوز کی اولاد! کتنی دور سے قطار توڑ کر آیا ہے تُو......اب کچھ نذرانہ وغیرہ دے گا تو پھر ہی اندر جائے گا۔'' میں نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کی دیچی نما ہتھیلی پر رکھا اور گردن چھڑوا کر حجرے میں داخل ہوگیا۔ حیرت خان سے بالمشافہ یہ میری پہلی ملاقات تھی وہ ایک اونچی گدی پر بیٹھا دروازے کی طرف ہی گھور رہا تھا۔ تیرے مست مست دو نین کے مصداق اس کی آنکھوں میں خمار سا جھلک رہا تھا جو کہ شاید بھنگ یا چرس وغیرہ کا کمال تھا۔

کمرے میں کافور کی پھیکی خوشبو سے ایک بار تو مجھے لگا کہ شاید میں نے غلطی سے کسی قبر وغیرہ میں انٹری ماردی ہے لیکن سامنے جھومتا ہوا حیرت خان اس بات کا ثبوت تھا کہ میں کسی قبر میں نہیں اس کے حجرے میں زندہ سلامت موجود ہوں۔ میں تھوڑا سا جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور دوزانو اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ حیرت خان کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

''بول کاکا جی! کیسے آنا ہوا فقیروں کے پاس؟'' میں نے بولنا چاہا لیکن ایسے کوئی مناسب الفاظ نہیں ملے جن کے ذریعے اپنا مدعا اس کو بتاسکتا چند غیر شناسا سے لفظ میری زبان سے

پھسلے۔

''وہ ...... حضرت جی...... میں ...... ایک لڑکی...... آپکی مدد...... میں......'' حیرت خان نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور ایک گھونسہ میری پیٹھ پر رسید کر دیا۔

''اوئے کاکے! کیا بکری کی طرح میں میں لگا رکھی ہے' سیدھی طرح بکتا کیوں نہیں۔'' حیرت خان کی اس ڈوز سے مجھے کافی افاقہ ہوا اور میں نظریں جھکا کر فر فر بولنے لگا۔

''حضرت جی! ایک لڑکی ہے پنکی میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کو میرا دوست بھی......'' حیرت خان نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے میری بات کاٹی۔

''میں سمجھ گیا ہوں کاکا جی! تمہارا دوست بھی اسی لڑکی کے ساتھ عشق فرمانے کی مقدس جدوجہد کر رہا ہے اور اس دوست کا نام ہے ٹونی......'' مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''حضرت جی آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''ہم کیسے جانتے ہیں؟'' حیرت خان نے فاتحانہ انداز میں مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ''اوئے پتر! ہم عشق حقیقی کی منزل پر یونہی فائز نہیں ہوگئے' آگاہی اور علم و عرفان ہماری میراث ہیں۔ تُو اس بات کو چھوڑ' بس اب یہ بتا مجھ سے کیا چاہتا ہے؟'' میں نے خوامخواہ شرماتے ہوئے کہا۔

''حضرت پنکی کو میری بنا دو اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' حیرت خان نے اپنی دائیں انگلی دانتوں میں دبالی اور بظاہر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نا جانے کیوں مجھے اس کی یہ سنجیدگی اور سوچ بچار مصنوعی سی لگی میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

کچھ دیر بعد اس نے سر اوپر اٹھایا' سرخ سرخ آنکھیں میری طرف مٹکائیں اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''کاکا جی تیرا کام ہو جائے گا' میں تجھ سے نذرانہ بھی نہیں لوں گا۔ آخر تُو نیا نیا مرید ہوا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اگر تم اپنے عشق میں کامیابی چاہتے ہو تو جو میں کہوں گا ویسا ہی کرنا پڑے گا' بولو منظور ہے؟''

''جی منظور ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''شاباش۔'' اس نے آگے جھک کر میری پیٹھ تھپکی اور ایک سرخ کاغذ پر کچھ لکھ کر مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

''یہ کاغذ کسی طرح پہنچا دینا اپنی پنکی کو لیکن اسے کھولنا بالکل بھی مت ورنہ انجام بد کے ذمہ دار تم ہوگے۔ میرے موکل جنات اور ارواح بابرکات تمہارے ساتھ رہیں گے' اب جاؤ۔'' میں نے کاغذ کو جیب میں رکھا اور سلام کرکے حجرے سے باہر آ گیا۔

❁......❁......❁

آستانہ شریف سے گھر آنے تک محتاط اندازے کے مطابق میرے دماغ میں پکنے والی کھچڑی اب نوش فرمائے جانے کے قابل ہو چکی تھی۔ حیرت خان کا عجیب و غریب رویہ' ٹونی کا غائبانہ تعارف اور ہماری لو اسٹوری سے آگاہی' یہ سب مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میرے بتائے بغیر اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ اس سوال نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں' اس بات پر تو میرا موقف ٹھوس تھا کہ حیرت خان فراڈ اور شاعر بازی میں نوبل انعام یافتہ تھا وہ کوئی ولی

کامل یا حقیقی درویش نہیں تھا کہ میں اس کی باتوں کا یقین کر لیتا۔ میں تو اس لیے اس کے پاس گیا تھا کہ وہ اپنے چالباز ذہن کو بروئے کار لاتے ہوئے مجھے کوئی مشورہ دے گا جس سے میں ٹونی کو آسانی کے ساتھ قربانی کا بکرا بنا کر ہانکتے ہوئے قربان گاہ تک لے جاؤں اور اسے پتا تب چلے جب گردن پر چھری چلنا شروع ہو لیکن یہاں تو حیرت خان نے مجھے نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میرے اور ٹونی کے ون سائیڈ عشق کی مکمل معلومات اسے کس نے فراہم کیں اسے کیسے علم ہوا کہ ٹونی میرا رقیب روسیاہ ہے۔ انتہائی سر کھپانے کے بعد کچھ نہ سمجھ میں آیا تو میں نے حیرت خان کا دیا ہوا کاغذ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا جو کہ نفاست سے تہہ کیا ہوا تھا۔

پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ اسے کھول کر دیکھوں لیکن میں چاہتا تھا کہ حیرت خان کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کر کے دیکھا جائے کہ کیا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کاغذ کو صد احترام کے ساتھ بطور تبرک پنکی کے چرنوں میں پہنچا دیا جائے اور پھر دیدۂ تماشا ہو کر دیکھا جائے کہ بوتل سے کون سا جن برآمد ہوتا ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ شام کو یہ کاغذ پنکی تک اس طرح پہنچاؤں گا کہ خود پس منظر میں رہوں۔

شام تک کا وقت میں نے کسی عاشق خوامخواہ کی طرح نہایت بے چینی سے گزارا اور شام کے بعد پنکی کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ گلی سنسان تھی اور میرے ذہن میں جو منصوبہ تھا اس کے لیے یہ سناٹا ضروری تھا۔ میں دبے قدموں گھر کے پچھواڑے آ گیا' یہ احتیاط میں نے اس لیے کی' مجھے ڈر تھا کہ کہیں ٹونی دیکھ نہ لے کیونکہ وہ ہر وقت اپنے عشق صادق کی گہرائیاں ناپنے کے لیے مکان کی منڈیر پر ہی موجود ہوتا تھا۔ پنکی کے گھر کا پچھواڑا ٹونی کی چھت کے بالکل مخالف تھا اور یہاں سے میری کسی بھی سرگرمی کی راہ میں ٹونی کے ٹپکنے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا' میں نے چاروں طرف دیکھنے کے بعد دیوار کی اینٹوں میں پاؤں پھنسائے اور ذرا سا اچھل کر پنکی کے گھر کا جائزہ لیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق پنکی اس وقت پچھواڑے کی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چولہے پر کچھ پکا رہی تھی۔ میں نے کاغذ کے ساتھ چھوٹا سا پتھر باندھ کر اس کی طرف پھینکا اور تیزی سے اتر کر گلی میں آ گیا اب تک کی کارروائی کامیاب رہی تھی۔

میں نے پنکی کی نظروں میں آئے بغیر یہ کام اس لیے کیا تھا کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ حیرت خان نے اس کاغذ میں کس طرح کی فلاسفی کا مظاہرہ کیا ہے' اب اگر کاغذ کی کوئی بات پنکی کو برہم کر دیتی تو مجھے پروا نہیں تھی کیونکہ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن اگر حیرت خان کا ٹوٹکا چل جاتا تو میں کامیابی کا حلوہ دونوں ہاتھوں سے کھانے کے لیے تیار تھا۔

یہ معرکہ سر کرنے کے بعد میں نے اپنی اس الجھن کو دور کرنے کا سوچا جو حیرت خان سے ملاقات کے بعد مسلسل میرے ذہن میں مچل رہی تھی یعنی کہ حیرت خان نے کیسے جان لیا کہ ٹونی اور میں ایک ہی لڑکی پنکی کے امیدوار ہیں اور اسے ٹونی کا نام کیسے معلوم ہوا؟ دوسری طرف مجھے یہ بات کھٹک رہی تھی کہ صبح کی ملاقات کے بعد ٹونی نے پلٹ کر میری خبر تک نہیں لی جبکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ ٹونی

سے ملنے کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔ ٹونی کے دروازے پر دستک کے جواب میں اس کی اماں باہر آئی۔ میں ابھی کھسکنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اندر کھینچ لیا۔

''آجا پتر! ادھر بیٹھ' کبھی اپنی چاچی سے بھی دو چار باتیں کرلیا کر۔''

''چاچی ٹونی کہاں ہے؟'' میں تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''وہ حرام زادہ' لوفر زمانے بھر کا...... دوپہر کا نکلا ہے گھر سے' نومی بتا رہا تھا کہ آستانہ شریف پر گھوم رہا ہے' بس آنے والا ہی ہوگا۔'' چاچی نے ہاتھ میں پکڑے نمک مرچوں والے ڈنڈے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ میرے سر میں دھماکے ہونے لگے۔

''آستانہ شریف پر...... ٹونی کا وہاں کیا کام...... ضرور کوئی گڑبڑ ہے شاید ٹونی بھی حیرت خان کے ذریعے میرا تختہ الٹنے کے چکر میں ہے لیکن......'' میں نے خود کو سنبھالا۔ اتنی جلدی غلط فہمی اچھی نہیں ہوتی' میں جلدی سے اٹھا چاچی کو خدا حافظ کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے آتا ٹونی ٹکرا گیا۔

''اوفضلو...... بڑی بات ہے جگر! خیر تو ہے اس وقت اور اب کدھر جا رہے ہو؟ آؤ بیٹھتے ہیں گھر میں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''یار میں تو کب کا تیرے گھر بیٹھا تھا' تم کہاں سے آرہے ہو؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''میں ابا کے ساتھ ڈیرے پر تھا' کچھ کام تھا ابھی فارغ ہو کر آیا ہوں۔'' اس نے مجھے اندر لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''میں چلتا ہوں ٹونی! بہت دیر ہوگئی ہے۔''

یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اندھیری گلی میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹونی کی کھوجتی ہوئی نظریں میری پشت پر مرکوز ہیں۔

❁......❁......❁

رات کو بستر پر لیٹا تو سوچوں کے جیسے دروازے کھل گئے' ٹونی کے صاف جھوٹ نے بات واضح کردی تھی کہ وہ ضرور حیرت خان کے پاس گیا ہے' یہ گتھی بھی سلجھ گئی کہ حیرت خان کو میرے بتائے بغیر ہماری کہانی کا علم کیسے ہوا' شاید ٹونی مجھ سے پہلے بھی اس سے مل چکا تھا تو پھر حیرت خان نے میری مدد کی حامی کیوں بھری جبکہ ٹونی بھی اس کے ساتھ رابطہ میں تھا۔ کیا وہ ہمیں ڈبل کراس کر رہا تھا یا ٹونی اور مجھ میں سے کسی ایک کے ساتھ مخلص تھا' بات سلجھتے سلجھتے مزید الجھ گئی تھی۔ کیا شے ہے عورت بھی کس طرح چھا جاتی ہے حواس پر۔ بچپن کے لنگوٹی یار نظریں بدل جاتے ہیں' دھوکا دیتے ہیں' غلط بیانی کرتے ہیں' موقع ملے تو دل میں چھرا گھونپ دیتے ہیں۔ ایک ماں کے جنم دیئے ہوئے دو بھائی بھی رقیب بن جاتے ہیں' مدمقابل آتے ہیں' خون بہتا ہے' لہو کے رشتوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ یہی اس دنیا کا سچ ہے' مرد کتنا ہی شہزور کیوں نہ ہو' تھکا ہارا آئے تو عورت کی زلفوں میں آرام پاتا ہے' بانہوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے' سینے سے لگ کر' جذبات میں بہہ کر ایک نیا حوصلہ حاصل کرتا ہے۔

''مولا کیا تخلیق ہے تیری' کیا شاہکار بنا چھوڑا ہے تُو نے۔ تیرے بندے کی پسلی سے نکلی

یہ مخلوق آج تیرے بندوں کے دلوں پر راج کرتی ہے جسے چاہا برباد کیا' جسے چاہا آباد کیا۔ مزاج بگڑا تو کتنے ہی شہنشاہوں کو تاراج کیا' سلطنتوں کو الٹا کر رکھ دیا تو کبھی عاشق کے ہاتھوں تاج محل بنوا کے رکھ دیا۔''

طویل رات انہی سوچوں میں گزر گئی' ہر کروٹ پر دل کو سمجھایا' بہلایا' پگلے چھوڑ کیا کر رہا ہے' وہ لڑکی جس سے تم نے محبت کا اظہار تک نہیں کیا' تیری کچھ نہیں لگتی' کس امید پر بھاگ رہا ہے اس سراب کے پیچھے' کیسی بچکانی سی بات ہے نا کوئی محبت کی شروعات نا بنیاد کسی بات کا مان ہے تجھے لیکن جو دلیلوں سے بہل جائے تاویلوں سے سمجھ جائے' وہ دل تو نہ ہوا اور جو کسی بنیاد کی محتاج ہو' اظہار کے سہارے چلے' ذات پات اور شناخت کی لاٹھی سے آگے بڑھے' جس میں رنگ وروپ کی اہمیت ہو' مال وزر کی فرصت ہو وہ محبت نہیں ہوتی ہوس بن کر سامنے آتی ہے۔ کبھی مال و زر کی ہوس تو کبھی جسم کی...... لیلیٰ کسی رات کی طرح سیاہ تھی لیکن مجنوں کے دل میں چاند بن کر چمک اٹھی۔ دیکھنے کے لیے نظر چاہیے' احساسات وجذبات میں خلوص ہو تو محبوب کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر بھی کوہ نور ہیرا دکھائی دیتا ہے۔ پارس سے بڑھ کر پیارا لگتا ہے' یہی محبت کی معراج ہے۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی گئی' وہ کہتے ہیں نا کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے' صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے میری آنکھ لگی لیکن جلد ہی اٹھ گیا۔ گھر میں معمولات زندگی شروع ہو چکے تھے' ابا جی نے اتنی جلدی اٹھنے پر یوں گھور کر مجھے دیکھا کہ میں نے محسوس کیا شاید آج واقعی میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں۔ اسی شک کو دور کرنے کے لیے میں نے نہانے کے بعد آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو رات جاگنے کا نتیجہ آنکھوں میں سے صاف جھلک رہا تھا جو کہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ اس حلیہ میں شرلاک ہومز مجھے دیکھتا تو یقیناً اپنا پارٹنر بننے کی پیشکش کرتا۔

جب میں گھر سے نکلا تو سورج کی کرنیں چار سو پھیل چکی تھیں' میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا کہ حیرت خان کی تفتیش کر کے رہوں گا کہ وہ کیا ڈرامے بازی کر رہا ہے' میں دھیمی چال چلتا ہوا گاؤں کی گلیوں میں سے گزر کر کھیتوں کی اس پگڈنڈی پر آ گیا جو آستانہ کی طرف جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہاں رش نہیں ہوگا اور میں حیرت خان سے تفصیلی بات کر سکوں گا۔ اسی اثنا میں پیچھے سے ایک تانگہ کھٹ کھٹ کرتا میرے پاس سے گزرا اور میرے دل کی دنیا تہہ و بالا کر گیا۔ تانگہ کی پچھلی سیٹ پر پنکی بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ گود میں تھے اور نظریں ہاتھوں پر۔ میں بس اتنا ہی دیکھ سکا تانگہ ایک موڑ مڑنے کے بعد مکئی کے کھیتوں کی وجہ سے اوجھل ہو گیا۔ پل بھر کے لیے تو جیسے میری دھڑکن رک سی گئی پنکی آستانہ پر کیا لینے جا رہی تھی؟ ادھر حیرت خان کے آستانے کے علاوہ اور کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں پنکی جا سکتی۔

تانگے بھی آستانے تک ہی آتے تھے اس کے بعد کھیتوں کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا' میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور تقریباً دوڑنے لگا جب میں آستانہ پر پہنچا تو وہاں تانگہ کھڑا ہوا تھا' کوچوان موجود تھا لیکن پنکی شاید اندر گئی تھی۔ میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور نظریں حجرے کے داخلی دروازے پر جما دیں۔ میری

حالت عجیب ہو رہی تھی' ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی' طویل انتظار کے بعد پنکی حجرے سے باہر نکلی اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا' وہ تانگے پر بیٹھی اور کوچوان نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ میں دور تک ان کو جاتا دیکھتا رہا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا' کہیں حیرت خان کے اس کاغذ نے اپنا اثر تو نہیں دکھا دیا؟ جو پنکی خود چل کر یہاں آ گئی' یہ تو اب حیرت خان سے مل کر پتا چل سکتا تھا اگر اس نے پنکی کی یہاں آمد مجھ سے چھپائی تو پھر ضرور کچھ گڑبڑ ہو گی۔

اپنی باری پر میں حجرے میں داخل ہو گیا' مجھے لگا کہ حیرت خان مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا ہے لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا' میں حسب عادت اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کہو...... کیا رپورٹ؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''حضرت جی! میں نے کاغذ پنکی تک پہنچا دیا تھا اب آگے کی ہدایات لینے حاضر ہوا ہوں۔'' میں نے حتی الامکان عاجزی سے جواب دیا' وہ مسکراتا رہا پھر خوشگوار لہجے میں بولا۔

''کاکا جی! تیری محبوبہ آئی تھی یہاں۔'' میں نے بھرپور حیرت کا اظہار کیا۔

''حضرت جی کیا پنکی یہاں آئی تھی...... کب؟''

''تجھ سے کچھ دیر پہلے آئی تھی' اپنے عمل نے پورا کام کیا ہے' وہ تیرے متعلق باتیں کرتی رہی ہے۔ باقی تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ میں نے محبت سے حیرت خان کے پاؤں چھوئے' سچی بات ہے کہ حیرت خان کے بارے میں میرے دل سے غلط فہمی دور ہو گئی تھی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نہیں حاصل ہوتی صحت ساتھ دواؤں کے۔

عبادت ایک پیشہ ہے دکان اس کی خلوت ہے۔ راس المال اس کا تقویٰ ہے اور نفع اس کی جنت۔

عدل و انصاف ہر ایک سے خوب ہے اور حاکم سے خوب تر ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مقدمات کا جلد تصفیہ کرنا چاہیے تاکہ دعویٰ کرنے والا دیر کے سبب کہیں اپنے دعویٰ سے مجبوراً دستبردار نہ ہو جائے۔

بدخو کی دوستی سے احتراز لازم ہے کیونکہ وہ اگر بھلائی بھی کرنا چاہتا ہے تو بھی اس سے برائی سرزد ہو جاتی ہے۔

عزت دنیا مال سے ہے اور عزت آخرت اعمال سے ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تعجب ہے اس پر جو جنت پر ایمان رکھتا ہے پھر بھی دنیا کے ساتھ آرام پکڑتا ہے۔

تعجب ہے اس پر جو شیطان کو دشمن سمجھتا ہے لیکن پھر بھی اس کی اطاعت کرتا ہے۔

بعض اوقات جرم معاف کرنا مجرم کو زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔

محب اللہ کو تنہائی محبوب ہوتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عادت پر غالب آنا کمال فضیلت ہے۔

عقل مند اپنے آپ کو پست کر کے بلندی حاصل کرتا ہے اور نادان اپنے آپ کو بڑھا کر ذلت اٹھاتا ہے۔

دوستی ایک خود پیدا کردہ رشتہ ہے۔

گناہوں پر نادم ہونا ان کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا ان کو برباد کر دیتا ہے۔

احمد نواز...... میرپور خاص

لیکن یہ بات کھٹک رہی تھی کہ کل شام ٹونی کیوں اس کے پاس آیا تھا' حیرت خان نے اپنے اگلے فقرے میں یہ کہہ کر میرا دل پوری طرح موہ لیا۔

''کاکا جی! تیرا دوست بھی ہم سے مدد لینے آیا تھا مگر ہم نے بھگا دیا۔''

''حضرت جی آپ مہان ہو' فرشتے ہو فرشتے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے پاؤں چھونے کی سعادت حاصل کی۔ حیرت خان نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

''کاکا بس ایک ماہ کا عمل ہوگا' تجھے ہر ہفتے یہاں سے ایک کاغذ لے جا کر پنکی کو دینا ہے۔ ایک ماہ کے بعد اپنی ماں کو بھیج دینا پنکی کی طرف پھر چاہے اقوام متحدہ بھی ٹانگ پھنسا لے لیکن تیری شادی نہیں رکے گی۔'' اس نے پہلے جیسے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور تہہ کر کے مجھے دے دیا' اس کو بھول کر بھی کھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ کامیابی مقدر بنے گی۔ میں نے ممنون نگاہوں سے حیرت خان کو دیکھا اور شکریہ ادا کر کے نکل آیا۔

واپسی کا سفر سرشاری میں طے ہوا' حیرت خان کے متعلق شکوک و شبہات' خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے مجھ سے کوئی بات چھپائی نہیں تھی۔ خاص طور پر ٹونی کا بینڈ اس نے جس طرح بجایا تھا وہ مجھے پسند آیا تھا۔ اب میں پنکی کا سرتاج بننے والا تھا' مجھے عالم تصور میں ٹونی کی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں اور عجیب و غریب سا تھا حال واضح نظر آیا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی' دن بیت گئے۔ مہینہ پورا ہو گیا تھا اور اس دوران میں نے چار کاغذ پنکی تک پہنچائے تھے۔ اب میں منتظر تھا کہ کب مرشد اعلیٰ کی طرف سے گرین سگنل ملے اور میں اماں کو اپنی ہونے والی زوجہ محترمہ کے ہاں بھیجوں۔

❁......❁......❁

وہ مارچ کی ایک نکھری صبح تھی' جب کسی نے مجھے بُری طرح جھنجوڑ کر نیند سے جگایا۔ لگتا تھا کہ بھونچال آ گیا ہے' ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید صور اسرائیل پھونکا جا چکا ہے۔

''کیا مصیبت ہے' کون ہے؟'' میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی پوچھنا مناسب سمجھا۔

''ابے اٹھ...... سالا کیسے ٹانگیں پسارے سو رہا ہے۔ اُدھر تیری بھابی...... مطلب میری بھابی...... نہیں...... چل جو بھی سمجھ مگر ہم دونوں شادی سے پہلے ہی رنڈوے ہو گئے ہیں۔'' ٹونی کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا چلا جا رہا تھا۔

''فضلو اٹھ جا...... تجھے تیرے بابے کی قسم! بڑی ایمرجنسی ہے اپنی پنکی کی ہاتھوں سے......'' پنکی کے نام نے گویا تھرل پاور سا کام دکھایا اور میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا پنکی کو؟ ٹونی تُو اتنی سویرے......؟''

وہ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھے دھکیل کر گھر سے باہر لے آیا۔

''فضلو بیٹا جی! میں تجھے کچھ دھماکا خیز خبریں دینے آیا ہوں' تیری اور میری ناک تلے ایک عجیب چکر چلتا رہا لیکن ہم ہمیشہ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے رہے۔ یہ دیکھ یہ خط......'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر میرے سامنے کر دیا۔

''ہائے......'' اس وقت جو میری کیفیت تھی اس کی عکاسی کے لیے اردو ادب میں کوئی موثر محاورہ یا ضرب المثل موجود نہیں۔ شاپر کے اندر

وہی حیرت خان کے دیئے ہوئے سرخ رنگ کے کاغذ میرا منہ چڑا رہے تھے۔ ٹونی میری کیفیت سے بے خبر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گلی کے کونے میں لے گیا۔

''فضلو ان کو پڑھ۔'' اس نے راز داری سے وہ شاپر مجھے تھما دیا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے ایک کاغذ کھولا اور پھر کھولتا چلا گیا۔ وہ حیرت خان کے دیئے ہوئے پانچوں کاغذ...... محبت نامے تھے۔ ان کے درمیان نا جانے کب سے خاموش محبت کا سلسلہ قائم تھا اور میرے درمیان میں آنے سے اس خاموش محبت کو زبان مل گئی۔ شاپر میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا' ٹونی نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''فضلو! تیرا رنگ اتنا سفید ہو گیا' کیا ہوا تجھے؟''

''ارمانوں کا خون ہو گیا ٹونی! ارمانوں کا خون...... اور خون کرنے والا میں ہوں تیرے سامنے کھڑا ہے قاتل......''

''میں سمجھا نہیں فضلو!''

''تُو نہیں سمجھے گا۔ چل حیرت خان کے کباڑ خانہ شریف کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ میں نہیں چھوڑوں گا اس کو۔'' میں نے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے ہوئے کہا۔ ٹونی نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

''نہیں میرے یار! اس کا آستانہ شریف بقول تیرے کباڑ خانہ شریف آج بند رہے گا۔ تُو جانتا ہے کیوں؟ کیونکہ آج وہ بارات لے کر آ رہا ہے اپنی پنکی کے گھر؟'' میں پتھرائی ہوئی نظروں سے ٹونی کو دیکھتا رہ گیا۔

❁......❁......❁

تین گھنٹے بعد دوپہر ساڑھے بارہ بجے شہنائیوں اور بینڈ باجے کی گونج میں بارات پنکی کی گلی میں داخل ہوئی۔ میں اور ٹونی گھر کی منڈیر پر بیٹھے عاشقان بے ثمر کی مانند نظارہ کر رہے تھے۔ باراتیوں کے درمیان حیرت خان راجا اندر بنا کھڑا تھا۔ گاؤں کی چند خواتین نے اس بے جوڑ شادی کے خلاف دبے لفظوں میں باتیں کیں مگر میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی اور یہاں تو میاں بیوی کے ساتھ گھر والے بھی راضی تھے' میں نے سرد آہ بھری۔

''یار ٹونی! ایک بات بتا' تجھے وہ خط کہاں سے ملے؟'' ٹونی مسکرایا۔

''وہ سرخ خط...... یار وہ اپنی چھوٹی نازو ہے نا' وہ پنکی کے پاس سپارہ پڑھنے جاتی ہے' اسے اس نے دیئے کہ چولہے میں جلا دو' وہ بچی ہے اسے اچھے لگے تو چھپا کر گھر لے آئی' اِدھر میرے ہاتھ لگ گئے لیکن یار فضلو! یہ خط پنکی تک پہنچاتا کون رہا ہے۔''

''اگر تجھے معلوم ہو جائے کہ کون پہنچاتا رہا تو کیا کرو گے تم؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔ ٹونی نے مکا فضا میں لہرایا۔

''جان نکال دوں گا اس کی...... ہڈی اور پسلی کی تقسیم کر دوں گا۔'' میں نے گھبرا کر نظریں چرا لیں کیونکہ مجھے اپنی جان کی ابھی ضرورت تھی' ہو سکتا ہے کوئی اور پنکی میرا انتظار کر رہی ہو' خیر اب کون سا پنکیوں کا قحط پڑ گیا ہے' کیا کہتے ہیں آپ؟

نیکی کا دیا

ریاض بٹ

زندگی مختلف رنگوں کے امتزاج کا نام ہے۔ ہماری زندگی‘ ہماری روح کی کئی پرتیں ہوتی ہیں جو رنگوں اور لہروں کی طرح ہم پر لپٹی اور چھڑی ہوتی ہیں۔ ان کی پرتوں میں نیکی اور بدی کے جذبے پوشیدہ ہوتے ہیں‘ جو بھی پرت ہماری روح‘ ذہن اور دل پر غالب آتی ہے‘ وہی جذبہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور انسان اس کے رنگ میں رنگ کر اچھے اور برے افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ اسلام کا فلسفہ اور تعلیمات ہی ہیں جو ان جذبوں‘ لہروں اور رنگوں کو کنٹرول کرتی ہے‘ اس کی سوچوں کو اعتدال میں رکھتی ہیں۔

انہی خوابیدہ جذبوں کی روداد‘ ریاض بٹ کی زبانی

میں اللہ لوک بندوں‘ بزرگوں اور پیروں فقیروں کا بہت احترام کرتا ہوں اور ایسے ولی اللہ بندوں (جو ہم سے پردہ کرچکے ہیں) کے مزاروں‘ درگاہوں پر حاضری بھی دیتا ہوں جن کے فیض سے عالم میں اسلام کا نور پھیلا لیکن میں ان ڈبہ پیروں کے سخت خلاف ہوں جو سادہ لوح انسانوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں جن دنوں میں تھانیداری کرتا تھا ان دنوں نہ صرف گاؤں‘ دیہات بلکہ شہروں میں بھی ایسے ڈبہ پیر موجود تھے۔ ان کے متعلق آپ اخبارت میں پڑھتے رہتے ہیں‘ بہرحال اس بار جو تفتیشی کہانی میں آپ کی نذر کررہا ہوں وہ بھی ایک درگاہ کے گرد گھومتی ہے۔ ظاہر ہے میں درگاہ کا نام نہیں بتاسکتا البتہ اتنا بتادیتا ہوں کہ درگاہ ہمارے تھانے کی حدود میں تھی۔

ایک صبح میں تیار ہوکر تھانے میں پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ ایک برقعہ پوش خاتون کافی دیر سے میرا انتظار کررہی ہے۔ ویسے میں اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے برآمدے میں ایک سفید (ٹوپی والے) برقعے میں ملبوس خاتون کو دیکھ کر آرہا تھا‘ کچھ دیر بعد وہی برقعہ پوش خاتون میرے سامنے تھی۔

اس نے چہرے سے برقع اٹھایا تو میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور ساتھ ہی اسے اپنے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھی نہیں بلکہ ٹکرٹکر میری طرف دیکھنے لگی۔

”خاتون ایک گورے رنگ کی فربہ اندام درمیانے قد کی مالک تھی‘ نین نقش تیکھے تھے۔ جوانی میں خوب صورت رہی ہوگی اس وقت وہ پچاس سال کی عمر کے اریب قریب ہوگی۔ جس طرح کسی پرانی عمارت سے رنگ و لیپ اتر گیا ہو‘ یہی حال اس کا تھا۔

خیر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھا کہ وہ جوانی میں کیسی تھی یا اب کیسی نظر آرہی ہے۔ مجھے تو اس سے پوچھنا تھا کہ وہ میرے پاس کیوں آئی ہے؟ کیونکہ تھانے میں بغیر کام یا مقصد کے کوئی نہیں آتا۔ میں نے بات شروع کرنے کی غرض سے خاتون سے کہا۔

”میں نے آپ کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا لیکن آپ ٹکرٹکر میری طرف دیکھ رہی ہیں‘ کیا اس مقصد کے لیے تھانے میں آئی تھیں؟“

”تھانیدار صاحب! آپ نے صرف بیٹھنے کا

اشارہ کیا تھا' بہر حال میں ایک فریاد لے کر آئی ہوں اور کھڑے کھڑے ہی فریاد آپ کے گوش گزار کروں گی۔'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا میں تو اسے کوئی سیدھی سادی گھریلو عورت سمجھا تھا لیکن یہ تو کافی تیز طرار خاتون لگتی تھی۔

''اچھا خاتون! اب اپنی فریاد بیان کر ہی دو' میرا وقت بہت قیمتی ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''آپ ایک انصاف پسند تھانیدار ہیں' مجھ یہی پتا چلا ہے۔'' میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ پٹری پر آ گئی ورنہ لگتا یہی تھا کہ وہ میرا وقت برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ بہر حال میں آپ کو اس کی فریاد اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں ورنہ بات لمبی ہو جائے گی۔

پہلے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایک درگاہ ہمارے تھانے کی حدود میں آتی تھی۔ خاتون نے بتایا کہ پچھلے تین چار ماہ سے ایک باریش شخص درگاہ کے اندر آیا ہوا ہے' وہ وہیں رہتا ہے۔ بظاہر وہ جتنا باریش اور بزرگ لگتا ہے' اندر سے پکا شیطان ہے۔ اس کی وجہ سے ایسی بڑی درگاہ کی حرمت' عزت اور پاکیزگی پر حرف آ رہا ہے۔ آپ اسے نکال باہر کریں' ورنہ پتا نہیں کیا ہو جائے۔'' یہ میں نے آپ کو مختصر بتایا ہے۔ میں نے خاتون کو رخصت کر دیا اور سپاہی نواز اور کانسٹیبل وزیر کو اپنے کمرے میں بلایا۔

وہ مجھے سلیوٹ کر کے اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے دو جن حکم کے منتظر ہوں۔ مجھے ان کے انداز پر ہنسی آ گئی لیکن میں نے فی الفور اپنی ہنسی میں بریک لگایا کیونکہ معاملہ غور طلب تھا اور اگر جس طرح خاتون بتا کر گئی تھی کہ اس بزرگ نے اس سے اپنی شیطانی خواہش کا اظہار کیا تھا تو معاملہ بہت زیادہ

حساس ہو جاتا تھا۔
پھر میں نے نپے تلے الفاظ میں ان سے تمام حالات بیان کیے تھے ان کے چہرے پر بھی غصے کے تاثرات ابھر آئے تھے۔
"سر! اس کو پکڑ کر لے آئیں؟" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔
"نہیں۔" میں نے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔
"پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم درگاہ میں جاتے رہتے ہو؟"
"بالکل سر! میں تو ہر جمعرات کو جاتا ہوں۔" کانسٹیبل وزیر نے جلدی سے کہا اور سوالیہ نگاہوں سے سپاہی نواز کی طرف دیکھنے لگا۔
"سر! میں ہر جمعرات کو تو نہیں جاتا البتہ مہینے میں ایک دو جمعرات کو ضرور جاتا ہوں۔"
"اچھا۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم وردی میں جاتے رہتے ہو گے؟"
"نہیں سر! ہم سفید کپڑوں میں جاتے ہیں۔" دونوں نے باری باری بتایا۔
"ٹھیک ہے، کل جمعرات ہے، تم دونوں ان سے ملو اپنا کوئی مسئلہ ان کو بتاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ تم صبح کے وقت جانا، میں شام کو جاؤں گا۔"
وہ "یس سر" کہہ کر چلے گئے اور میں اپنی میز پر پڑے کاغذات کو نمٹانے میں لگ گیا۔
خاتون مجھے بتا گئی تھی کہ وہ بزرگ کہاں بیٹھتے ہیں (درگاہ کے اندر) اگلے دن دوپہر کے وقت کانسٹیبل وزیر اور سپاہی نواز نے جو رپورٹ نما باتیں مجھے بتائیں ان کا خلاصہ میں اپنے الفاظ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔
انہوں نے بتایا کہ وہ بزرگ واقعی اللہ کے نیک بندے لگتے ہیں، انہوں نے نہایت تحمل سے ہماری باتیں اور مسئلے سنے، آخر میں دعا کی کہ خدا بزرگ و برتر تمہاری جائز خواہش پوری کرے آمین۔

"سر! ہم تو ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں، ہم نے کئی دفعہ ان کو دیکھا تھا لیکن ہم کلام ہونے کا شرف پہلی بار حاصل ہوا ہے۔" سپاہی نواز نے کانسٹیبل وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
کانسٹیبل وزیر نے اس کے خیالات کی سر ہلا کر تائید کر دی۔
"ٹھیک ہے، تم جاؤ آج شام میں خود سپاہی انور کو لے کر جاؤں گا۔"
شام کو میں سپاہی انور کو لے کر درگاہ میں پہنچ گیا، درگاہ میں بہت رش تھا۔ مرد و زن کا ایک امڈتا ہوا سیلاب تھا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، بہت سے کبوتر درگاہ کے اوپر اڑ رہے تھے۔ عقیدت مند مزار پر دعا کر رہے تھے، ہم نے بھی پہلے دعا کی پھر ہمارے قدم کشاں کشاں بزرگ کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ سر جھکائے کچھ پڑھ رہے تھے، ہم نے دور سے دیکھا تھا کہ اس وقت وہ اس گوشے میں اکیلے ہیں۔
ہم نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا انہوں نے ہمارے سلام کا دھیمی آواز میں جواب دیا اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ تین چار منٹ بعد انہوں نے سر اٹھایا، قارئین یقین کریں میں بیان نہیں کر سکتا ان کے چہرے پر کتنا نور تھا، کتنی پاکیزگی تھی، کس قدر بزرگی اور دبدبہ تھا۔ میں اور سپاہی مبہوت سے ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔
"کیا بات ہے بیٹو! کھل کر بات کرو۔"
یہاں یہ بات بتا دوں کہ ان کی عمر ساٹھ کا ہندسہ عبور کر چکی تھی اور ہم دونوں ان کے سامنے بچے ہی تھے۔
"بزرگو میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں اور یہ سپاہی ہے۔" پتا نہیں کیوں میں ان کے سامنے جھوٹ نہ بول سکا ورنہ سوچ کر تو ہم کچھ اور آئے تھے۔
"ہوں......" انہوں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز

میں کہا۔ ''میری ایک بات یاد رکھنا کبھی کسی کے ساتھ نا انصافی نہ کرنا' ہمیشہ مظلوم کی مدد کرنا' رشوت کو ہاتھ نہ لگانا۔ کسی بڑے کو' دولت مند کو' غریب پر ترجیح نہ دینا۔''
انہوں نے کچھ باتیں اور بھی کی تھیں' بہر حال ایک بہت اچھا تاثر لے کر ہم تھانے میں واپس آئے۔
راستے میں سپاہی انور نے مجھ سے کہا تھا۔
''سر! مجھے تو وہ عورت شیطان کی محبوبہ لگتی ہے جو ہمیں گمراہ کرنے آئی تھی۔''
اس وقت میں کسی سوچ میں غرق تھا' جونہی سپاہی انور کی بات میرے کان میں پڑی میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا' بہر حال میں نے اسے بات کو دہرانے کا موقع نہیں دیا تھا۔
جب ہم تھانے میں پہنچے تھے تو مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں' میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔
آج کل اے ایس آئی ابرار اور اے ایس آئی شاہد ایک اور کیس پر کام کر رہے تھے۔
اگلے دن میری طبیعت ذرا ناساز تھی' ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ بہر حال چھوٹی موٹی بیماری کی دوائی میں نے کوارٹر میں رکھی ہوئی تھی وہ میں نے کھائی اور دس بجے تھانے میں پہنچ گیا۔
میرے عملے کو میری عادت اور روٹین کا پتا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے میں دیر سے تھانے میں کبھی نہیں گیا تھا۔ خیر یہ تو ایک برسبیل تذکرہ بات تھی۔ آگے کی جو کارروائی میں نے کی وہ میں آپ کو سناتا ہوں۔
ایک بات بتانا میں آپ کو بھول گیا ہوں کہ فریادی خاتون کا پتا میں نے نوٹ کر لیا تھا نام اس نے سکینہ بتایا تھا' میں نے کانسٹیبل وزیر کو بلا کر ایک چٹ پر پتا لکھ کر دیا اور اسے حکم دیا کہ ''خاتون کو بلا کر لے آئے۔'' کانسٹیبل ایک ذہین پولیس اہلکار تھا۔ اسے پتا تھا کہ خاتون کو کیسے اور کیا کہہ کر لے آنا ہے' ساتھ حلیہ بھی لکھ دیا تھا' پتا اسی شہر کا تھا۔ تین گھنٹے بعد کانسٹیبل وزیر نے آ کر بتایا۔
''سر اس پتے پر اس نام اور حلیے کی کوئی خاتون نہیں رہتی۔''
''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ خاتون نے پتا غلط لکھوایا ہو گا اور یہ یقین اس وجہ سے قائم ہوا تھا کہ بزرگ کو دیکھ کر خاتون کی سب باتیں غلط لگنے لگ گئی تھیں۔
''سر! میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' کانسٹیبل وزیر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''اچھا' ٹھیک ہے۔ تم مخبروں کو خاتون کے حلیے کے خاکے بنوا کر دے دو اور خود بھی سپاہی نواز کے ساتھ اِدھر اُدھر ان گن لیتے رہو۔''
ان دنوں کانسٹیبل وزیر کی بیوی اس حالت میں نہیں تھی کہ ہماری مدد کر سکتی' جس طرح کسی ٹیم کا کوئی

باتوں سے خوشبو آئے!

سناٹا جب روح کی گہرائیوں میں اتر جائے تو رونقیں متاثر نہیں کر سکتیں۔
ہمیشگی کا ساتھ تو کسی چیز کو بھی نصیب نہیں ہے ہر شے اپنے اصل سے جدا ہو کر اپنی تلاش کی سفر پر گامزن ہے۔
بعض لوگوں کو ہم چاہتے ہوئے بھی احترام نہیں دے سکتے۔
تعلق' جذبے' محبت' سب اتنی ہی شدت سے جواب چاہتے ہیں جتنی شدت سے وہ کسی دوسرے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انہیں ان کی طلب کے مطابق جواب نہ دیا جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

ماریہ جاوید' کھلابٹ ٹاؤن شپ

اہم کھلاڑی کسی اہم میچ میں نہ کھیل سکے تو جو ٹیم کو مشکلات ہوتی ہیں وہی مشکلات ہمیں بھی تھیں۔ بہرحال نیت صاف ہو تو کئی در کھل جاتے ہیں' ابھی عورت کو ڈھونڈنے کا کام جاری تھا کہ ایک اندوہناک اطلاع مجھ تک کوارٹر میں پہنچی۔

اس وقت رات کے دو بج چکے تھے' ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ یہ عورت کے تھانے میں آنے کے ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ میں بے خبر سو رہا تھا کہ میرے کوارٹر کے باہر والے دروازے پر دستک ہوئی' پہلے شاید مدہم سی دستک تھی یا نیند کی وجہ سے مجھے مدہم لگی تھی۔

بہرحال پھر زوردار آواز میں دستک ہوئی' میں نے پاؤں میں گھر پہننے والی چپل پہنی اور تیز تیز قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے' ریوالور لینا نہیں بھولا تھا۔ دروازے پر شبینہ ڈیوٹی والا ہیڈ کانسٹیبل مراد تھا' یہ کانسٹیبل جونیئر تھا' آج کل شبینہ ڈیوٹی کا انچارج سینئر ہیڈ کانسٹیبل توقیر تھا۔

مراد نے بتایا کہ درگاہ سے ایک ملنگ ٹائپ بندہ آیا تھا تھانے میں' وہ کہہ رہا ہے کہ درگاہ میں جو بزرگ بیٹھتے ہیں وہ خون میں لت پت پڑے ہیں۔ اس کے بعد جس افراتفری اور عجلت میں' میں نے تھانے میں جا کر تیاری کی ہوگی اس کو الفاظ میں ڈھالنا مشکل ہے۔ بہرحال آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم درگاہ میں موجود تھے۔

وہ پُرسکون دور تھا' خودکش دھماکے نہیں ہوتے تھے' دہشت گردی نہیں تھی' خوف و ہراس نہیں تھا اور زیارتوں اور درگاہوں کو تالے نہیں لگائے جاتے تھے۔ ہم نے جوتے اتار کے ایک طرف رکھے اور اس گوشے کی طرف بڑھ گئے' جہاں بزرگ بیٹھتے تھے۔ میرے اندر اور باہر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

میرے ساتھ ملنگ کے علاوہ ہیڈ کانسٹیبل مراد اور سپاہی بشارت بھی تھے (سپاہی بشارت آج کل رات کی ڈیوٹی کر رہا تھا) لیکن مطلوبہ گوشے میں پہنچ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا' وہاں کچھ بھی نہیں تھا' خون کا کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے جھک کر اس جگہ کو سونگھا تو مجھے خون کی مخصوص خوشبو آئی اور ساتھ یہ انکشاف بھی ہوا کہ کسی نے جلدی میں خون صاف کیا ہے۔ میں نے ملنگ کو یہ بات نہیں بتائی بلکہ اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ڈرامہ ہے؟"

"تھانیدار صاحب! میں اس درگاہ میں کھڑے ہو کر قسم کھاتا ہوں کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے......"

"قسمیں کھانے سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوتا' یہاں اور بھی ملنگ ہوتے ہیں' وہ اس وقت کہاں ہیں۔ کیا تم نے تھانے جانے سے پہلے ان میں سے کسی کو بتایا تھا کہ یہاں کیا ہو گیا ہے۔" میں نے بدستور اس کو کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ملنگ تھر تھر کانپنے لگا اور کانپتی ہوئی آواز میں منمنایا۔

"یہ منظر دیکھ کر میری تو مت ہی ماری گئی تھی' میری عقل کے تمام بلب بجھ گئے تھے میں نے کسی کو نہیں بتایا اور تھانے کی طرف دوڑ لگا دی۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ہیڈ کانسٹیبل مراد کی طرف دیکھا' وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔

"سر! یہ ملنگ واقعی ہانپتا ہوا تھانے میں آیا تھا۔ ہم نے اسے سانس درست کرنے کے لیے کہا اور اس کی سانس اعتدال پر آ گئی تو ہم نے اسے پانی پلایا تھا اور......"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منہ پر بولنے سے منع کر دیا' میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ ملنگ سچ بول رہا تھا۔ پھر اس کی رہنمائی میں ہم نے باقی ملنگوں کو جگایا تھا' یہ تعداد میں پانچ تھے۔ وہ بے

خبر سو رہے تھے ان کو کچھ پتا نہیں تھا۔ ہمیں ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکا' اچانک اس ملنگ نے چیخ نما آواز میں کہا (جو تھانے میں گیا تھا)۔

"صافی کہاں ہے؟"

"صافی......صافی......سونے سے پہلے ہمارے ساتھ ہی تھا۔" ملنگ یک زبان بولے۔ میرے کان کھڑے ہوگئے اور ساتھ ہی دماغ بھی روشن ہوگیا میں نے ملنگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ صافی......کیا نام ہوا اور یہ صافی صاحب کب یہاں آئے تھے؟"

"تھانیدار صاحب! صافی نے ہمیں یہی نام بتایا تھا' وہ دو دن پہلے ہم میں آکر شامل ہوا تھا۔" میں اچھل پڑا' مجھے سو فیصد یقین ہونے لگا کہ نیا آنے والا ملنگ ہی اس واردات کا ذمہ دار ہے۔ اس کا اچانک غائب ہوجانا اس یقین کو مزید تقویت دیتا تھا۔ میں نے اس کا حلیہ پوچھا جس سے مجھے کوئی واضح خاکہ نہ ملا' وہ ملنگ بنا ہوا تھا ظاہر ہے حلیہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ میں نے تھانے میں آنے والے ملنگ سے پوچھا۔

"اس کی کوئی نشانی؟" یہ ملنگ مجھے باقیوں کی نسبت تھوڑا عقل مند لگتا تھا۔

"تھانیدار صاحب! اس کا رنگ کالا تھا' سر پر ایک بھی بال نہیں تھا اور یہ قدرتی لگتا تھا یعنی اس کے بال جھڑ چکے تھے' اس نے سر منڈوایا نہیں تھا۔"

"شاباش!" میں نے اس کی تعریف کی۔ "کوئی اور نشانی یاد کرو؟" وہ میری تعریف سے پھول گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

"اس کے دائیں گال پر ایک مسہ یا تل تھا' جو مکئی کے دانے کے برابر تھا۔"

"بہت ہے۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر سب کی طرف تھانیدارانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے انہیں تنبیہ کی کہ جب تک اس کیس کا سر پیر نہیں مل جاتا' انہوں نے کہیں نہیں جانا ہے۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی' مرغوں نے صبح کی اذانیں دینی شروع کردی تھیں۔ صبح کی روشنی ہوتے ہی یہاں سنسنی پھیل جانی تھی' بہرحال ہم نے تو اپنا کام کرنا تھا' جو صبح شروع ہونا تھا اور اے ایس آئی شاہد کو بھی اس کیس پر لگانا تھا اور جب تک یہ کیس حل نہیں ہوجاتا' کسی کانسٹیبل کو اے ایس آئی ابرار کے ساتھ لگانا تھا تاکہ وہ کام بھی ہوتا رہے۔

تھانے پہنچ کر میں نے کانسٹیبل وزیر کی بیرک میں آرام کرنے کا فیصلہ کیا' چند ہی لمحوں بعد صبح ہونے والی تھی۔ مسجدوں میں اذانیں ہوچکی تھیں' میں نے نماز فجر ادا کی اور بزرگوں کے لیے خصوصی دعا کی کہ خدا بزرگ برتر انہیں اپنی آمان میں رکھے' ایسے تیل کے دیئے نہیں بجھنے چاہئیں' کچھ دیر کے بعد میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بزرگ آسمان کی طرف اڑ رہے ہیں' کوئی چیز ان کی طرف بار بار جھپٹتی

انتقالِ پُر ملال

ہمیں نہایت دکھ اور افسوس ہے کہ

محترم حکیم محمد قمر ہاشمی (پاپا)

محمد ہاشم تاجر سُرمہ والے

بہ رضائے الٰہی انتقال فرما گئے ہیں۔

مرحوم ایک نہایت ہی شفیق اور ہمدرد انسان تھے

حکیم محمد قمر ہاشمی کی طب بینائی میں گرانقدر خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر فائز کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ہے اور وہ ہر بار صاف بچ جاتے ہیں پھر میں نے دیکھا کہ وہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہے ہیں پھر میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی کے راستے سورج کی کرنیں بیرک میں آ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر ضروریات سے فراغت حاصل کی اور اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

اے ایس آئی شاہد نے میرے ساتھ ناشتا کیا اور میں نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔

''سر میں ابھی آتا ہوں، ذرا کانسٹیبل وزیر کو اس کی ڈیوٹی سمجھا آؤں۔'' اب کانسٹیبل وزیر کو اے ایس آئی ابرار کے ساتھ پہلے سے ملے ہوئے کیس پر کام کرنا تھا اور اے ایس آئی شاہد نے میرے ساتھ اس تازہ کیس پر کام کرنا تھا۔

شاہد جب دوبارہ میرے پاس آیا تو میں نے اسے خاتون اور ملنگ کے حلیے کاغذ پر بنا کر دیئے اور ان کے اچھے اور واضح سے خاکے بنوا کر کام شروع کرنے کے لیے کہا۔

کانسٹیبل وزیر نے خاتون کے خاکے بنوائے تو تھے لیکن مزہ نہیں آیا تھا شاہد کے ہاتھ میں ایک ماہر آدمی تھا جو ایسے خاکے بناتا تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی اور شام کو جب اے ایس آئی شاہد خاکے لے کر آیا تو میں بھی حیران رہ گیا اور بنانے والے ہاتھوں کی دل کھول کر تعریف کی۔ خدا بزرگ و برتر نے کیسے کیسے ہاتھ بنائے ہیں اور انہیں کیسے کیسے ہنر سے نوازا ہے۔

قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ میری زبان پر آ گیا ''تم اس کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' اب مجھے یقین ہو گیا کہ ہم آدھا سفر کر چکے ہیں اور منزل کی طرف ہمارے قدم بڑھ چکے ہیں۔

تیسرے دن ہمیں ایک حوصلہ افزا خبر ملی اے ایس آئی شاہد ایک ادھیڑ عمر عورت کو تھانے میں لایا۔ عورت کی عمر پچاس کے قریب ہو گی، رنگ گندمی، قد لمبا تھا اور آنکھیں جھکا کر بات کرتی تھی۔

''ہاں بی بی! تم کیا خبر لائی ہو؟''

''تھانیدار صاحب! آپ تو مجھے بھول ہی چکے ہیں، یاد ہے ایک کیس میں، میں نے آپ کے لیے مخبری کی تھی۔'' میں نے غور سے عورت کی طرف دیکھا اور مجھے یاد آ گیا کہ واقعی ایک کیس میں اس عورت نے میرے لیے مخبری کی تھی، اس کا نام بشیراں تھا۔

''بی بی مجھے یاد آ گیا ہے، میں نے تمہیں انعام بھی دیا تھا۔ اگر اس کیس کو حل کرنے میں تم نے پولیس کی مدد کی تو میں تمہیں سرکار سے انعام تو دلواؤں گا ہی لیکن اپنی جیب سے بھی انعام دوں گا۔'' مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ عورت زمین کی تہہ سے بھی راز لا سکتی ہے، ایسی ہی چالاک ہوشیار تھی یہ عورت۔

''تھانیدار صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہے جو آپ نے اس غریب کی مدد کرنے کا کہا ہے، میں ان شاءاللہ آپ کو حیرت انگیز رزلٹ دوں گی۔''

''خیر یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ تم کیا کرتی ہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور اسے بتا دیا کہ معاملہ کیا ہے اور ہمیں کیوں اس ملنگ اور خاتون کی تلاش ہے۔

''تھانے دار صاحب۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''میں بزرگ سے مل چکی ہوں، بہت اللہ لوک بندے ہیں، یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ...... خیر اللہ کی اللہ ہی جانے۔ میں اب انعام کے لالچ میں کام نہیں کروں گی بلکہ دل و جان سے بغیر انعام کے لالچ میں کام کروں گی۔'' وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی، کئی لفظ بار بار اس کی زبان سے پھسل رہے تھے۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اسے ایس آئی اسے خاتون اور ملنگ کے خاکے دکھا چکا ہے، اس نے کام

شروع کرنے کا وعدہ کر کے مجھ سے رخصت حاصل کی لیکن بزرگوں کے متعلق کچھ باتیں بتا گئی وہ چلی گئی اور میرے لیے سوچوں کے در وا کر گئی' ابھی وہ باتیں بتانا مناسب نہیں۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا ابھی ابھی میں چائے پی کر فارغ ہوا تھا اور کچھ دیر ذہن کو بالکل آزاد چھوڑنا چاہتا تھا' اس لیے میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی مگر......ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے سپاہی بشارت کی آواز نے دوبارہ الرٹ کر دیا۔

"سر! ایک صاحب آئے ہیں' کہتے ہیں میں تھانیدار صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بھیج دو۔" میں نے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں بعد ایک تیس سالہ جوان اندر داخل ہوا اس نے درمیانے سائز کی مونچھیں رکھی ہوئی تھی' چہرہ لمبوترا اور رنگ گندمی تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ بولتا گیا اور میں حیرت کے دریا میں غوطہ زن ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ وہ خاموش ہوا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سپاہی بشارت کو میں نے ساتھ لیا اور ہم تھانے سے باہر آ گئے۔

جوان ٹانگے پر آیا تھا ہم سب اس کے ساتھ ٹانگے میں بیٹھ گئے۔ ہم کہاں گئے اور کیوں گئے' اس کو ابھی صیغہ راز میں ہی رہنے دیں۔ البتہ جوان کا نام میں آپ کو بتا دیتا ہوں' جوان کا نام جاوید تھا اس کا ذکر اور کہانی آگے آئے گی۔

یہ کیس میرے لیے عجیب بھی تھا اور حیرت انگیز بھی' اور میں اس کیس کو اپنے یادگار کیسوں میں شمار کرتا ہوں' بہر حال بات آگے بڑھتی ہے۔

تھانے میں جاتے جاتے بشیراں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آئندہ تھانے میں نہیں آئے گی بلکہ رات کو

ایک محفل میں مشفق خواجہ کے سامنے مجروح سلطان پوری کے دو شعر فیض احمد فیض کے شعر کہہ کر سنائے گئے۔ انہوں نے اعتراض کیا اور کہا یہ اشعار فیض کے نہیں ہیں۔ کئی لوگوں نے خواجہ صاحب سے بحث شروع کر دی اور اصرار کیا کہ یہ اشعار فیض ہی کے ہیں۔ خواجہ نے مجروح سلطان پوری کا مجموعہ کلام بحث کرنے والے نقاد کے سامنے رکھ دیا جس میں یہ دونوں شعر موجود تھے۔

نقاد صاحب نے مجروح کے اسی شعری مجموعے کو الٹا پلٹا اور بولے "یہ تو جعلی ایڈیشن ہے۔"

خواجہ صاحب نے کہا "یہ پاکستان میں مجروح کی اجازت سے چھپا ہے اور اس پر پاکستانی ناقد محمد علی صدیقی کا دیباچہ بھی ہے وہ کسی جعلی ایڈیشن پر دیباچہ نہیں لکھ سکتے۔ نقاد صاحب نے جب دیکھا کہ ان کا دعویٰ بے بنیاد ثابت ہو رہا ہے تو انہوں نے کہا محمد علی صدیقی کا دیباچہ بھی تو جعلی ہو سکتا ہے۔

خواجہ صاحب نے کہا "کہیے تو محمد علی صدیقی سے فون پر بات کرا دوں؟ معلوم کر لیں دیباچہ اصلی ہے یا جعلی۔ نقاد صاحب بولے اس کی کیا ضمانت ہے کہ فون پر اصلی محمد علی صدیقی سے بات ہو؟" کوئی جعلی آدمی بھی تو ان کے نام سے بات کر سکتا ہے۔

کوارٹر میں آئے گی اور اس وقت آئے گی جب اسے کامیابی ہو گی۔ چار پانچ دن بعد کی بات ہے اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے ہر طرف خاموشی کا راج تھا نہ جانے مجھے نیند کیوں نہیں آرہی تھی۔

اچانک میرے کوارٹر کے داخلی دروازے پر دستک ہوئی' میں نے سرہانے کے نیچے رکھا سروس ریوالور ہاتھ میں لیا اور دروازے کے پاس جا کر اونچی آواز میں بولا۔

"کون ہے بھئی؟"

"یہ میں ہوں بشیراں! تھانیدار صاحب!"

"اوہ ٹھہرو' میں دروازہ کھولتا ہوں۔" میں نے سروس

ریوالور کو کپڑوں میں چھپایا اور دروازہ کھول دیا‘ وہ تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ میں نے دروازے کے کواڑ صرف بند کیے لیکن ان کو کنڈی نہیں لگائی۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے بشیراں کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تھانیدار صاحب! جلدی کریں‘ میں نے خاتون اور ملنگ کا ٹھکانہ معلوم کرلیا ہے۔“ میں اچھل پڑا اور اس سے تفصیل پوچھنے لگا اس نے واقعی حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں کوارٹر سے نکل رہا تھا‘ بشیراں مجھے سلام کرکے ایک طرف اندھیرے میں گم ہوگئی اور میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا تھانے میں داخل ہوگیا۔ رات کے اس پہر مجھے تھانے میں دیکھ کر سب شبینہ ڈیوٹی والے اہلکار ہائی الرٹ ہوگئے۔ میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہی سب کو بلالیا‘ دو ہیڈ کانسٹیبل‘ ایک کانسٹیبل اور پانچ سپاہی اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔

میں نے سب باتیں ان کے گوش گزار کیں اور ہیڈ کانسٹیبل مراد کو کہا کہ پوری تیاری کے ساتھ جائے‘ ساتھ چار سپاہی لے جائے اور مطلوبہ بندوں کو پکڑ کر لے آئے۔ اس نے کہا۔

”سر! آپ بالکل فکر ہی نہ کریں‘ سب کام آپ کی حسب منشا ہوگا۔“ میں نے اسے خبردار کیا کہ وہاں مقابلے کی نوبت آسکتی ہے‘ اس پارٹی کو روانہ کرکے میں خود بھی الرٹ ہوکر بیٹھ گیا۔ بہر حال تین گھنٹے بعد چھ بندے اور ایک بندی حوالات میں بند تھے۔ ان میں ایک بندہ بڑی بڑی باتیں کررہا تھا اور اپنے تعلقات کا رعب مجھ پر ڈال رہا تھا‘ دھمکیاں دے رہا تھا‘ یہ بڑی مچھلی تھی۔ میں نے جب اس کو دو تین تھپڑ لگائے تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا‘ اس کو پتا چل گیا کہ یہ تھانیدار میری باتوں میں آنے والا نہیں۔

رات تھوڑی سی رہ گئی تھی‘ یہ کیس ایسا تھا کہ مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ بڑی مچھلی اثر ورسوخ والی تھی اس پر پکا ہاتھ ڈالنا تھا۔ میں آرام کرنے کوارٹر میں چلا گیا اور عملے کو ہدایت کرگیا کہ ان پر کڑی نظر رکھنی ہے۔

صبح آٹھ بجے میں تھانے میں تھا‘ اے ایس آئی شاہد آچکا تھا میں نے اسے کہا کہ تمام حوالاتیوں کو لے جائے اور ان کا ریمانڈ لے آئے اور تمام حالات اس کے گوش گزار کردیئے۔ وہ ”ٹھیک ہے سر“ کہہ کر چلا گیا اور میں اس کیس کی کڑیاں ملانے بیٹھ گیا۔ کچھ کڑیاں باقی تھیں جو ملزموں سے حاصل کرنی تھیں اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز نے مجھے خیالات سے باہر آنے پر مجبور کردیا۔

”ہیلو!“ میں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

”خالد!“ دوسری طرف سے ایس پی صاحب تھے۔

”یس سر!“ میں اٹینشن ہوگیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ بات آپ کے گوش گزار کردوں کہ میں انہیں اس کیس کی لحظہ بہ لحظہ کی رپورٹ دیتا رہا تھا صرف آج صبح کی رپورٹ دینا باقی تھی۔ دوسری طرف سے ایس پی صاحب کہہ رہے تھے۔

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”سر! میں نے شاہد کو ملزموں کا ریمانڈ لینے بھیجا ہے۔“

”گڈ‘ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ بڑی مچھلی اثر ورسوخ والی ہے‘ تم کسی بات کو خاطر میں نہ لانا۔“

”ٹھیک ہے سر!“ میں نے اتنا ہی کہا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا‘ میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ میں نے اپنی پوری سروس میں ایمانداری سے مجرموں کو قانون (عدالت) کے حوالے کیا تھا اور کسی دھمکی‘ اثر ورسوخ کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ بارہ

بجے کے قریب شاہد ریمانڈ لے کر آ گیا۔ سب سے پہلے بڑی مچھلی کو ٹرائل روم کی سیر کروائی گئی وہ پہلی دفعہ پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ تین چار گھنٹوں میں ہی اس کی چیں بول گئی اور اس نے سب کچھ بتا دیا' شام تک باری باری سب سے سب کچھ اگلوا لیا گیا۔

قارئین! آپ نے اب تک بڑے صبر و تحمل سے کہانی پڑھی ہو گی لیکن اب آپ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہے لیکن میں اسے چھلکنے نہیں دوں گا' سب پردے اٹھانے لگا ہوں۔

کہانی شروع ہوئی تھی خاتون کے تھانے میں آنے سے' خاتون نے مجھے اپنا نام سکینہ بتایا تھا لیکن اس کا اصل نام نائلہ تھا۔ اس کی سب باتیں جھوٹ کا پلندہ تھیں' وہ واقعی شیطان کی محبوبہ تھی اور ہمیں بہکانے اور غلط راہ پر لگانے آئی تھی۔ یہ دراصل ڈبہ پیر (الیاس) کی محبوبہ اور دست راست تھی۔ جی ہاں ڈبہ پیر اس وقت حوالات میں بند تھا' اس کو میں نے بڑی مچھلی کہا ہے۔ نائلہ بظاہر رشتے کروائی تھی اس طرح یہ گھروں کے اندر کے راز حاصل کر لیتی تھی۔

لوگوں کے مسئلے اس تک پہنچ جاتے تھے اور یہ ان کو ڈبہ پیر الیاس کے پاس جانے کا مشورہ دیتی تھی لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ان کے سارے راز اور مسئلے ڈبہ پیر تک پہنچا دیتی تھی پھر جب الیاس صاحب جلال میں آ کر ان کو ان کے حالات بتاتے تھے تو وہ بے اختیار ان کے قدموں میں گر جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ چومتے تھے اور ان کو کوئی بہت پہنچا ہوا پیر سمجھنے لگ جاتے تھے۔ اس طرح الیاس کی بہت مشہوری ہوئی تھی اور پیر الیاس صاحب دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔

مجبور عورتوں کو نائلہ پیر تک پہنچاتی تھی اور یہ پیر بلکہ میں تو اسے شیطان کہوں گا ان کی عزتوں سے کھیلتا تھا'

غزل

مجھ سے چھڑا کے دامن، دور جانے والے
میرے خوابوں میں رہ رہ کر ستانے والے
تو نے اپنی پلکوں پہ سجائی ہے پھر سے کہکشاں
میرے آنگن میں یوں اندھیرا کرنے والے
چھوڑ دیتے ہیں دو گام چل کے لوگ
میری راہوں میں یوں کانٹے بچھانے والے
ہمیں دیکھ کر بدل لی ہیں نظریں کسی نے
یہی قسمت کو منظور تھا دل میرا توڑ کے جانے والے
کوئی امید تو ہو مجھ سے ملاقات کی
دیکھ مفلسی میری مجھ سے نگاہیں چرانے والے
ہر کسی سے یوں آس وفا نہ رکھ جاوید
خبر کیا تھی میرے اپنے ہی ہیں گلشن جلانے والے

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ بھی پکڑا جائے گا۔ اسے اپنی ڈبہ پیری اور اثر و رسوخ پر بڑا ناز تھا' حرام کی جمع کی ہوئی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن جب وہ ہمارے ہتھے چڑھا تو اسے آٹے دال کا بھاؤ اچھی طرح معلوم ہو گیا اور اس نے ایک ایک بات سچ سچ بتا دی' اب باقی باتیں میں آپ کو بتاتا ہوں۔

بزرگ واقعی اللہ کے نیک بندے ہیں' بشیراں نے مجھے باقی باتوں کے ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ بزرگ جو لوگ ان سے تعویز وغیرہ دینے کا کہتے تھے تو وہ ان کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ وہ ڈبہ پیروں کے سخت خلاف تھے اور لوگوں کو ان کے جھانسے میں آنے سے منع کرتے تھے' بشیراں نے کہا تھا۔

''تھانیدار صاحب! یقین کریں' میرے اور کئی اور لوگوں کے مسئلے ان کی دعاؤں سے حل ہوتے ہیں۔ وہ آخر میں یہ ضرور کہتے تھے ''خدا بزرگ و برتر تمہاری

نیک خواہشات پوری کرے اور تمہارے دکھ درد دور کرے آمین۔“ نائلہ بھی ایک دن ان کے پاس گئی تھی کیونکہ ساری باتیں اس تک پہنچ چکی تھیں اور اس نے قبلہ پیر (الیاس) تک بھی یہ باتیں پہنچادی تھیں۔

نائلہ نے بزرگوں سے کہا کہ آپ ہمارے پاس آجائیں یعنی پیر الیاس کے پاس۔ انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

”اے نادان عورت! تم بھی ان چکروں سے نکل آؤ ورنہ بہت ذلیل و خوار ہوگی۔“ ذلیل و خوار تو وہ ہوگئی تھی اسے اب جیل جانا تھا۔ بہرحال وہ گناہوں میں ڈوب چکی تھی اس کے منہ چٹ پٹے کھانے لگ چکے تھے۔ وہ شیطان کے شکنجے میں آچکی تھی اس لیے بزرگوں کی باتیں اس کی ناقص عقل میں نہیں آسکتی تھیں۔ اس نے واپس آکر اپنے پیر کو سب باتیں مرچ مصالحہ لگا کر بتائیں اور یہ بھی کہا کہ اگر یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہا تو ہماری طرف کوئی رخ بھی نہیں کرے گا۔

قارئین آگے میں اس کے پیر کو پیر نہیں لکھوں گا بلکہ صرف الیاس لکھوں گا۔

بہرحال الیاس کو اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آیا‘ اس نے نائلہ کو میرے پاس بھیجا‘ اس کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں لیکن...... جب میں نے بزرگوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا (ویسے آپ خود ذہین ہیں‘ میں کوئی ایکشن کیسے لے سکتا تھا) تو الیاس کو بہت غصہ آیا‘ اس نے اپنے خاص بندے پرویز کو ملنگ کے بھیس میں درگاہ میں بھیجا۔ وہ ایک ماہر خنجر زن تھا‘ اس نے رات کے اندھیرے میں اپنا کام کردیا اور وہاں سے فرار ہوکر الیاس کے پاس آگیا۔ الیاس کایاں شخص تھا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اب کمند نائلہ کی طرف پھینکوں گا اور اسے تھانے بلواؤں گا۔ ویسے نائلہ نے اپنی بچت کی اپنی سی کوشش تو کرہی دی تھی جس کو ناکافی سمجھتے ہوئے الیاس نے نائلہ کو بھی اپنے پروں کے نیچے چھپالیا۔ پرویز اس وقت حوالات میں بند تھا‘ باقی چیلے جانتے تھے اور آپ نے یہ اندازہ بھی لگالیا ہوگا کہ نائلہ بھی اس وقت ہماری گرفت میں تھی۔

یہ بھی آپ کو بتادیتا ہوں کہ بشیراں نے کیسے ان کا ٹھکانہ معلوم کیا‘ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ نائلہ ایک چلتا پُرزہ تھی‘ الیاس کے متعلق بشیراں کو پتا تھا جب اس نے نائلہ کے حلیے کی عورت کا ادھر اُدھر سے پتا کیا تو اسے نائلہ کے متعلق سب کچھ پتا چل گیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں الیاس نے تو یہ کارروائی نہیں کروائی کیونکہ وہ یہ بات جان چکی تھی کہ بزرگ ڈبہ پیروں کے سخت خلاف ہیں۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ملنگ (جس کا خاکہ اس کے پاس تھا) اور نائلہ اسے الیاس کے ڈیرے پر مل جائیں گے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ اگر نیت صاف ہو کام نیک ہو تو راستے خود بخود کھلتے جاتے ہیں‘ ان دونوں (نائلہ اور پرویز کو الیاس نے ایک کمرے میں چھپایا ہوا تھا)۔

جب بشیراں الیاس کے ڈیرے پر گئی تو کسی ضرورت کے تحت دونوں کمرے سے باہر آئے ہوئے تھے۔ اس طرح ہمارا کام آسان ہوگیا تھا اور ہم نے سب کو چھاپ لیا تھا یہ تو سب ہوگیا۔ ہم نے سب مجرموں کو قانون کے حوالے کردیا‘ میں نے الیاس اور پرویز پر قتل کا مقدمہ بنایا‘ باقی جرائم اس کے علاوہ تھے۔ نائلہ پر بھی مختلف الزام لگائے‘ خاص طور پر یہ لکھا کہ یہ عورت سیدھی سادی اور مجبور عورتوں کو الیاس تک پہنچاتی تھی۔

اب جاوید کی کہانی رہ جاتی ہے. جی ہاں‘ یہ اسی جوان کی کہانی ہے جو میرے پاس تھانے میں آیا تھا اور میں سپاہی بشارت کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر اس کے ساتھ گیا تھا۔ جاوید ایک بزنس مین تھا‘ اس کا

کاروبار اچھا بھلا چلتے چلتے مندی کی طرف گامزن ہوگیا تھا وہ درگاہ میں حاضری دیتا رہتا تھا' ادھر تقریباً پندرہ بیس دن سے وہ بزرگوں کے پاس بھی جانے لگا تھا بقول اس کے اس کا کاروبار دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا تھا اس رات (جس رات بزرگوں کے ساتھ واردات ہوئی تھی) وہ اپنی کار میں کسی دوسرے شہر سے آ رہا تھا جونہی اس کی کار درگاہ کے پاس پہنچی اس کے پیروں نے کار کے بریک دبا دیئے۔ یہ سب قدرت کی طرف سے تھا' جاوید نے یہ دیکھا کہ اس کی کار درگاہ کے عین سامنے رکی ہے تو وہ کار سے باہر آ گیا اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ درگاہ کے اندر داخل ہوگیا' دعا کرنے کے بعد اس کے قدم بزرگوں کے ٹھکانے کی طرف اٹھنے لگے بقول اس کے یہ سب غیر ارادی طور پر ہو رہا تھا اس نے ملگجے اندھیرے میں دیکھا کہ بزرگوں کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہے اور ان کے اردگرد خون پھیلا ہوا ہے۔ اس نے سگریٹ جلانے والا لائٹر جلا کر دیکھا تو اس پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اس نے بزرگوں کی نبض دیکھی' وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ وہ دوڑا دوڑا گیا اور کار کا پچھلا دروازہ کھول کر آ گیا' پھر اس نے پھرتی سے بزرگوں کو اٹھایا اور پچھلی سیٹ پر ان کو لٹا کر دروازہ بند کر کے اسٹیئرنگ کے سامنے آ گیا تھا پھر اس کی کار آندھی اور طوفان کی طرح اڑ کر وہاں سے دس میل دور ایک اسپتال کے سامنے رکی تھی' یہ اسپتال اس کے ایک قریبی رشتے دار ڈاکٹر فرخ کا تھا۔

اس دن تھانے میں آ کر جاوید نے ساری صورت حال مجھے بتائی تھی' وہ تھانے میں ٹانگے پر آیا تھا۔ اس دن اس کی کار ورکشاپ میں تھی' ٹانگے والے نے ہمیں بسوں کے اڈے پر پہنچایا تھا پھر ہم بس میں بیٹھ کر اسپتال میں گئے تھے اور بزرگوں سے ملے تھے۔

جی ہاں بزرگ زندہ تھے ایک زخم ان کو سینے کے قریب لگا تھا' جب کہ دوسرا پہلو میں تھا۔ قدرت نے انہیں بچانا تھا' اس لیے ماہر خنجر زن کا ہاتھ بھی بہک گیا تھا۔ وہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہوئے تھے اور بروقت اسپتال پہنچ جانے کی وجہ سے ان کو خون لگ گیا تھا' اب دو سوال رہ جاتے ہیں وہ سوال میں نے جاوید سے کیے تھے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ کیا خون درگاہ سے اس نے صاف کیا تھا' اس کا جواب نفی میں تھا اس کا جواب مجھے نہیں ملا تھا' ہوسکتا ہے کسی اور نے صاف کیا ہو؟ اور منظر عام پر نہ آسکا ہو' یا یہ بھی کوئی قدرت کی مصلحت تھی۔

دوسرا سوال کہ وہ اتنے دنوں بعد تھانے میں کیوں آیا تھا اس نے کہا تھا۔

''تھانیدار صاحب! ایک تو میں بزرگوں کے بہتر ہونے کا منتظر تھا' دوسرا مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ مجھے ہی مشتبہ نہ سمجھ لیکن ڈاکٹر فرخ نے کہا تھا کہ تم تھانے ضرور جاؤ۔''

قارئین! وہ تو نیکی کا فرشتہ بن کر درگاہ میں پہنچا تھا' اسے کیسے میں کچھ کہہ سکتا تھا۔ مجھے خوشی اور طمانیت اس بات کی تھی کہ نیکی کا دیا بجھا نہیں تھا' روشنی تھی اور مزید دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے والا تھا' انہیں سیدھی راہ دکھانے والا تھا۔ شیطان اور اس کی محبوبہ گمنامی اور ذلت اور اندھیروں میں گم ہو چکے تھے۔

خونی رشتہ

آغاز الدین

نوجوان اپنے مستقبل کے لیے جو راستہ اختیار کرتے ہیں اس کے پس پشت کچھ ایسے جذبے بھی کار فرما ہوتے ہیں جن کی جڑیں ان کے خاندانی پس منظر سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اس نے بھی اپنے لیے وہی راستہ اختیار کیا تھا جس پر اس کا باپ اس سے پہلے ہی محو سفر تھا۔
مغربی ادب سے انتخاب' ایک خوب صورت اور اچھوتی کہانی۔

گرانٹ کاڈرے نے صبح کو بستر سے اٹھتے ہی کھڑکی سے دیکھا کہ موسم کیسا ہے؟ یہ موسم بہار کی ایک خوبصورت صبح تھی۔

کاڈرے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اچھے موسم میں یہ کام مسئلہ بن جاتا تھا۔ گھرے ہوئے بادل' ابر آلود مطلع' کہر اور بارش وغیرہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ احتجاج کرنے والے تعداد میں کم ہوجاتے تھے جس سے اس کی مشکلات کافی گھٹ جاتی تھیں۔

پھر ایک اور پریشان کن خیال نے سر ابھارا۔ آج کی صبح ناشتے کی میز پر گڑبڑ کا امکان تھا۔ آج کے دن' اس کی بیٹی زندگی کے سفر پر اپنے متعین کردہ راستے پر نکلنے والی تھی جبکہ اس کی ماں اس فیصلے کی شدید مخالف تھی۔ یعنی کینسر کی بیوی ایلین' بیٹی اور ماں کے درمیان تناؤ موجود تھا۔

کاڈرے نے سوچا' مصیبت کبھی اکیلے نہیں آتی جبکہ اچھی چیزیں خشک سالی میں ایک دو بوند کی برسات کی طرح ہوتی ہیں۔

باتھ روم میں شیو کرتے ہوئے کاڈرے ریڈیو سن رہا تھا۔ ''بارہ گھنٹے کے اندر اندر'' براڈ کاسٹر خبریں سنا رہا تھا۔ ''اگر کوئی حکم اوپر سے موصول نہ ہوا تو قتل کے مجرم دونوں میاں بیوی یعنی جیک اور جج ٹیٹم کو اسکرب کی سرکاری جیل میں' بجلی کی کرسی کے ذریعے پھانسی دے دی جائے گی۔'' اس کے بعد اس قتل کا خلاصہ بتایا جانے لگا جسے اب تک لوگ نہ جانے کتنی دفعہ سن چکے تھے۔

کوئی دس سال پہلے' جیک اور جنجر' ہائی اسکول میں تھے اور وہیں ان کے درمیان دوستی ہوئی تھی۔ جیک ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا جبکہ جنجر کے والدین متمول تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوستی جنجر کے گھر والوں کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ گریجویشن کے بعد جنجر کے گھر والوں نے اسے ایک ایسے کالج میں داخلہ لینے کے لیے کہا جو جیک کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ دونوں عاشقوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔

فرار ہونے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ طے یہ کیا گیا کہ جیک جنجر کے والد کی تجوری توڑے۔ اس کام کو کرتے ہوئے جنجر کے باپ نے انہیں دیکھ لیا۔ اس نے جیک کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور اس کی بیوی نے پولیس کو بلالیا۔ اس دوران جیک نے جنجر کے باپ پر چھلانگ لگادی۔ نتیجے میں پستول چل گیا اور گولی جنجر کے باپ کو لگی۔

جیک اور جنجر اس نئی کار میں بھاگ لیے جو جنجر

کو اس کے باپ نے گریجویشن کرنے پر بطور انعام دی تھی۔ کچھ گھنٹے بعد ایک روڈ بلاک ہوا' جیک اور پولیس کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا جس میں' پولیس کا ایک ڈپٹی ہلاک ہوگیا۔ یہ جوڑا بہر حال بچ نکلا۔ راستے میں انہوں نے ایک پادری کو اغوا کیا اور پستول کی نوک پر اسے مجبور کیا کہ وہ ان کا نکاح کرادے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی چھوٹے موٹے اسٹور لوٹے اس میں ایک اسٹور کی کلرک کی جان بھی چلی گئی۔ جیک نے مزاحمت پر اسے گولی ماردی تھی۔

ویسے جنجر کا باپ گولی سے مرا نہ تھا مگر جب ان دونوں عشق زدوں کو گرفتار کیا گیا تو ان پر پولیس ڈپٹی اور اسٹور کلرک کی موت کا الزام لگایا گیا۔ عدالت نے انہیں موت کی سزا سنائی اور اب دس سال بعد' ان کو جو علیحدہ علیحدہ جیلوں میں تھے' پھانسی دی جانے والی تھی۔

شیو کرنے اور نہانے کے بعد' کاڈرے اوپری منزل سے نیچے آیا تاکہ گھریلو مسئلے کا سامنا کرے۔ اس کے بعد اسے اس مسئلے کا بھی سامنا کرنا تھا جو اس کے پیشے سے متعلق تھا۔ کچن میں پہنچتے ہی اس نے بیوی کے چہرے کو دیکھا اور جان گیا کہ صورت حال خاصی خراب ہے۔ اس کی بیوی انڈے تل رہی تھی' اس نے شوہر کی سمت کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ میز پر ٹوسٹ اور کافی موجود تھی مگر صرف دو افراد کے لیے۔

''کیا سوسن چلی گئی؟'' میز کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں' وہ اپنے کپڑے کار میں رکھ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی مجھے بھوک نہیں ہے۔'' انڈے تلنے کے بعد ایلین نے انہیں پلیٹ میں ڈالا اور میز پر رکھ دیا۔ ''دیکھو' یہ ساری خرابی تمہاری وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔'' آخر کار خاموشی توڑی۔

''وہ کیسے؟'' کاڈرے نے پوچھا۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ انجان بننے کی کوشش مت کرو سب تمہاری شہ پر وہ کررہی ہے۔''

''دیکھو تم بلاوجہ الزام دے رہی ہو۔ سوسن اکیس برس کی ہوچکی ہے۔ عاقل اور بالغ ہے۔ وہ اپنے فیصلے خود کررہی ہے۔''

''گرانٹ تم چاہتے تو اسے روک سکتے تھے۔'' اس کی بیوی نے احتجاجاً کہا۔ ''تم نے اسے شروع سے سر چڑھا رکھا ہے۔ تم کہو تو وہ اس بات سے دست بردار ہوکر پھر سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ایک سال بعد اسے ڈگری مل جائے گی۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' کاڈرے نے بے توجہی سے کہا۔ ''تمہاری طرح کسی پرائمری اسکول میں پڑھانے لگے گی۔ اس کے بعد ماسٹر کی ڈگری لے گی اور پھر تمہاری طرح کسی ہائی اسکول میں نوکری کرلے گی یا کسی اسکول میں وائس پرنسپل ہوجائے گی۔ تمہاری طرح؟''

''اس میں کیا برائی ہوگی؟'' اس کی بیوی نے پھر چیلنج کیا۔ وہ ایک خوش شکل عورت تھی اور سنجیدگی سے رہنا پسند کرتی تھی مگر اس وقت اس کا موڈ خراب تھا۔

''اس میں کوئی برائی نہیں۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''لیکن وہ تمہارا فیصلہ تھا یہ سوسن کا فیصلہ ہے' ہر شخص کو حق ہے کہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرے۔''

''کون سا فیصلہ؟'' دروازے سے ایک آواز

ابھری اور ان کی بیٹی اندر آ گئی۔ سوسن اپنی ماں کی طرح خوبصورت نہ تھی بلکہ اس کے نقش باپ سے مشابہ تھے اور اس کے جبڑوں کی بناوٹ سے سختی اور ثابت قدمی جھلکتی تھی۔ ''اچھا اب آپ لوگ بحث کرنا بند کر دیں۔'' اس نے تیسری کرسی سنبھالتے ہوئے کہا پھر اس نے باپ کی پلیٹ سے ایک سلائس اٹھالیا اور کھانے لگی۔

''تم اپنی زندگی برباد کرنے والی ہو۔''

''ہونے دیں۔'' لڑکی نے اطمینان سے کہا۔

''دیکھو اسے۔'' ایلین نے شوہر کو گھورا۔ ''کیا تم اسے منع نہیں کرو گے؟''

''نہیں بھئی۔ آئی ایم سوری۔''

''گڈ۔'' سوسن چہکی۔ اس نے رومال سے منہ صاف کیا اور اٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد فرنٹ ڈور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر باہر کسی کار کی آواز ابھری۔

''ڈیڈی' کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی غلط کام کر رہی ہوں؟'' سوسن نے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' کاڈرے نے کہا۔

''یہ دیکھنا ہوگا' البتہ تم نے فیصلہ کیا ہے تو پھر کوشش کرو' دوسروں کی فکر کی ضرورت نہیں۔''

''شکریہ ڈیڈی۔'' سوسن نے کہا۔ ''اچھا اب میں چلوں گی پہلا دن ہے ذرا جلدی پہنچنا اچھا ہوگا۔''

''اچھا خیال ہے۔''

سوسن کی کار چلی گئی' کاڈرے نے اپنی کافی ختم کی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ جب نوجوانی میں اس نے بھی اپنی زندگی کا راستہ اپنانے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے احساسات کیا تھے۔ اسے امید تھی کہ اس کی بیٹی بھی معاملات کو سنبھال لے گی۔

پیالہ میز پر رکھ کر پھر وہ بھی باہر نکل گیا۔ ذرا دیر بعد اس کی کار گھر سے نکل رہی تھی۔

❀ ......☾...... ❀

اےکرب اسٹیٹ پرنیون جیل میں' جیک ٹائم اپنی کوٹھڑی میں ٹہل رہا تھا۔ رک کر اس نے باہر کھڑے گارڈ سے پوچھا۔ ''کچھ پتا ہے تمہیں' عورتوں کے جیل خانے سے جنجر یہاں کب لائی جائے گی؟''

''مجھے پتا نہیں۔''

''کیا مجھے اس سے ملنے دیا جائے گا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''پھر تمہیں کیا معلوم ہے؟'' جیک نے بھنا کر اسے دیکھا۔

''مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ کل شاید میں تو یہاں ہوں گا مگر تم نہیں ہو گے۔'' گارڈ نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔'' جیک نے گرم لہجے میں کہا۔ ''تمہیں میری موت پر تبصرے کا کوئی حق نہیں۔''

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایک سلاخوں کے ادھر تھا دوسرا سلاخوں کے ادھر۔ ان کی ظاہری حالت میں بہت فرق دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ (موت کے دستے) کا گارڈ کھردرے نقوش کا ایک مضبوط جوان تھا جس کے بال گھنے تھے۔ جیک کا سر گنجا ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی تھی اور جسم کمزور تھا۔ دس سال تک جیل میں رہنے کی وجہ سے وہ مرجھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

جیک اس وقت جس کوٹھڑی میں تھا وہ پھانسی چیمبر سے تیس فٹ کی دوری پر تھی۔ اس میں لوہے

کا ایک بینک بنا ہوا تھا' جس پر ایک نیا میٹریس پڑا ہوا تھا۔ فرش پر ایک ڈبا رکھا ہوا تھا جس میں خطوط کا ایک بنڈل اور کچھ دوسرے قانونی کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ جیک کا وکیل گورنر سے رابطہ کیے ہوئے تھا تاکہ اس کی موت کی سزا کو تبدیل کرا سکے۔ اس کی اپیل زیر غور تھی۔

جیک نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ جنجر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس نے دس سال سے نہیں دیکھا تھا۔ دس سال پہلے وکیل کے کہنے پر اس نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ لڑکی کو اس نے پستول کی نال پر مجبور کیا تھا کہ اس کے ساتھ چلے۔ وکیل نے کہا تھا کہ اس طرح لڑکی موت کی سزا سے بچ جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں تھا کیونکہ مرنے والے اسٹور کلرک کا پستول اس کے پاس سے برآمد ہوا تھا اور شہادتوں سے ثابت ہوا تھا کہ وہ گلے گلے تک جیک کے ساتھ ملوث تھی۔ اس طرح عدالت نے اسے بھی موت کی سزا سنائی تھی۔ اخباروں نے لکھا تھا کہ اگر لڑکی کو بھی بجلی کی کرسی پر بٹھایا گیا تو ملکی تاریخ میں' یہ پچھلے پچاس برسوں میں پہلی عورت ہو گی جو پھانسی چڑھے گی۔

وہ جنجر کے بارے میں سوچ رہا تھا جس سے اس کے تعلقات اس وقت سے تھے جب وہ سترہ برس کا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے حسین لمحات کی یہ قیمت جو وہ چکانے جا رہا تھا...... کچھ زیادہ نہ تھی۔

❀ ...... ☾ ...... ❀

گرانٹ کاڈرے میل بھر دور ہی سے اس مجمع کو دیکھ سکتا تھا جو ہائی وے کے آخری سرے پر واقع اس بنجر وادی میں ہو رہا تھا جہاں اسکرب اسٹیٹ پر نیون جیل واقع تھی۔ یہاں کافی تعداد میں پولیس کاریں بھی موجود تھیں۔ جس وقت وہ جنگلے کے دروازے کے نزدیک پہنچا تو اسے وہ پلے کارڈ دکھائی دینے لگے جو لوگوں نے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ ''جیک اور جنجر کو بچایا جائے۔''

''برقی کرسی ختم کی جائے''

موت کی سزا قتل کے برابر ہے''

وغیرہ' یہاں ایک چھوٹی سی بھیڑ اور بھی تھی جو اس مجمع سے الگ کھڑی تھی۔ ان کے پاس بھی پلے کارڈ تھے اور ان پر کچھ اس طرح کے نعرے لکھے تھے۔

''جیک کو پھانسی دو''

''آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ''

ویسے اس وقت ادھر کوئی ہلڑ بازی نہیں ہو رہی تھی لیکن کاڈرے کو معلوم تھا کہ گھنٹے بھر کے اندر ادھر یہ بھیڑ بڑھنے والی ہے اور پھر ہلڑ بازی بھی یقینی تھی۔

گیٹ پر جونہی کاڈرے کی کار رکی۔ وہاں موجود آفیسر نے اسے سلیوٹ کیا۔ ''مارننگ سر''

''مارننگ۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ ؟''

''نہیں سر۔'' اس نے فوجیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ لوگ حالات سنبھالے ہوئے ہیں۔''

''دوپہر کو میں مزید کمک بلوالوں گا۔'' کاڈرے نے کہا۔ اسی وقت ایک پولیس آفیسر قریب کھڑی پولیس کار سے اتر آیا۔ اس نے کاڈرے کو سلام کیا۔ کاڈرے نے پوچھا۔ ''ہاں لیفٹیننٹ مجمع تو قابو میں ہے نا؟''

''فی الحال تو قابو میں ہے۔'' آفیسر نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں مزید آرمی بلوالوں گا۔''

کاڈرے گیٹ کے اندر اپنی کار لے کر بڑھ گیا۔ وہ ایک اور جنگلے کے دروازے سے گزرا۔ یہ جنگلہ خصوصی تھا اس میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ اندر اس سے کوئی سو گز کی دوری پر جیل کی اونچی دیوار تھی۔ اس کے سامنے ایک وسیع پارکنگ لاٹ موجود تھا۔ ایک طرف ملاقاتیوں کی کار کی جگہ تھی دوسری طرف جیل کے حکام کے لیے جگہ تھی۔ ایک جانب دفاتر بنے ہوئے تھے۔

جن پر لکھا ہوا تھا۔ ''ڈپٹی وارڈن کسٹوڈی؟ اور ڈپٹی وارڈن ایڈمنسٹریشن'' کاڈرے نے اپنی کار درمیانی جگہ میں روک دی۔

کاڈرے کا آفس جیل کی دیوار کے اندر تھا۔ جس وقت وہ اس کی راہداری میں چلا اسے یاد آیا کہ اس سے گزرتے اس کی آدھی عمر بیت چکی ہے۔ چوبیس سال پہلے وہ یہاں ایک ٹرینی آفیسر کی حیثیت سے آیا تھا پھر وہ گیٹ آفیسر بنا تھا پھر سارجنٹ' پھر لیفٹیننٹ' پھر کیپٹن اور اب وہ ڈپٹی وارڈن تھا۔ اسے معلوم تھا وہ وارڈن نہیں بن سکتا۔ یہ عہدہ ایڈمنسٹریشن کا تھا جبکہ وہ صرف قوانین' قواعد' اور سزا کا آدمی تھا۔ ویسے اس کا ارادہ تھا کہ پچپن سال کا ہوتے ہی وہ ریٹائرمنٹ لے لے گا اور کسی پرائیویٹ سیکورٹی فرم میں ملازم ہو جائے گا۔

آفس کے اندر پہنچتے ہی اس کی سیکرٹری نے اس کا استقبال کیا۔

''ہر چیز ٹھیک ہے نا؟'' کاڈرے نے دریافت کیا۔

''بالکل۔'' سیکرٹری ملڈرڈ نے کہا۔

ملڈرڈ بھی کوئی پچاس سال سے اوپر کی عورت تھی اور جلد ہی ریٹائر ہونے والی تھی۔ وہ اس جیل خانے میں برسوں سے ملازمت کر رہی تھی۔ اس کا شوہر اور دو بیٹے' تینوں پولیس فورس میں تھے اور جیل میں ہونے والی قیدیوں کی ایک بغاوت میں یہ تینوں مار دیئے گئے تھے۔ کاڈرے اس وقت اپنی نوکری کے بارہویں سال میں تھا۔ خیال یہی تھا کہ اب ملڈرڈ اس جیل میں نہیں رکے گی مگر اس نے سروس نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ جگہ ایسی ہے جہاں رہ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیاروں کے پاس ہی ہے۔

''کوئی نئی بات؟''

''نہیں سوائے اس کے کہ قیدی جیک کی خواہش ہے کہ جب جنجر یہاں لائی جائے تو اسے اس سے ملنے دیا جائے۔''

''یہ تو پالیسی کے خلاف ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''صرف خونی رشتے داروں کو ملنے کی اجازت ہوتی ہے مگر میاں بیوی کو نہیں اور پھر یہ میاں بیوی بھی کب ہیں' پادری سے زبردستی نکاح کرایا تھا انہوں نے۔''

''ہاں یہ بات ہے۔''

''جنجر کے لیے کیا کیا گیا ہے؟''

''دو آفیسر اسے ویورلی جیل سے یہاں لانے کے لیے جا چکے ہیں۔'' ویورلی جیل عورتوں کی تھی اور اس جگہ سے بیس میل دور تھی۔ ''اوکے''۔ کاڈرے نے کہا۔ ''ذرا پھانسی کے عملے کے ممبروں کو میرے پاس ایک میٹنگ کے لیے بلواؤ۔''

❀.......☾.......❀

کاڈرے کے کمرے میں پھانسی کا عملہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ چار آفیسر تھے۔ مختلف عمروں کے ان سب کے پاس سزا کے شیڈول کی کاپیاں موجود تھیں۔

''اگر کوئی اور آرڈر نہ آیا تو جیک کو چھ بجے شام کو اور جنجر کو سات بجے کرسی پر بٹھا دیا جائے گا۔''
کاڈرے نے بات کا آغاز کیا۔''لڑکی یہاں کے اسپتال میں رکھی جائے گی اور لیفٹیننٹ گیری کے چارج میں ہوگی۔ جیک کی پھانسی کے بعد اسے ڈیتھ واچ ہولڈنگ سیل میں لایا جائے گا۔ فیملی وزٹ کا انتظام اس طرح ہوگا کہ یہ کام دو گھنٹے میں ہو جائے۔ ایک وقت میں صرف دو افراد مل سکیں گے۔''رک کر اس نے کہا۔''وزیٹرز روم میں بڑی میز کے گرد صرف تین کرسیاں ہوں گی۔ وہاں دروازے پر دو گارڈ موجود ہوں گے۔ وزیٹر کو اچھی طرح سرچ کر کے اندر بھیجا جائے گا کوئی سگریٹ نہیں پیئے گا۔ چار بجے کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔ لیفٹیننٹ ہیوس ہی اس کی نگرانی کرے گا۔''اس نے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا۔

لیفٹیننٹ نے سر ہلا دیا۔

''آخری کھانے کا کیا بندوبست ہے؟'' کاڈرے نے پوچھا۔

''اس کا آرڈر نوٹ کر لیا گیا ہے۔ یہ سب چیزیں جیک کو چار بجے پیش کر دی جائیں گی۔ ویورلی سے جنجر کا آرڈر بھی فون پر آچکا ہے۔ اس کی نگرانی لیفٹیننٹ کریمر کے سپرد ہے۔''

لیفٹیننٹ کریمر نے بھی سر ہلایا۔''انتظامات ہو چکے ہیں۔''

''شیو اور غسل؟'' کاڈرے نے پوچھا۔

''پانچ بج کر پندرہ منٹ پر، اس سے قبل ایک حجام اس کے جسم کے بال مونڈے گا۔''

''اس کا پورا سر مونڈا جائے۔'' کاڈرے نے کہا۔''تاکہ الیکٹروڈ سے آگ نہ لگے۔''

''اور جنجر کے بارے میں کیا آرڈر ہے؟'' لیفٹیننٹ نے دریافت کیا۔

''پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر شاور، اطلاع ملی ہے کہ اس کے بدن پر بہت بال ہیں۔ اس کا سر بھی مونڈا جائے گا۔'' کاڈرے نے کہا اس کے ماتحتوں نے اسے گھورا۔ تب اس نے کہا۔''فون پر بتایا گیا ہے کہ لڑکی چاہتی ہے اسے ایک انڈرویئر پہنے رہنے کی اجازت دی جائے۔''

کاڈرے نے پرخیال انداز میں انگلیاں بجائیں۔ اس کے ذہن میں اس کی اپنی بیٹی سوسن ابھر آئی تھی۔

''او کے......'' اس نے کہا۔''مگر یہ بات خفیہ رکھنا۔'' پھر وہ لیفٹیننٹ ہیری کی طرف مڑا۔''اور پادری کا معاملہ؟''

''اس کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے۔''

''گواہ؟''

لیفٹیننٹ کیسی جو اس کا انچارج تھا بولا۔ ''لیونگ روم میں ان کی کرسیاں رکھ دی گئی ہیں۔ ملزمان کے لواحقین، اسی کمرے میں دوسری طرف بیٹھیں گے، اسی طرح میڈیا کے ممبروں کو درمیان میں بٹھایا جائے گا۔''

اسی وقت کمرے میں سیکرٹری نے جھانکا اور کہا۔''وہ لڑکی جنجر آگئی ہے۔''

''ٹھیک ہے دس منٹ بعد میں اس سے ملوں گا۔'' کاڈرے نے کہا پھر وہ آفیسروں سے بولا۔ ''ٹھیک ہے اب آپ لوگ جا سکتے ہیں، بس ہر کام بخیر و خوبی ہونا چاہیے۔ چھ اور سات بجے میں ڈپٹی بوب کے ساتھ موقع پر موجود ہوں گا۔''

اس کے بعد محفل برخواست ہوگئی۔

❀......☾......❀

آفیسرز ڈائننگ روم میں، کاڈرے نے وہ میز

پسند کی جس پر لیفٹیننٹ گیری بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ ایک چوڑے شانوں والی عورت تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا۔ اس کے بدن پر پولیس وردی جچ رہی تھی۔

''تم لڑکی کو آرام سے لے آئیں؟'' کاڈرے نے اس سے دریافت کیا۔

''یس سر۔''

''کیسی ہے وہ؟''

لیفٹیننٹ گیری نے شانے اچکائے۔ ''اچھی ہے' ویسے میرا خیال ہے اسے توقع نہ تھی کہ اسے موت کی سزا ملے گی۔''

''سنو' میں نے اجازت دے دی ہے کہ وہ کوئی زیر جامہ پہن سکتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے' آپ خاصی رعایت دے رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''بس اس کے سر کے بال بھی نہ منڈوانا۔ مگر خدشہ ہے یہ آگ نہ پکڑ لیں۔''

''آپ اس سے کب ملیں گے؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''فیملی وزٹ سے پہلے۔''

ذرا ٹھہر کر گیری مسکرائی اور بولی۔ ''سوسن کے بارے میں بیگم صاحبہ کا ردعمل کیا رہا؟''

''اوہ وہ' بہت برا' وہ تو مجھی کو الزام دے رہی ہے۔''

''مگر آپ نے تو اسے نہیں اکسایا تھا۔''

''ہاں' میں نے مگر اس کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کی تھی۔'' رک کر اس نے گیری سے پوچھا۔

''تم کیا کرتیں؟''

''میں......'' گیری نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے مت پوچھیں۔ میری دو شادیاں ناکام ہو چکی ہیں۔ لوگ مجھے عقل مند نہیں سمجھتے۔''

''اس شخص کا کیا رہا۔ وہ ڈانامی ایجنٹ جس سے تم شادی کرنے والی تھیں؟''

وہ معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ ترقی کر کے کمپنی کا وائس پریذیڈنٹ بن گیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ دوں۔ وہ مجھے گارڈ کی ملازمت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ میں نوکری نہیں چھوڑنا چاہتی۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' کاڈرے نے کہا۔

اسی وقت اس کا ڈپٹی بوب اندر داخل ہوا۔

''جناب وارڈن صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اس نے عجلت میں کہا۔ ''باہر مجمع بڑھ گیا ہے اور ہمارے آدمی انہیں کنٹرول کرنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ ادھر قیدی بھی گڑبڑ کر رہے ہیں۔''

''قیدی؟ وہ کیا کر رہے ہیں؟''

''فی الحال تو شور مچا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... فوری طور پر چھ آدمی مزید گیٹ پر بھیج دو۔ میں وارڈن کے پاس جا رہا ہوں۔''

''میں قیدیوں کو دیکھتی ہوں۔'' لیفٹیننٹ گیری نے کہا۔ پھر تینوں باہر نکل گئے۔

❁......☾......❁

ڈپٹی وارڈن ایڈمنسٹریشن' کاڈرے کا ہم منصب' مارٹن ایڈی وارڈن کے آفس میں پہلے سے موجود تھا۔ یہ آفس دوسری منزل پر تھا۔

''ہر کام شیڈول کے مطابق ہو رہا ہے؟'' وارڈن نے کاڈرے سے دریافت کیا۔

''ابھی تک تو ہو رہا ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔

''یہ مجمع کا کیا معاملہ ہے؟'' اس کے ہم منصب

مارٹن نے کہا۔ ''میں نے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ ٹروپر انچارج میرے لیے گیٹ تک کا راستہ صاف نہیں کرا پا رہا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں مجمع دو گنا ہو گیا ہے۔ وہ پریشان ہیں آخر گواہان اور ملاقاتیوں کو کیسے راستہ مل سکے گا۔''

کاڈرے اٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا' اس نے پردہ ہٹا کر اس دوربین سے دیکھا جو وہاں ہر وقت لٹکی رہتی تھی۔ دور گیٹ کے سامنے جو دو قطار والی روڈ تھی' آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس سے ٹریفک کے لیے راستہ بند ہو گیا تھا۔

''کیا صورت ہے؟'' وارڈن نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ہمارے آدمی کم پڑیں گے ہمیں نیشنل گارڈ بلانے ہوں گے۔ تم کیا کہتے ہو مارٹن؟''

''میں تمہاری بات کی تائید کروں گا۔ دن کے عملے کو باہر بھی جانا ہے اور رات کے عملے کو اندر آنا ہے۔ راستہ تو بہت ضروری ہے ورنہ ہمارے بجٹ پر بہت بوجھ پڑے گا۔'' ڈپٹی وارڈن مارٹن نے سارے مسئلے کو ڈالر میں تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا میں گورنر سے نیشنل گارڈز کے لیے فون کروں؟'' وارڈن نے پوچھا۔

''کرنا ہی ہو گا۔'' کاڈرے نے کہا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ ''میں ROW کی طرف جا رہا ہوں سم نے بتایا ہے وہ لوگ کچھ ہلڑ بازی کر رہے ہیں۔''

''ہاں ضرور جاؤ۔'' وارڈن نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اندر تو امن رکھنا ہی ہو گا۔''

اس کے بعد مارٹن اور کاڈرے دونوں اٹھ گئے۔ راستے میں مارٹن نے پوچھا۔ ''تم جنجر سے ملے؟''

''تھوڑی دیر میں ملوں گا۔''

ایک مقام پر دونوں الگ ہو گئے۔ سامنے ایک اندرونی لان پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف راستے تھے لان میں بہت سے پھول لگے ہوئے تھے۔ اس لان میں کئی قیدی کاموں میں مصروف تھے ان کا انچارج ایک ایسا قیدی تھا جس کی موت کی سزا معاف کر دی گئی تھی۔ کاڈرے کو دیکھ کر وہ ایک کیاری کے پاس سے اٹھ پڑا۔

''مارننگ مسٹر کاڈرے۔'' اس نے کہا۔

''کہو فرینک کیسے ہو؟'' اس نے کہا۔

''گٹھیا نے پریشان کر رکھا ہے۔'' قیدی نے اپنا ایک بازو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کوئی ہلکا کام دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔

''مگر مجھے ان پھولوں سے بڑا انس ہو گیا ہے۔ کیا موت کوٹھری کی طرف جا رہے ہو؟''

''ہاں' ادھر کچھ بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔''

''ابھی تو یہ اور بڑھے گی۔'' قیدی نے سنجیدگی سے کہا۔

کاڈرے نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر وجہ نہیں پوچھی وہ چاہتا تھا کہ قیدی خود بتائے۔ قیدی نے کچھ تذبذب کے بعد کہا۔ ''میں تمہیں بتا رہا ہوں ہوشیار رہنا' ٹھیک ساڑھے چار بجے' جب جیک آخری کھانا کھا چکا ہو گا۔ ایک بڑا ہنگامہ ہو گا وہ ROW کو توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ جنجر کی پھانسی رکوانا چاہتے ہیں۔ اس سے جیک کو خود بہ خود فائدہ پہنچ جائے گا۔''

''اچھی تھیوری ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''مگر کام نہیں کرے گی۔'' اس نے قیدی کا شکریہ

ادا کیا اور کہا۔ ”جب تم کام بدلنا چاہو مجھے بتا دینا میں آرڈر کر دوں گا اور کچھ؟“

”میں اپنی یہ جاب فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“ قیدی نے کہا۔ جیل خانے میں اچھی جاب قیدیوں میں بکتی رہتی تھیں۔

”ٹھیک ہے مگر آدمی معقول ہونا چاہیے۔“ کاڈرے مسکرایا۔

جس وقت کاڈرے جیل کے اس حصے میں پہنچا جہاں موت کی سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے تھے جسے (ڈیتھ رو) کہا جاتا تھا وہ ایک چھوٹے ڈیڈ لاک کی طرف گیا جو مین کاریڈور سے مشابہ تھا۔ یہاں صرف ایک اسٹیل کا دروازہ تھا اور صرف اس کا ایک پٹ ایک وقت میں کھولا جاتا تھا اسے دو آفیسر اٹینڈ کرتے تھے جونہی وہ اندرونی دروازے میں گھوما اسے کچھ شور سنائی دیا۔ ڈے واچ رو کمانڈر لیفٹیننٹ بارٹ نے اس کا استقبال کیا۔

”کیا جیک کی سزا بدل گئی ہے؟“ لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”یہ شخص ایک دردِ سر بن گیا ہے۔“ کمانڈر نے شکایت کی۔

کاڈرے اسے لے کر آفس میں چلا گیا۔ کمانڈر کے آفس میں اس نے آفیسر سے کہا ”دیکھو اس جگہ ساڑھے چار بجے کوئی ہنگامہ ہو سکتا ہے' تیار رہنا۔“

”کیا یہ کوئی درست اطلاع ہے؟“

”بالکل' کاڈرے نے کہا۔ ”تم اپنے فائر ہوز کھول کر رکھ لو۔“

”یہ ایک اور مسئلہ ہوا' میں تو آج ذرا جلدی ڈیوٹی سے جانا چاہتا تھا۔“

”اس کے علاوہ باہر کی بھیڑ بڑھ کر مسئلہ بن رہی ہے۔“

کاڈرے نے کہا۔ ”لہٰذا دن کے عملے کو جانے مت دینا جب تک رات کا عملہ آ نہ جائے۔ ممکن ہے ہمیں قیدیوں کو پھانسی کے بعد بھی دونوں اوقات کے عملے کو روکے رکھنا پڑے۔“

”بہتر ہے۔“ کمانڈر نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اور سنو۔“ کاڈرے نے کہا ”کرس کو فون کر کے معلوم کرو کیا وہ جلدی آ سکتا ہے۔“ لیفٹیننٹ کرس' ڈیتھ رو کا رات کا واچ کمانڈر تھا۔ ”وہ اگر آ جائے تو اسے بتا دینا کہ سہ پہر میں اس جگہ کسی بھی گڑبڑ سے نمٹنے کے لیے وہ پوری طرح چوکس رہے۔“

”ٹھیک ہے سر' شکریہ۔“

جب کاڈرے جانے لگا تو کمانڈر نے پوچھا۔ ”آپ جنجر سے ملے؟“

”وہ ٹی وی پروگرام میں بہت اچھی نظر آتی تھی۔ خیر کیا آپ اجازت دیں گے کہ وہ جیک سے مل لے؟“

”نہیں۔“

”یہ اچھا فیصلہ ہے۔ وہ سور اس کا مستحق نہیں۔“

”میں چار بجے معلومات حاصل کرنے پھر آؤں گا۔“ کاڈرے نے کہا اور چل دیا۔

❀......☾......❀

جنجر ابھی تیس سال کی نہیں تھی۔ اس کے بال سرخ تھے اور مسلسل جیل میں رہنے کی وجہ سے وہ سڈول بھی نہیں رہی تھی۔ وہاں انچارج لیفٹیننٹ گیری کے علاوہ دو اور خواتیاں آفیسر موجود تھیں۔ انہوں نے ڈپٹی وارڈن کاڈرے کا استقبال

کیا۔ گیری نے قیدی عورت سے اس کا تعارف کرایا۔
کاڈرے نے نوٹ کیا کہ لڑکی ذرا بھی نروس نہیں ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''جنجر تمہاری کوئی فرمائش ہو تو بتاؤ۔''
''میں ٹھیک ہوں۔'' سزا یافتہ جنجر نے کہا اور اپنا ایک ہاتھ اس نے کاڈرے کے بازو پر رکھ دیا۔ تینوں عورتوں نے اسے سختی سے گھورا۔ یہ بات قوانین کے خلاف تھی۔ لیفٹیننٹ گیری نے بری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جنجر نے کہا۔ ''میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے بال مونڈے جانے والے ہیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بس انہیں میری فیملی کے ملنے تک نہ کاٹا جائے۔''
''چلو یہ بات ہمیں منظور ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''دیکھو تمہیں کوئی ضرورت ہو یا کچھ کہنا ہے تو لیفٹیننٹ گیری سے بتا دینا۔'' پھر وہ گیری سے بولا۔ ''ضرورت ہو تو تم مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔''
''کیا مجھے جیک سے ملنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ میں اسے الوداع کہنا چاہتی ہوں۔'' قیدی عورت نے کہا۔
کاڈرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں قانون میں اجازت نہیں، ہم نے کوئی رعایت دی تو مستقبل میں مسئلہ کھڑا ہوگا۔''
''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائی اور بولی۔ ''اسے بتا دیا جائے کہ میں نے اسے الوداع کہی ہے۔''
''یہ کام ہو جائے گا۔''
پھر کاڈرے گیری کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے کپڑے کے بارے میں پوچھا جو قیدی عورت پہننے پر مصر تھی۔
''آپ فکر نہ کریں اسے آپ کے کہنے کے مطابق اجازت دے دی گئی ہے۔ وہ جیل کے لباس کے ساتھ اسے بھی پہن لے گی۔''
''ٹھیک ہے۔'' کاڈرے نے ہنکارا بھرا اور سوچتا ہوا چل دیا کہ اس وقت وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کسی آرمی کرنل کا سا کردار ہے۔ جسے میدان جنگ میں صرف فتح و شکست کی فکر ہوتی ہے۔ کسی کے مرنے جینے سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔''

❀......☾......❀

سہ پہر کو دو سے چار بجے کے درمیان دونوں کے اہل خانہ سے ملاقات کا وقت تھا۔
جنجر نے اپنے باپ، ماں اور دو بڑے بھائیوں سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات اسپتال ونگ میں ہوئی جہاں جنجر کو رکھا گیا تھا۔ کاڈرے کو چار افراد سے ایک ساتھ ملنے کی اجازت دی تھی تاکہ یہ معاملہ جلد نمٹ جائے۔ ملاقاتی کمرے میں لمبی سی میز پر وہ بیٹھی تھی اور اس کے دائیں بائیں دو عدد گارڈ عورتیں کھڑی تھیں۔
جیک کے ملاقاتی دوسری طرف ملنے آئے تھے مگر ان کی کوئی خاص تعداد نہ تھی صرف ایک بوڑھا باپ تھا۔ ماں بھی کی مر چکی تھی۔ ایک شادی شدہ بہن تھی وہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی۔

❀......☾......❀

جس وقت ملاقاتی آ رہے تھے نیشنل گارڈ کا ایک دستہ جیل کے دروازے پر آ گیا تھا۔ انہوں نے باہر کا مسئلہ بڑی حد تک فرو کر دیا تھا اور راستہ بھی بنا دیا تھا۔
کاڈرے نے وارڈن کو مطلع کر دیا کہ گیٹ

پر حالات کنٹرول میں ہیں۔ ملاقاتوں کا معاملہ بخیر وخوبی نمٹ گیا تھا۔ البتہ جیک آفیسروں کے ساتھ الجھا ہوا تھا کہ اس کی جنجر سے ملاقات کرائی جائے۔ اسے اس کے وکیل نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا۔ ساتھ میں پادری بھی اس کی مدد کر رہا تھا اور اب اس کے آخری کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔

کاڈرے نے اس موقع پر ڈیتھ رو کے کمانڈر کو فون کیا تو اسے جواب میں لیفٹیننٹ کرس کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ دن کا انچارج چلا گیا ہے۔

''خوب' تم آگئے ہو۔ تمہیں شام کی صورت حال کے بارے میں تمہارے ساتھی نے بتا دیا ہے نا؟''

''یس سر۔''

''اب کیا صورت ہے؟''

''شور وغوغا کی تیاریاں ہو رہی ہیں' سنیے۔''

کمانڈر کرس نے کہا۔ کاڈرے کے کانوں میں ایسی لگی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ لوگ مل کر کچھ گا رہے ہوں۔ پیالیاں اور چمچے وغیرہ سے سلاخیں بجائی جا رہی تھیں۔ درمیان میں نعرے لگ رہے تھے۔

''برقی کرسی ختم کی جائے۔''

''موت کی سزا نہیں چلے گی۔''

''ہنگامہ'' کرس نے دریافت کیا۔

''ہاں۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''ہوز تیار ہیں؟''

''بالکل تیار ہیں۔ کنکشن بھی ہو چکا ہے۔''

''کوئی تیلی بھی جلائی جائے تو آپریشن شروع کر دینا' کوٹھریوں کو پانی سے بھر دینا سمجھے۔ رعایت کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک۔ کیا دن کی شفٹ کو روکنا ہوگا؟''

''ہاں جب تک دوسرا آرڈر نہ دوں رہنے دو۔''

آفس میں کاڈرے کا ڈپٹی اس کا منتظر تھا۔

''میڈیا کو اندر بلا لیا گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ڈلینی انہیں اٹینڈ کر رہا ہے۔'' ڈلینی ان کا پبلک ریلیشن آفیسر تھا۔

''ان پر آدمی لگا دو' کوئی اپنے روم سے ادھر ادھر گھومتا نہ دکھائی دے۔'' کاڈرے نے کہا۔

''جیک کا وکیل کہاں ہے؟''

''وہ گورنر سے رابطے میں لگا ہوا ہے۔''

''گواہ؟''

''آچکے ہیں۔''

''کتنے ہیں؟''

''تیرہ' ایک تو بیوہ ہے اس کے دونوں بچے ہیں۔ مرنے والے ڈپٹی شیرف کے دونوں بھائی بھی ہیں۔ کلرک کی بیوہ بھی ہے' تین بچے ہیں۔ اس کے پوتے پوتیاں بھی ہیں۔''

''ان کی عمریں کیا ہیں؟''

''لڑکا انیس سال کا ہے' لڑکی بیس برس کی۔''

کاڈرے نے سکون کا سانس لیا۔ ان کی عمریں کم ہوتیں تو وہ انہیں پھانسی کا منظر دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

''میڈیا سے کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پریس کے دو آدمی ہیں۔ اسٹیٹ لا انفورس منٹ کے دو آدمی ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کے بھی ایک ایک نمائندے ہیں۔''

''اوکے......'' کاڈرے نے کہا۔ ''چھ بج کر پانچ منٹ پر جنجر کو اسپتال سے نکالا جائے۔ دیکھو جب لاشیں ہٹائی جائیں تو کوئی تصویر کوئی نہیں

بنائے گا۔ جیک کی لاش تابوت میں ڈالتے ہی روانہ کردی جائے۔''

اسی وقت کرس کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ تین کوٹھریوں سے اشیاء جلا کر پھینکی گئی ہیں۔''

''کن کوٹھریوں سے؟''

''گرہی، موڈون اور اسٹپلر۔''

''ان کی کوٹھریوں میں پانی بھردو۔'' کاڈرے نے کہا' یہ تینوں افراد موت کے سزا یافتہ تھے انہوں نے کچھ بچوں کو قتل کیا تھا۔

''سنو، لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کردو کہ اگر کسی اور طرف سے ایسی حرکت ہوئی تو انہیں پانی میں غرق کردیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔''

''کیا میں خود آجاؤں؟''

''نہیں سر، یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' کرس نے کہا۔ ''ضرورت ہوئی تو میں ان پر ہوم اور کانٹو کو چھوڑوں گا۔''

''اچھا آئیڈیا ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ دونوں چھٹے ہوئے غنڈے تھے اور حکم ملتے ہی یہ اپنے ہی ساتھیوں کی عمدگی سے درگت بنا سکتے تھے۔

اس کے بعد اسے لیفٹیننٹ ہیری کی کال ملی اس نے بتایا کہ جیک اپنا آخری کھانا کھا چکا ہے۔ اب اس کے غسل وغیرہ کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اس کا سر مونڈ دیا جائے گا۔ پادری میڈیا والوں کی طرف کانفرنس میں چلا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مطمئن ہو کر کاڈرے نے کہا۔ اس نے لیفٹیننٹ گیری کو کال کیا اور پوچھا۔ ''کیا صورت حال ہے؟''

''سب ٹھیک ہے۔'' جواب ملا۔ ''جنجر نے اپنا آخری کھانا کھالیا ہے' پادری ساتھ ہی بیٹھا ہوا ہے۔''

''بال؟''

''ہمیں اس کے بال کاٹنا ہوں گے سر۔ آپ کہیں تو اسے پہننے کے لیے ایک بیس بال کیپ دے دی جائے۔''

''چلو دے دو۔'' کاڈرے نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں اس کے ساتھ چلوں مگر چیمبر کے عملے سے متعلق نہیں ہوں۔ ادھر بہت سختی ہے۔''

''تم دروازے تک ساتھ چلی جانا۔''

''میرے لوگ مجھے مریض کہتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے تھراپی کی ضرورت ہے۔''

''ایسی بات ہے؟''

''نہیں کیا معلوم مجھے صرف ایک اچھے مرد کی ضرورت ہے۔'' اس نے ایک لمبی سانس لی۔

''اوکے۔'' یہ ایک ذاتی گفتگو تھی لہٰذا کاڈرے نے فون رکھ دیا۔ اسے اس عورت پر افسوس ہو رہا تھا جس کی دو شادیاں ناکام ہوئی تھیں اور ایک اچھا آدمی صرف اس لیے اسے نہیں مل سکا تھا کہ وہ اپنی نوکری نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

اس وقت پانچ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے اس بار پھر لیفٹیننٹ کا فون تھا اس نے بتایا کہ قیدیوں کی شورش ناکام ہوگئی ہے۔ اب سب چپ سادھے بیٹھے ہیں۔

''بہت خوب۔'' کاڈرے نے اس کی تعریف کی۔

جیک ٹائم نے شیو کرلیا تھا' نہالیا تھا' کھانا کھاچکا تھا اور جیل کے صاف کپڑوں میں ملبوس اپنی کوٹھری میں ٹہل رہا تھا۔ وہ اپنے پادری اور وکیل سے باتیں کرر ہا تھا یہ دونوں کمرے سے باہر کھڑے تھے اسی وقت کاڈرے اور سم وہاں پہنچے۔

''جنجر کیسی ہے؟'' انہیں دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔

''وہ ٹھیک ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔ اس نے وکیل سے کہا۔ ''آپ اب الوداع کہیں۔'' وہ موجود نگراں سے بولا۔ ''ڈاکٹر اور بقیہ چیمبر کی ٹیم کو بلاؤ۔''

''ابھی امید باقی ہے۔'' وکیل نے جیک سے کہا۔ ''تمہاری اپیل گورنر کے سامنے ہے۔'' پھر وہ ست قدموں سے رخصت ہوگیا۔ جیک نے اسے ہاتھ ہلا کر رخصت کیا پھر وہ کاڈرے سے بولا۔

''جنجر نے کوئی خط وغیرہ دیا ہے؟''

''نہیں۔''

اسی وقت چھ آدمیوں کی چیمبر ٹیم اندر داخل ہوئی۔ آگے میڈیکل آفیسر تھا۔ اس کے ساتھ ایک سیاہ تھیلا تھا۔

ڈاکٹر پھر کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو گارڈ بھی تھے انہوں نے ملزم کی قمیص کے بٹن کھولے۔ ڈاکٹر نے پھر اس کا معائنہ شروع کیا۔ اس سے فارغ ہو کر گارڈوں کے ساتھ وہ ڈیتھ چیمبر کے داخلے کے دروازے کی طرف چل دیا۔

''تو اس نے کچھ بھی پیغام نہیں دیا؟'' جیک نے ایک بار پھر پوچھا۔ تب کاڈرے نے کہا۔ ''الوداع کہی ہے تمہیں۔''

''بس......؟'' جیک نے اس طرح کہا جیسے بے حد مایوس ہوا ہو۔

کاڈرے نے آفیسر سے کہا۔ ''اس کا ذاتی سامان نکال کر پادری صاحب کے حوالے کردو۔''

''اس نے صرف الوداع کہا......؟'' جیک نے مایوسی سے دہرایا۔

وہاں موجود افراد اسے صرف دیکھتے رہے۔ اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

''جیک چلنے کا وقت ہو چکا ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔

دونوں گارڈوں نے دروازہ کھولا اور اسے باہر نکالا۔ پھر وہ ٹیم کے حصار میں چل دیا۔

کاڈرے کا ڈپٹی سم اپنے ہاتھ میں ریڈیو دبائے ہوئے تھا اس نے اسے کان سے لگالیا۔

وہ اب اس کمرے کی طرف جارہے تھے جہاں پھانسی دی جاتی تھی۔ اس کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ برقی کرسی دور سے نظر آرہی تھی۔ اس کمرے میں ایسی کھڑکی لگی تھی جس سے اندر کا منظر پوری طرح دیکھا جا سکتا تھا۔ کرسی کے ایک ہاتھ پر ایک لمبا سا ٹیوب لٹکا ہوا تھا جو دراصل اسٹیتھ اسکوپ تھا اس کا ایک سرا باہر تک چلا گیا تھا۔

''فون کو پلگ کرو۔'' کاڈرے نے حکم دیا۔ ایک آفیسر نے فلور کیبنٹ کا دروازہ کھولا اور وہاں سے ایک ٹیلی فون نکالا اس نے اسے کیبنٹ کے اوپر سیٹ کردیا اور اس کے اوپر موجود جیک میں پلگ کردیا۔ کاڈرے نے ریسیور اٹھا کر آپریٹر کا بٹن دبا دیا۔

''میں اکزی کیوشن چیمبر سے ڈپٹی وارڈن کاڈرے بول رہا ہوں' تصدیق کرو کہ یہ لائن

سروس میں ہے اور اس کا رابطہ گورنر کے آفس اور فیڈرل اپیل کورٹ سے استوار ہے۔''

ذرا دیر تک وہ منتظر رہا پھر اس نے کہا۔ ''شکریہ۔'' اور ریسیور رکھ دیا۔ فوراً ہی قریبی کھڑا آفیسر فون کے پاس جا رکا اس نے اپنا ایک ہاتھ ریسیور پر رکھ دیا تاکہ فوراً جواب دیا جا سکے۔

تین آفیسر چیمبر میں گئے' انہوں نے نظارے والی کھڑکی کا ایک بلائنڈ اٹھایا۔ کھڑکی کی اس طرف آنکھوں کا ایک سمندر موجود تھا۔ پھر دو آفیسر جیک ٹائم کو لے کر اندر گئے انہوں نے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ایک نے لٹکتے ہوئے اسٹیتھی اسکوپ کو اس کی قمیص سے لگا دیا۔ یہ دونوں پیچھے ہٹے اور باقی تین آفیسروں نے جیک کے سینے' بازو' پیروں کو اسٹریپ کرنا شروع کر دیا۔ کاڈرے بھی چیمبر میں چلا گیا اور دیکھنے لگا۔ اس وقت ایک الیکٹروجیک کے دائیں پیر پر باندھا جا رہا تھا۔ یہ الیکٹروڈ دراصل کرنٹ کی واپسی کا راستہ تھا۔ پہلے وہ مجرم کے بدن میں داخل ہوتا تھا پھر اس سے پلٹتا تھا۔

اسی وقت کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔

کاڈرے تیزی سے ادھر لپکا۔ اسے اپنے عقب میں جیک کی خوشی سے لبریز آواز سنائی دی۔ ''مجھے معلوم تھا میری سزا بدل دی جائے گی' مجھے معلوم تھا کہ میں مروں گا نہیں' کھولو مجھے۔''

کاڈرے نے آفیسر سے فون لے لیا۔ اپنا نام بتایا اور بولا۔ ''یس سر۔'' تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر کہا۔

''یس سر۔'' ایک اور وقفہ ہوا پھر اس نے کہا۔

''میں سمجھ گیا سر' یس سر۔''

کاڈرے نے فون رکھ دیا۔ ہر آنکھ اسے دیکھ رہی تھی۔

جیک کسی پاگل کی طرح دانت نکوسے مسکرا رہا تھا۔

''کھولو مجھے۔'' وہ ایک بار پھر چیخا۔

''چلو اب سر میں بھی الیکٹروڈ لگا دو۔'' کاڈرے نے کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے آفیسر سے کہا۔

''کیا؟'' جیک بڑے زور سے چیخا۔

آفیسر نے جیک کے گھٹے ہوئے سر پر الیکٹروڈ لگا دیا۔

''یہ...... کیا کر رہے ہو؟'' جیک ٹائم حلق کے بل چیخا۔

''تمہیں پروگرام کے مطابق پھانسی دی جائے گی۔''

کاڈرے نے اسے بتایا۔ ''فیڈر بھی منسلک کر دو۔'' اس نے آفیسر سے کہا۔

''مگر یہ کال؟'' ہسٹریائی انداز میں جیک دہاڑا۔

''یہ تمہارے بارے میں نہیں تھی۔'' کاڈرے نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ یہ جنجر کے متعلق تھی۔ گورنر نے اس کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا ہے۔''

''کیا...... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس وقت جیک کے چہرے پر ماسک چڑھا دیا گیا۔

''مگر یہ تو ظلم ہے۔ سارے کام اس نے ہی سوچے تھے ہم دونوں پوری طرح شریک جرم تھے۔''

''اچھا اب رخصت جیک۔'' کاڈرے نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''سنو...... میری سنو۔ ڈپٹی شیرف کو اسی نے گولی ماری تھی۔ میں اس وقت کار چلا رہا تھا۔''
کسی نے اس کی نہیں سنی۔
ایک آفیسر نے آہنی دروازے کو حرکت دی۔
''ایک منٹ...... پلیز ایک منٹ......''
جیک کی آواز دروازے کے بند ہوتے ہی معدوم ہوگئی۔
کاڈرے ان آفیسروں کی طرف مڑا جو تین تھے اور ایک برقی پینل کے سامنے کھڑے تھے جس میں تین بٹن لگے ہوئے تھے جونہی کاڈرے نے اثبات میں سر ہلا کر اشارہ دیا تینوں نے ایک ایک بٹن دبا دیا۔ اس میں سے صرف ایک سوئچ جنریٹر سے جڑا ہوا تھا اور کسی آفیسر کو نہیں معلوم تھا کہ کس کا بٹن کام کرنے والا ہے۔
چیمبر کے اندر چوبیس سو والٹ کی برقی رو جیک ٹائم کے جسم میں داخل ہوئی۔ سر کے ذریعے اور پھر پورے ایک منٹ تک بدن میں رہنے کے بعد وہ ٹخنے کے پاس باہر چلی گئی۔ وہ چار سیکنڈ کے لیے بے ہوش رہا اسے درد کا بھی احساس نہیں ہوا ہوگا تاہم اس کا جسم پھڑکا' مگر وہ بندھا ہوا تھا۔
ایک منٹ بعد ڈاکٹر نے لانبے آلے کی مدد سے اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ''دل اضطراب میں ہے۔'' اس نے دس سیکنڈ بعد کہا۔ ''کرنٹ نے پوری طرح اسے نہیں پکڑا۔''
کاڈرے نے ان تینوں آفیسروں کی سمت دیکھا۔ انہوں نے ایک ساتھ پھر بٹن دبائے اور یہ برقی جھٹکا پھر دہرایا گیا۔
ایک منٹ بعد ڈاکٹر نے پھر سنا اور کہا۔ ''دل کی حرکت بند ہو چکی ہے۔''
''وقت نوٹ کرو۔'' کاڈرے نے حکم دیا۔
''چھ بج کر گیارہ منٹ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔
جب پردہ گرایا جا رہا تھا۔ کاڈرے واپس ہوگیا۔ اس نے اپنے ڈپٹی سے پوچھا۔ ''جنجر کہاں ہے؟''
''لائی جا رہی ہے۔''
''منع کرو۔ اس کی سزا بدل گئی ہے میں وارڈن کے آفس میں جا رہا ہوں۔''

❁......☾......❁

تین گھنٹے بعد کاڈرے کی ملاقات لیفٹیننٹ رافیل گیری سے ہوئی۔ وہ بھی اسی کی طرح اب ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہی تھی۔ وہ ایک ساتھ پارکنگ لاٹ کی طرف چلے۔
''تم نے جنجر کو ویورلی جیل پہنچا دیا؟'' کاڈرے نے پوچھا۔
''ہاں اسے اس کا پرانا کمرا دے دیا گیا ہے۔ بے چاری گھٹے ہوئے سر کے ساتھ بہت عجیب لگ رہی تھی۔ جیک کا کیا رہا؟'' گیری اب بے تکلفی سے اس سے بات کر رہی تھی۔
''مرتے ہوئے چیخ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔'' کاڈرے نے خشک لہجے میں کہا۔
''جب میں جنجر کو لے کر جا رہی تھی تم نے کاش گیٹ پر جمع پبلک کو دیکھا ہوتا۔ یہ دن نہ ان کی فتح کا تھا نہ شکست کا۔ احتجاج کرنے والے اور حمایتی دونوں گروپ جیسے ایک ہوگئے تھے' پھر وہ سب چلے گئے تھے۔
''میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ کل پریس اور میڈیا میں یہ کہانی کس طرح سامنے آئے گی۔'' کاڈرے نے کہا۔ ''غریب لڑکے کو پھانسی اور امیرزادی مجرمہ کو عمر قید...... گورنر نے ایک دستی بم

پھینکا ہے۔ اس میں ہر ایک کے لیے کچھ ہے۔ مگر کسی کو کچھ نہیں ملا ہے۔ اب سب یہی سوچیں گے کہ انہوں نے کہاں غلطی کی ہے۔ یہ غلطی جنجر کو بچا کر ہوئی ہے یا جیک کو مروا کر۔''

''میری ایک دادی ہیں جو ایک جانب سے انڈین ہیں۔'' رافیل گیری نے کہا۔ ''ان کا قول ہے کہ لوگ اس لیے غلطیاں کرتے ہیں تاکہ انہیں بھگت کر لطف اٹھا سکیں۔ بغیر غلطیوں کے کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی کے انجام میں غلطیوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ فرد کو اپنے اجداد سے ایک خون کا راستہ عطا ہوتا ہے اور یہی خونی راستہ انہیں ایک منزل تک پہنچاتا ہے۔ چاہے کچھ کریں پہنچتے اسی جگہ ہیں۔''

''خون کے راستے؟'' کاڈرے نے دہرایا۔ ''دلچسپ فلسفہ ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ایک انڈین ہو رافیل۔''

''میرے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں تم نہیں جانتے گرانٹ۔''

وہ ایک دم سے کاڈرے کی کار کے پاس رک گئے۔ رافیل نے اسے الوداع کہنا چاہا مگر کاڈرے نے اس کا بازو تھام لیا اور ہولے سے آگے بڑھ کر اس کی کار کی طرف چل دیا۔ اس کی کار کے پاس پہنچ کر کاڈرے نے اس کے ہاتھ سے کار کی کنجی لی اور اس کے لیے خود دروازہ کھولا جب وہ وہیل کے سامنے بیٹھ گئی تو اس نے کنجی اسے دے دی۔

''ویک اینڈ پر تم فری ہو گی؟'' کاڈرے نے جھک کر اس سے پوچھا۔

''ہاں، کیا کوئی پروگرام ہے؟''

''ہاں، ساحل کی طرف چلیں گے۔ میری ایک کشتی وہاں ہے۔ کچھ مچھلی ماریں گے۔''

''اچھا تو تم اور ایلین کشتی میں بھی گھومتے ہو؟''

''نہیں، وہ کشتی میں نہیں بیٹھتی سمندر سے گھبراتی ہے۔''

''اکیلے جاتے ہو؟''

''ہاں۔'' رک کر اس نے پوچھا۔ ''تمہیں سمندر برا تو نہیں لگتا؟''

''میں نے کبھی آزمایا نہیں۔''

''میرے ساتھ چلو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں ملیں اور ان میں ایک ایسا رنگ ابھرا جو پہلے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ عرصے سے یہ ساتھ تھے۔

''ہاں گرانٹ ضرور چلوں گی۔'' وہ مسکرائی گرانٹ بھی مسکرایا۔

''ٹھیک ہے، تم نے ساحلی راستے پر، پرنس نامی کافی ہاؤس دیکھا ہے؟'' کاڈرے نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''بس وہیں ہم ناشتے کے وقت ملیں گے۔ اپنی کار وہیں چھوڑیں گے اور ساحل تک پیدل جائیں گے۔ وہ قریب ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تو پھر کل صبح چھ بجے؟''

''ٹھیک۔''

کاڈرے نے کار کا دروازہ بند کر دیا۔

❀ ...... ☾ ...... ❀

جب کاڈرے گھر پہنچا تو اس کی بیٹی سوسن پورچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اسی کی منتظر تھی۔ اس وقت اس کے جسم پر ٹرینی آفیسر کی وردی تھی۔ آج

اس نے جاب پر پہلا دن گزارا تھا وہ عورتوں کی جیل ویورلی پرنیون پر متعین کی گئی تھی۔

''ڈے...... ڈی۔'' وہ باپ کو دیکھ کر اچھلی۔'' بتائیں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''بہت اچھی۔'' کاڈرے نے کہا۔''دن کیسا رہا؟''

''بہت ہی اچھا۔'' وہ چہکی۔''وہاں سب مجھے جان گئے ہیں کہ میں ڈپٹی وارڈن کسٹوڈی کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ مجھے اپنے خاندان کے فرد کی طرح ماننے لگے ہیں مگر ڈیڈی یہ جاب بڑے مزے کی ہے۔ وہاں تو ایک اور ہی دنیا آباد ہے ڈیڈی۔''

''ہاں اور وہ دنیا تمہیں اچھی لگی ہے کیوں؟''

''بہت...... بہت ہی......'' اس نے سر اٹھا کر دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ اس کی ماں کے کمرے کی روشنی بجھ چکی تھی۔

''تم فکر مت کرو۔'' کاڈرے نے اسے تسلی دی۔''وہ جلدی ہی مان جائے گی۔ ہم سب ایک ہی نظام کا حصہ ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ اس حصے میں ہے جو دنیا کو تعلیم کے ذریعے بہتر بنا رہا ہے جبکہ ہم اور تم اس حصے میں ہیں جو دنیا کو خراب لوگوں سے چھٹکارا دلا کر اسے اچھا بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ تمہاری ماں کی قسم کے لوگ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہمارا کام ان کے کام کے ہم رتبہ ہے۔ بلکہ یہ ان کے کام سے بھی ایک معنی میں زیادہ اہم ہے۔ ان کے بغیر تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں مگر مجھے یقین نہیں کہ ہمارے بغیر وہ جی سکیں۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگ اس تھیوری کو نہیں تسلیم کر پاتے مگر ہم لوگ اس بات سے آگاہ ہیں۔''

کاڈرے نے اپنی بیٹی کے ماتھے پر پیار سے بوسہ دیا۔

''آفیسر...... ہم اپنی ٹیم میں تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔'' پھر وہ وہیں بیٹھ گئے۔

''ویورلی میں، جنجر کی واپسی سب کے لیے تعجب خیز تھی۔'' سوسن نے بتایا۔''اس کا سر تک منڈا ہوا تھا۔ اس کے شوہر کی پھانسی کا احوال بتائیں۔''

''یہ کام بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔'' کاڈرے نے کہا۔

''ڈیڈی! کسی کو پھانسی دینے کا کام کیسا لگتا ہے؟''

''اچھا لگتا ہے۔'' کاڈرے نے کہا۔''ایسا ہی جیسے کسی استاد کو نیا شاگرد اچھا لگتا ہے۔ تمہاری ماں، لوگوں کو تربیت دے کر اچھا انسان بناتی ہے جبکہ میں معاشرے میں خراب افراد کو کھوجنے کا کام کرتا ہوں اور یہ کام اسی لیے اچھا لگتا ہے۔''

سوسن باپ سے چپک کر بولی۔''میں آپ کی طرح بنوں گی ڈیڈی، کسی دن کسی جیل کی وارڈن کسٹوڈی۔''

''میری دعا تمہارے ساتھ ہے۔'' کاڈرے نے بیٹی کے ہاتھ تھپکے۔ اس وقت اسے رافیل کی دادی کی بات یاد آ گئی تھی جو خون کے اندر موجود راستوں کے متعلق تھی۔ بیٹی پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

❁

روپ بہروپ

محمد سلیم اختر

اس دنیا میں لوگوں کے کئی روپ ہوتے ہیں' ہر روپ دوسرے سے جدا اور نرالا ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے دنیا کو جان لیا ہے' سمجھ لیا ہے' جو بھی دنیا کے روپ کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے سامنے ایک نیا بہروپ سامنے آجاتا ہے۔

اس رنگ بدلتی دنیا کا احوال' نئے افق کے کنہ مشق لکھاری محمد سلیم اختر کے قلم سے ایک طویل ناول۔

ہم سفر ملتے رہے اور کارواں بنتا رہا۔ رمضان خان، فرید خان اور دوسرے، لیکن پانچ ایسے لوگ مجھے ملے جو میری ایکشن آرمی بن گئے، بے مثال شخصیت کے مالک، یہ لوگ سزائے موت کے قیدی تھے اور ایک خوفناک جیل سے فرار ہوئے تھے، میں نے انہیں اپنے پروگرام میں شامل کرلیا، امیر شاہ کے جانشین کی حیثیت سے سرکاری حلقوں میں میرا بڑا نام بن گیا تھا۔ میں ڈبل رول ادا کررہا تھا، حقیقت میں حیدر شاہ کے الفاظ نے مجھے آتشیں بنایا تھا اور میں چن چن کر ملک دشمنوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ میرے وہ پانچ ساتھی جنہیں میں نے ناموں سے پکارنے کے بجائے نمبر دیئے تھے۔ یعنی ڈی ون سے ڈی فائیو تک۔ یہ لوگ حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک تھے۔

مجھے دو ایسے نام ملے جو ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے تھے، نمبر ایک دلاور جان، دوسرا صفدر شاہ۔ دونوں بے حد خطرناک اسمگلر تھے، خاص طور سے دلاور جان نے ایک خطرناک جنگل تارین کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور وہاں سے وہ خطرناک کارروائیاں کررہا تھا۔

ڈیز یعنی ڈی فائیو نے مجھے صفدر شاہ کے بارے میں بتایا جو چھ بیٹیوں اور ایک بیٹے کا باپ تھا اور بہت خطرناک اسمگلر تھا میری ان دونوں سے چل گئی اور یہ نام میرے لیے چیلنج بن گئے۔

میں نے اپنے دو خاص ساتھیوں امانت گل اور احمد بیگ کی مدد سے صفدر شاہ کے اکلوتے بیٹے عامل شاہ کو تاکا اور اپنے آدمی اس کے پیچھے لگا دیئے۔

اس دن امانت گل تقریباً ساڑھے پانچ بجے میرے پاس پہنچا پر تجسس نظر آرہا تھا، فوراً ہی میرے پاس آکر بولا۔

"صاحب آج کام ہوگیا، عامل شاہ کو اس کے گھر چھوڑ آیا ہوں اور وہ بالکل اکیلا ہے ابھی، چوبیس گھنٹے تک وہاں سے باہر نہیں نکلے گا۔"

"تو پھر ہمیں پہنچ جانا چاہیے اس تک۔"

"جیسا آپ پسند کریں صاحب، میں آپ کو ادھر تک کا راستہ بتادوں گا۔" امانت گل نے کہا۔

احمد بیگ نے فوراً ہی گاڑی کا بندوبست کیا۔ ویسے تو رمضان خان کی ٹیکسی بھی موجود تھی لیکن احمد بیگ کو یہ آسانی تھی کہ وہ اپنی کمپنی کی بڑی اور چھوٹی گاڑیاں بہ آسانی لے آتا تھا۔ ہمیں یہ خطرہ تھا کہ کمپنی کا مونوگرام کہیں صفدر شاہ کے علم میں نہ آگیا ہو لیکن اب ہر لمحے تو احتیاط نہیں برتی جاسکتی تھی۔

امانت گل ہمیں سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی گاڑی کا پیچھا کرنے کے لیے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ یہ گاڑی صفدر شاہ کی تھی، ہم اس کے عقب میں چل پڑے، پھر ایک جگہ رک کر امانت گل نے ایک دور دراز مکان کی جانب اشارہ کیا۔ چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا جس کے احاطے میں سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ بڑا سا لکڑی کا گیٹ لگا ہوا تھا لیکن کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں بھی ہمیں امانت گل نے تفصیل بتائی۔

"جب وہ یہاں آتا ہے صاحب تو کسی کو بھی اپنے پاس دیکھنا پسند نہیں کرتا، سب کو بھگا دیتا ہے حالانکہ یہاں عام حالات میں ایک چوکیدار موجود رہتا ہے جو گھر کا خیال رکھتا ہے اور اس کی صفائی ستھرائی کرتا ہے۔"

"اس وقت وہ اکیلا ہوگا......؟"

"بالکل اکیلا صاحب۔"

میں نے ان لوگوں کو واپس کردیا تھا۔ یہ میرا اپنا معاملہ تھا اور میں اس سلسلے میں رمضان خان یا امانت گل کو سامنے نہیں لاسکتا تھا۔ البتہ ڈیز گروپ کے لوگ میرے ساتھ تھے اور ان نوجوانوں کو اس احاطے میں داخل ہونے میں بھلا کیا دقت پیش آسکتی تھی۔ میں

البتہ بڑے گیٹ سے ہی اندر داخل ہوا تھا۔

چھوٹے سے مکان کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا' میں نے ان لوگوں کو ہوشیار کیا۔ ڈی ون اور ٹوتو باہر رک گئے تاکہ صورت حال پر نظر رکھی جائے۔ باقی تینوں ڈیز میرے ساتھ تھے اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک بڑے کمرے میں پہنچ کر میں نے عامل شاہ کو دیکھا۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا' قریب ہی نشہ آور ادویات کا سامان رکھا ہوا تھا۔ لمبے لمبے شانوں تک بکھرے ہوئے انتہائی خوبصورت بال' صورت سے وہ کوئی غیر ملکی نظر آتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی' ویسے خدوخال انتہائی خوبصورت تھے۔ یقینی طور پر صفدر شاہ کی بیٹیاں بھی انتہائی حسین ہوں گی۔ بیٹا بھی انتہائی حد تک شاندار تھا۔ اچھے خاصے قدوقامت کا مالک تھا' لیکن جسم کسی قدر دبلا نظر آرہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلے مجھے اور پھر میرے ساتھ موجود ڈیز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی حیرت نظر آرہی تھی۔ پھر دفعتاً ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کی آنکھوں میں چھپی حیرت اور گہری ہو گئی۔

وہ دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔

''اس عمارت میں گھسنے والوں کو اصولی طور پر گولیوں کا نشانہ بن جانا چاہیے' لیکن آنے والے تم جیسے ہوں تو یقیناً ان کا استقبال کیا جاسکتا ہے۔ یقینی طور پر میرے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر کے ہی آئے ہوں گے۔ میرا نام عامل شاہ ہے۔''

''عامل شاہ! بڑا اشتیاق تھا ہمیں آپ سے ملنے کا۔''

''تو پھر ہاتھ ملاؤ' مجھے اپنے دشمنوں میں تصور نہ کرو اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں بھی تم لوگوں سے ملنا چاہتا تھا تو یقیناً تم اسے میری چالاکی اور زندگی بچانے کی کوشش سمجھو گے لیکن تمہارا جو دل چاہے' سمجھتے رہو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں واقعی تم سے ملنے کا خواہشمند تھا۔'' عامل شاہ کے ان الفاظ نے ہمیں حیران کر دیا تھا۔

میں نے گہری نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا۔ لاأبالی سا آدمی تھا۔ چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

''بیٹھو' تم اپنے تحفظ کا بندوبست کر کے آئے ہو گے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں یہاں تنہا ہوں۔ چاہو تو میری تلاشی لے لو' میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میں ہتھیاروں کا قائل ہی نہیں ہوں' یہ دنیا ویسے ہی بہت بری ہو گئی ہے۔ انسانی زندگی بے وقعت' بے مقصد' بے مزا۔ جینے کو جی نہیں چاہتا تمہاری اس دنیا میں' میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔''

''ہمارے بارے میں تمہیں کیا معلومات ہیں عامل شاہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں' بس ان لوگوں کو دیکھ کر اپنے باپ کی وہ پریشانی یاد آگئی جو اسے آج کل ایسے لوگوں سے حاصل ہو گئی ہے۔ کیا وہ تم ہی تھے جو میرے باپ کے گوداموں تک پہنچے تھے؟ کیا کرنے گئے تھے وہاں' کم از کم مجھے تو بتا دو۔''

''تم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہو عامل شاہ'' میں نے کہا۔

ڈیز گروپ دیواروں سے پشت لگا کر کھڑے ہو گئے۔ تھے' میں اس کے عین سامنے تھا۔

''بیٹھو تو سہی' میں جو کچھ کر رہا ہوں یا جو نہیں کر رہا' اس کے بارے میں جان تو لو۔ اے! کیا تم اپنا اطمینان نہیں کرو گے؟ باہر کچھ لوگوں کو چھوڑا ہے تم نے' اپنی پہرے داری کیلئے؟''

''یہ ساری باتیں تمہیں پوچھنے کا حق نہیں پہنچتا۔''

"ٹھیک ہے جیسے تم پسند کرو بتاؤ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"عامل شاہ! تم سے تمہارے باپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا تم اس بات کو جانتے ہو کہ وہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے' کیا تم اس کے جرائم میں برابر کے شریک ہو؟"

"ایک لحاظ سے ہوں۔ وہ اس طرح کہ اس کے گھر میں رہتا ہوں' اس کا دیا کھاتا ہوں اور وہ میرا باپ کہلاتا ہے اور میری رگوں میں اسی کا خون دوڑتا ہے۔ اس لحاظ سے شرکت تو ہوئی اس کے جرم میں برابر لیکن اگر تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اس میں میرا کیا عمل دخل ہے' تو میں تمہیں اس کی تفصیلات بتانے کے لیے تیار ہوں۔ ایک بار پھر کہتا ہوں' یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے اور تم جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہو اس پر عمل کرنا' مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔"

"کیا کرتا ہے صفدر شاہ؟"

"اسے دولت کا خبط ہے۔ وہ زر و جواہر کا بیمار ہے۔ یہ بیماری اسے آج سے نہیں ہمیشہ سے لاحق ہے۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے دولت کمانے کی کوشش کی ہے اور پھر جب اسے ایک آسان راستہ نظر آ گیا تو اس نے جرم کی جانب قدم اُٹھا دیئے۔ دلاور جان اس کا سب سے بڑا ساتھی ہے' دلاور جان کا کام بہت بڑا ہے لیکن صفدر شاہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اس نے بہت سے جرائم کئے ہیں اور پیسہ کمایا ہے' اگر آج کل کی بات کرتے ہو تو آج کل اس کے دو کاروبار ہیں۔ کرنسی اور اسلحہ۔ دنیا کے مختلف ملکوں کی جعلی کرنسی اس کے پاس موجود ہے اور وہ اس کی کھپت کے راستے رکھتا ہے۔ یہ جعلی کرنسی وسطی ایشیا کے ملکوں سے تیار ہو کر اس کے پاس پہنچتی ہے اور وہ اسے مختلف ذرائع سے دوسرے ممالک کو سپلائی کر دیتا ہے۔ اس کا کمیشن اسے مل جاتا ہے۔ پہلے وہ منشیات کی تجارت کرتا تھا آج کل نہیں کرتا۔ دوسرا بڑا کام اسلحہ ہے' یہ اسلحہ بھی اس کے پاس دلاور جان کے توسط سے آتا ہے اور اس سلسلے میں دونوں کا برابر کمیشن ہے۔ آج کل میرا باپ یہ دونوں کاروبار کر رہا ہے' اس کے پاس بے پناہ دولت جمع ہوگئی ہے مگر اس کا دل ہی نہیں بھرتا' میں نے کتنی بار کہا کہ آخر اتنی دولت کما کر کیا کرو گے' تمہاری بیٹیاں ہیں ان کی شادی کر دو۔ جہاں تک میرا مسئلہ ہے میں نے اپنی زندگی کا محور ہی بدل لیا ہے۔"

"وہ کیا......؟" میں نے سوال کیا۔

"جاننا چاہتے ہو تو سنو' مجھے نہ تو زندگی سے دلچسپی ہے اور نہ ہی دنیا سے' نہ حسن و جمال کا رسیا ہوں' نہ اس دنیا کی دوسری لطافتوں میں دلچسپی لینا چاہتا ہوں۔ میری صرف ایک خواہش ہے' ایک ہنسی ایک مسکراہٹ' یہ ہنسی اور مسکراہٹ اگر میرے ذریعے کسی کے ہونٹوں پر آ جائے تو میں سمجھتا ہوں مجھے کائنات مل جاتی ہے۔ یہی میرا مقصد ہے' دنیا کو دکھ میں دیکھتا ہوں تو منشیات کا سہارا لیتا ہوں' خود کو بھول جاتا ہوں۔"

جواب میں مَیں ہنس پڑا۔

"تم تو ایک طرح سے فرشتہ صفت ہو۔"

میری ہنسی کے جواب میں اس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

"فرشتوں کی عظمت کو اس طرح داغدار کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے' کیا فرشتے ایسے ہوتے ہیں؟"

میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت تھی' میں نے اس سے کہا۔

"سنا ہے' تم صفدر شاہ کے اکلوتے بیٹے ہو اور وہ

تمہیں بے پناہ چاہتا ہے۔ تو پھر تم اسے اس کے جرائم سے روک نہیں سکتے؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ میرا باپ ہے اور صرف اس مسئلے میں وہ کہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ درست ہے۔ وہ میری بات نہیں مانتا اور میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس سے اپنی بات منوانے کا۔"

"تم نے اسے علیحدگی کی دھمکی کیوں نہیں دیدی؟"

"دھمکی...... میں اس سے علیحدہ ہی تو ہوں۔ میرا اور اس کا کوئی ساتھ نہیں ہے دوست۔ دنیا کے مختلف ملکوں کی سیر کرتا رہا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اس سلسلے میری مدد بھی کی ہے مگر جانتے ہو میری سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟"

"بتا دو۔"

"میں چاہتا ہوں کہ میرے باپ کی دولت کچھ ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا باعث بن جائے۔ سنو تم لوگ بھی جرائم پیشہ ہو کیا کرتے ہو تم لوگ، صفدر شاہ اور تمہاری آج کل کیوں چل رہی ہے۔ کیا تم کرنسی اور اسلحے کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہو۔ یا دشمنی برائے دشمنی ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے......؟"

"ہم سب کا ایک خیال ہے میری مراد صفدر شاہ اور دلاور جان وغیرہ سے ہے۔ وہ یہ کہ یا تو تم سرکاری آدمی ہو لیکن اس کے امکانات صرف پانچ فیصد ہیں کیونکہ عموماً جب سرکاری آدمی صفدر شاہ یا دلاور جان کے لیے کام کرنے آتے ہیں کہیں نہ کہیں سے ان دونوں تک اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ اس بار کسی سرکاری آدمی کے بارے میں کوئی اطلاع ان تک نہیں پہنچی چنانچہ وہ یہی سوچ رہے ہیں کہ کسی غیر ملکی کے اشتراک سے تم

کمی

شادی کے کچھ عرصے بعد شوہر نے نیا مکان خریدا تو بیوی نے خوش ہوتے ہوئے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کے دوران پوچھا۔ اس میں الماریاں کتنی ہیں۔ سولہ الماریاں ہیں۔ شوہر نے فخر سے بتایا۔ سولہ یہ تو کم ہیں۔ بیوی بولی۔ کیا؟ شوہر حیرت سے بولا۔ کیا سولہ الماریاں تمہارے کپڑے لٹکانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ میرے کپڑے لٹکانے کے لیے تو کافی ہیں۔ بیوی بولی۔ لیکن تمہیں بھی تو آخر کپڑے لٹکانے کے لیے الماری کی ضرورت ہوگی۔

غلام عباس خان ...... راجن پور

یہاں اپنے قدم جمانا چاہتے ہو۔ مطلب یہ کہ ان دونوں کے دشمنوں نے مشترکہ طور پر کوشش کر کے تم لوگوں کو یہاں بھیجا ہے تاکہ ان کے کاروبار کو ختم کر کے اس پر قبضہ کر لو۔"

"ہوں اور تم سے یہ کہیں کہ ہمارا تعلق صرف حکومت سے ہے تو......"

"تو پھر میں تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا اور تمہارے قدموں میں سر رکھ کر کہوں گا کہ خدا کے لیے میرے باپ کو اس جرم کی دنیا سے نکال دو۔ اسے جیل میں ڈال دو پھانسی دے دو اسے، لیکن وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ بہتوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ اسلحہ ملک بھر میں پھیل رہا ہے اس سے دہشت گردی ہوتی ہے لوگ موت کا شکار ہوتے ہیں بڑے بڑے شہروں سے نوجوان یہاں آتے ہیں اسلحے کی خریداری کے لیے اور یہ اسلحہ وہ کسی اچھے کام کے لیے نہیں خریدتے بلکہ اس کے ذریعے وہ جرم کرتے ہیں۔ اس طرح کے جرم نجانے کتنے افراد صفدر شاہ کی وجہ سے موت کے

گھاٹ اُتر چکے ہیں' جہاں تک کرنسی کا معاملہ ہے وہ ایک الگ چیز ہے اس کے لیے بات ہی دوسری ہو جاتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرا باپ یہ سب کچھ کرے اور اس کے لیے میں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تو سڑکوں پر گھسٹتی ہوئی زندگی پسند ہے' جس طرح میری اس دنیا کے کروڑوں افراد بسر کررہے ہیں۔ بتاؤ ہم میں خوشحال افراد کتنے ہیں۔ سب کے سب مصیبتوں کا شکار' میں ان سے الگ رہنا نہیں چاہتا۔ میری ایک آرزو ہے۔ سنو میرا ایک مشورہ بھی ہے مجھے لے جاؤ یہاں سے' یہاں سے مجھے لے چلو اور اس کے بعد مجھے اذیتیں دو' شدید اذیتیں' یوں سمجھو' مجھے تمہاری تلاش تھی۔ مجھے اذیتیں دے کر تم میرے باپ کو مجبور کرو کہ وہ تمہاری پسند کے مطابق کام کرے' سنو اگر کرسکتے ہو تو یہ کام کر لو اس سے تمہیں فائدہ ہوگا اور یقین کرو' مجھے اسی لیے تمہاری شدت سے تلاش تھی۔"

میں حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک تصور یہ بھی تھا کہ ممکن ہے یہ چالاک نوجوان مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا ہو' اب کیا کرنا چاہیے میں چند لمحات سوچتا رہا' پھر میں نے اس سے کہا۔

"فرض کرو اگر میں تمہاری بات مان لوں' تمہارے باپ کو مجبور کروں' تو کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ دلاور جان کے مشورے کے بغیر اس کام کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"ساری دنیا میں وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتا ہے اور میرے لیے وہ دنیا کا ہر کام کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ تم میری اس تجویز پر عمل کرکے دیکھ لو' تھوڑے دن تجربے کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں تو خود اپنے آپ کو تمہاری تحویل میں دے رہا ہوں' چاہو تو اذیتیں بھی دے دینا چاہو تو جسم پر جگہ جگہ داغ ڈال دینا اور میری تصویر بنا کر اس کے سامنے پیش کردینا اور اگر ایسا نہیں کرسکتے تو سنو وہ سامنے جو ایک چھوٹی سی میز پڑی ہوئی ہے' اس کی دراز میں انسٹافون موجود ہے۔ وہ انسٹافون نکال لو۔ رابطے کا بہترین ذریعہ بن جائے گا اسے استعمال کرو اور میری آواز صفدر شاہ کو سنوا دو۔ تمہارے لیے اس سے عمدہ اور کوئی تجویز نہیں ہوسکتی۔"

میں پُرخیال انداز میں رخسار کھجانے لگا' واقعی عجیب وغریب اور بہترین تجویز تھی۔ مجھے اس بات کی امید نہیں تھی کہ ایسا کوئی کردار مجھے مل جائے گا۔ بہرحال چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"کیا یہ عمارت محفوظ ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ یہاں صفدر شاہ کے آدمی آسکتے ہیں۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو ایسی جگہ لے چلو جس کی نشاندہی میں کروں گا بلکہ یقین کرو وہ تمہارے لیے بھی محفوظ ترین جگہ رہے گی' یوں سمجھو میرا اصل اڈہ وہی ہے اور اس کے بارے میں صفدر شاہ کو بھی معلوم نہیں ہے۔"

ایک حتمی فیصلہ کرنا تھا اور یقینی طور پر عامل شاہ کی یہ پیش کش میرے لیے انتہائی سنسنی خیز تھی اور اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں اس پر بھروسہ کروں یا نہ کروں' لیکن یہاں بھی مستانے ہی تھے ہم لوگ' کون اس بات کی پروا کرے کہ مستقبل میں کیا ہوگا چنانچہ میں نے عامل شاہ کا مشورہ قبول کرلیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"اب میں تم پر اعتبار کررہا ہوں عامل شاہ' میں زیادہ سے زیادہ تمہیں موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہوں' تمہاری کسی بدعہدی پر...... لیکن اطمینان رکھو' ایسا کبھی نہیں کروں گا کیونکہ دوست کہہ رہا ہوں تمہیں۔ ہاں اگر تمہاری آرزو سسکتے چہروں پر مسکراہٹ لانا ہے' تو یقین کرو اس میں' میں تمہارا بہترین ساتھی ثابت ہوں گا۔"

اس نے ایک لمحے مجھے دیکھا پھر منشیات کی طرف اوراس کے بعد بولا۔
''اگر تم مجھے وہ نشہ مہیا کرنے کا وعدہ کرو تو میں یہ نشہ ترک کرسکتا ہوں' کیا سمجھے؟''
بڑے عجیب الفاظ تھے میں نے اس پر اعتبار کرلیا۔
''تو پھر کیا خیال ہے تمہارا......؟'' اس نے پوچھا۔
''اگر تم پسند کرتے ہو تو چلو' پھر اب مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں تم ایک قیدی کی حیثیت سے محفوظ رہو گے۔ حالانکہ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے لیکن جب اعتبار ہی کا معاملہ ٹھہرا تو میں اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات پر اعتبار کرسکتا ہوں۔''
''وہ انسٹافون نکال لو جس کے بارے میں' میں نے تم سے کہا تھا۔'' عامل شاہ نے کہا اور میں نے اس کی نشاندہی پر انسٹافون اپنے قبضے میں لے لیا۔
اس کے بعد ہماری واپسی انتہائی حیرت ناک تھی۔ پانچوں ساتھی میرے ساتھ تھے اور ہم سب ایک نامعلوم منزل کی جانب سفر کررہے تھے۔
ہمارا یہ نیا ٹھکانہ بھی عجیب تھا۔ آبادی کا یہ سلسلہ پہاڑی ٹیلوں تک جاکر ختم ہو جاتا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بھی مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ غریب لوگوں کی آبادی تھی' جس مکان کے سامنے جاکر ہم رُکے وہ ایک ٹوٹا پھوٹا بوسیدہ مکان تھا۔ عامل شاہ نے دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ عامل شاہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر محبت کا نور پھوٹ آیا۔ پھر اس نے پیار بھری نظروں سے ہمیں دیکھا۔
''آؤ......'' عامل شاہ بولا۔ ہم سب جھجکتے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئے۔ بوسیدہ مکان سے غربت ٹپک رہی تھی' بڑا سا صحن جس میں چار درخت لگے ہوئے تھے پھر ایک برآمدہ۔ اس میں تین دروازے کھلتے تھے' برآمدے میں تخت پڑے ہوئے تھے۔
''کون ہیں یہ عامل؟'' بوڑھی نے پوچھا۔
''سب دوست ہیں' مہمان ہیں۔'' عامل شاہ نے کہا ہم نے بوڑھی کو سلام کیا۔
''بیٹھو۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔
''ایلا کہاں ہے......؟''
''ایلا......'' بوڑھی نے آواز دی۔
''کون آیا ہے ماں۔'' اندر سے نسوانی آواز اُبھری اور پھر دروازہ کھول کر ایک لڑکی باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کر ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ لڑکی کبھی خوبصورت ہوگی لیکن اب اس کا چہرہ جلا ہوا تھا۔ آدھا چہرہ بہت بھیانک تھا' باقی آدھا خوبصورت' وہ اندھی تھی۔
''کون ہے ماں......؟''
''عامل آیا ہے' دوستوں کے ساتھ۔'' لڑکی ٹھٹک کر رہ گئی۔
''آجاؤ ایلا' میرے دوست ہیں آجاؤ۔'' عامل شاہ نے آگے بڑھ کر لڑکی کا بازو پکڑ لیا وہ جھجکتی اور شرماتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے سمت کا تعین کیے بغیر ہمیں سلام کیا' عامل شاہ کہنے لگا۔
''ایلا میری بیوی ہے میری زندگی کی مالک۔''
ایک لمحے کے لیے ہمارے منہ حیرت سے کھل گئے۔ بہرحال یہ ذرا ناقابلِ یقین سی بات تھی اور کافی حد تک پُراسرار بھی۔
عامل شاہ مسکرا کر بولا۔
''ایلا بہت حسین ہے۔ میری نگاہ میں اس کائنات کی سب سے حسین لڑکی' میں نے اپنی پسند سے اس سے شادی کی ہے۔ ایک حادثہ پیش آگیا تھا اسے' دس بارہ سال پہلے اور یہ آنکھوں سے محروم ہوگئی۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے یورپ لے جاؤں اور وہاں اس کی آنکھوں کا علاج کراؤں۔ پھر اس کے چہرے کی سرجری کرا

دوں۔ تم لوگ دیکھ لینا' ایک دن یہ اپنی اصل شکل میں واپس آجائے گی۔"

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایلا کہنے لگی۔

"مہمانوں کے لیے کیا تیار کروں شاہ......؟"

"بندوبست ہوجائے گا۔ میں انہیں اندر لے جارہا ہوں' بعد میں' میں آکر بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ آؤ دوستو! ایلا اور میری ساس سے مل لئے' چونکہ تمہیں یہاں کچھ عرصے قیام کرنا ہے اس لیے ان سے تمہارا تعارف ضروری تھا۔ آؤ اندر آجاؤ۔"

میں تمام لوگوں کو اشارہ کر کے عامل شاہ کے ساتھ اُٹھ گیا۔ سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہو کر ہم ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچ گئے جہاں ٹوٹی پھوٹی چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ عامل شاہ نے الماری کا دروازہ کھولا اور پھر ایک چٹ کی آواز کے ساتھ وہاں روشنی ہوگئی۔ حیرت کا دوسرا لمحہ تھا۔ الماری سے اندر داخل ہو کر عامل شاہ چند سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا جو گہرائی میں اتر جاتی تھیں۔ غالباً یہ کوئی تہہ خانہ تھا۔ ہم لوگ حیران حیران سے اس جگہ سے اندر داخل ہوگئے۔ اندر پہنچ کر احساس ہوا کہ یہ جگہ ایئر کنڈیشنڈ ہے' دس بارہ سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے اور عامل شاہ نے ایک بار پھر دیوار ٹٹول کر روشنی کر دی۔ یہاں ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔

تہہ خانہ تھا یا ایک عظیم الشان ہال' جس میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر سجا ہوا تھا جنریٹر بے آواز چل رہے تھے اور انہی کے ذریعے ائر کنڈیشنڈ' ریفریجریٹر اور ڈیپ فریزر وغیرہ کام کر رہے تھے۔ چھت میں بہت ہی خوبصورت قسم کے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ ایک جانب سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور یہ حصہ اوپر تک چلا گیا تھا۔ اندازہ لگانے سے احساس ہوا کہ پہاڑی ٹیلے کو اندر سے کھوکھلا کر کے یہ جگہ بنائی گئی ہے۔ ناقابلِ یقین سی جگہ تھی۔

عامل شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"شادی کی ضرورت پیش آئی اور ایک حجلہ عروسی کی اور میں نے یہ جگہ تیار کروائی۔"

"کمال ہے' عامل شاہ کمال ہے!"

"یہ سب محبت کا کمال ہے۔"

"بے شک' اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے میرا باپ ایک ایسی غریب اندھی لڑکی کو قبول نہیں کر سکتا تھا جو اپنا کوئی ماضی نہ رکھتی ہو لیکن میں نے اسے قبول کیا تھا اور پھر میں نے اسے اس کے شایانِ شان زندگی دی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ دہری زندگی گزار رہی ہے لیکن ہم اس ماحول کی دلکشی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"تم نے ہمیں حیران کر دیا۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں ہی نہیں' ہم سب حیران تھے۔ عامل شاہ واقعی بڑی انوکھی شخصیت تھی' سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔

"یہ سیڑھیاں اوپر تک جاتی ہیں' اوپر ایک ایسی چٹان ہے' جہاں سے باہر جانے کے لیے راستہ کھلتا ہے' تم وہاں سے دور دور تک کا منظر دیکھ سکتے ہو۔"

"دیکھ سکتا ہوں......؟"

"ضرور...... آؤ......" اس نے کہا اور ہم سب سیڑھیاں عبور کرنے لگے اس خوفناک جگہ کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے تھے۔ یہاں سے تاربین کے جنگلات نظر آتے تھے۔ وہ ہوٹل بھی جہاں میں نے رمضان خان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ بڑا سنسنی خیز نظارہ تھا۔

"جنگلات دیکھ رہے ہو۔ وہاں پر دلاور جان کا ٹھکانہ ہے اور وہ دلاور جان میرے باپ سے بڑا جرائم

پیشہ ہے۔ وہ ان دنوں وہجی تیل کنگ کہلاتا ہے۔ وطن میں روغن کی قیمت آسمان پر پہنچ گئی ہے۔ پروڈکشن کا تیس فیصد وہ پڑوسی ملک کو اسمگل کر دیتا ہے اور کروڑوں روپے کما رہا ہے۔ بہت سے آئٹم اس کی لسٹ پر ہیں، مگر ان دنوں وہ گھی اور تیل سے سونا بنا رہا ہے۔"

"وہ صفدر شاہ کا دوست ہے۔"

"ایسے لوگ صرف دولت کے دوست ہوتے ہیں، ان کا نہ کوئی دوست ہوتا ہے نہ وطن۔ بہرحال میں دوسروں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہو میرا گریبان ہی گندا ہے۔"

"نہیں عامل شاہ، تم روشنی کا وہ مینار ہو جو تاریکیوں میں اُجالے کرتا ہے۔ تمہارا گریبان گندا نہیں بلکہ اس گریبان میں چھپا سینہ نمونہ روشنی ہے۔ صفدر شاہ چھ بیٹیوں کا باپ ہے ایک گھرانہ ہے اس کا، اس کی سوچ بھٹک گئی ہے لیکن اس نے تم جیسی اولاد پیدا کر کے اپنے سارے گناہوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ تم نے نہ صرف اسے بلکہ اس کے پورے خاندان کو بچالیا ہے۔ میری اس سے جنگ ختم ہو گئی ہے، تم سے ملنے کے بعد اب میں صرف اسے نیکیوں کے راستے پر واپس لانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاتھ کمزور نہیں ہیں شامل شاہ، بہت لمبے ہاتھوں کے ساتھ میں یہاں آیا ہوں۔ صفدر شاہ اور دلاور جان کو ان ہاتھوں کی گرفت میں آنا تھا۔ مگر تم نے انہیں بچالیا ہے۔"

عامل شاہ خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اب کیا کرو گے......؟"

"تم مل گئے ہو صفدر شاہ اب دوسرے نمبر پر آ گیا ہے، پہلے مجھے دلاور جان کو دیکھنا ہے۔"

"یہ تم پر منحصر ہے۔"

"ایک بات بتاؤ عامل شاہ؟"

"پوچھو۔"

"تاربین کے ان جنگلات سے گزر کر تم کبھی دلاور جان کی رہائش گاہ پر گئے ہو؟"

"کبھی نہیں۔"

"وہ تمہیں جانتا تو ہوگا؟"

"دلاور جان۔ کیوں نہیں مگر وہ مجھے ایک سرکش اور اپنے مقاصد کے لیے بالکل ناکارہ انسان کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اکثر میرے باپ سے کہتا رہتا ہے اس نے کسی نر کو جنم نہیں دیا۔"

"دراصل میں اس راستے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی رہائش گاہ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ البتہ تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔"

"چور تک پہنچنے کا راستہ چور سے معلوم کرو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"صفدر شاہ تمام راستوں کے بارے میں جانتا ہے اگر تم پہلے صفدر شاہ کو اپنے شکنجے میں کس لو تو دلاور جان کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں وہ تمہاری رہنمائی کر سکتا ہے۔" عامل شاہ نے کہا۔

میں درحقیقت اس شخص سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے صرف سطحی طور پر میری مدد نہیں کی تھی بلکہ انتہائی گہرائیوں سے صرف انسانیت کے نام پر وہ بُرے لوگوں کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گیا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔

"عامل شاہ آؤ نیچے چلتے ہیں۔"

ہم واپس اسی ائر کنڈیشنڈ تہہ خانے میں آ گئے۔ اس کی شخصیت نے سب ہی کو مسحور کر رکھا تھا۔ ایک جگہ بیٹھنے کے بعد میں نے کہا۔

"تم اس انداز میں اپنے باپ کے بارے میں

گفتگو کر رہے ہو جیسے اس سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہو۔"

"خدا کی قسم اپنے باپ کو باپ ہی کا درجہ دیتا ہوں لیکن اس باپ کو جو مجھ سے شفقت سے بات کرتا ہے لیکن صفدر شاہ سے نہیں، جو صرف اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے ملک کی عزت داؤ پر لگائے ہوئے ہے۔ اس صفدر شاہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ صرف ایک ملک دشمن انسان کی حیثیت سے میری نگاہوں میں ہے۔ ہاں جب وہ اپنے جرم کی پاداش میں سزا پا رہا ہو گا تو میں بلک بلک کر روؤں گا۔ اس لیے کیونکہ وہ میرا باپ ہے میں اس سے کہوں گا کہ میرے باپ تو نے انسانیت کے تمام رشتے توڑ دیے تھے دنیا کے رہنے والوں سے، یہ ان رشتوں کو توڑنے کی سزا ہے۔"

"میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں، عامل شاہ! تم نے اپنے باپ کی پیشانی کے تمام داغ دھو دیے ہیں۔ بہر حال میری ایک آرزو ہے۔ صفدر شاہ اگر برائیوں کے راستے سے واپس آ جائے تو مجرمانہ طور پر ہی سہی میں اس کے تمام گناہ چھپا سکتا ہوں لیکن اس کا معاوضہ اسے ادا کرنا ہوگا۔ تم نے عامل شاہ وہ بستیاں دیکھی ہوں گی، جو تمہارے اپنے لوگوں کی بستیاں ہیں، لیکن وہاں زندگی کے مصائب سے سسکتی ہوئی لاشوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے، وہاں انسان نما جانور رہتے ہیں۔ ان جانوروں کے لیے زندگی کی تمام مشکلات مہیا کر دی گئی ہیں۔ ان سے انسانوں کی مانند جینے کا حق چھین لیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں عامل شاہ کہ تمہارے باپ کی جمع کی ہوئی تمام دولت ان بستیوں پر خرچ ہو جائے۔ بولو عامل شاہ اس دولت کا ایک پیسہ بھی میں کسی اور مصرف میں استعمال کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ حکومت اپنے معاملات خود دیکھتی ہے اور بہت سے ایسے منصوبے بناتی ہے جس کے لیے اسے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں صفدر شاہ کی بے پناہ دولت اس کے سارے مسائل کا حل نہیں ہے لیکن یہ دولت ان چھوٹی بستیوں کے مسائل ضرور حل کر سکتی ہے، عامل شاہ! جب صفدر شاہ اپنے تمام منصوبوں میں ناکام ہو جائے گا تو اس کے بعد ان کے ولی عہد تم ہی ہو گے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اس دولت کا ایک ایک پیسہ تم ان غریب بستیوں پر خرچ کرو گے۔ کیا تم اس کا وعدہ کرتے ہو؟"

"کاش میری کھال کے جوتے بھی ان کے کام آ جائیں۔"

"تو پھر تم نے اپنے باپ کی زندگی محفوظ کر لی، تم نے اس کی عزت، اس کی آن محفوظ کر لی۔ بس اسے اس کام کے لیے تیار کرنا ہے۔"

"کاش یہ سب کچھ تمہاری پسند کے مطابق ہو جائے اگر میرے دل کی بات پوچھنا چاہتے ہو تو میری بیوی ایلا کو دیکھ لو۔ دنیا کی ٹھکرائی ہوئی ماں اور اس کی مظلوم بیٹی کسی کے لیے قابلِ اعتناء نہیں تھیں مگر میں نے...... میں نے انہیں سینے سے لگا لیا اور وہ سارا مان دیا جو دنیا میں جینے والوں کو دیا جاتا ہے لیکن یہ دیگ کا ایک چاول ہے۔"

"میں جانتا ہوں عامل شاہ، میں تمہیں اچھی طرح جان چکا ہوں۔"

"اب یہ بتاؤ آئندہ کیا کرنا ہے؟" عامل شاہ نے پوچھا۔

"بس یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔" میں پُرخیال انداز میں رُخسار کھجانے لگا۔

اسی وقت بوڑھی عورت اندر داخل ہو گئی اور اس نے کہا۔

"کھانا کہاں کھاؤ گے، کھانا تیار ہو گیا ہے؟"

"اتنی جلدی، مادر مہربان؟"

"ہاں۔ مہمانوں کے لیے فوراً تیاریاں شروع کر

دی گئی تھیں۔"

"تو پھر ہم کھانا یہیں لے آتے ہیں، میں ذرا مادر مہربان کے ساتھ جا رہا ہوں تم کچھ انتظار کرلو۔"

کھانا سادہ لیکن بہت پُرلطف تھا۔ عامل شاہ نے ڈیز گروپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوستوں یہ غریب خانہ بے تکلف ہے، آرام کے لیے جو جگہ چاہو منتخب کر لینا، میں تمہیں ایک معزز مہمان کا درجہ دیتا ہوں۔"

ڈیز گروپ نے ممنونیت سے گردن جھکا دی تھی۔

رات کو عامل شاہ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے میرے باپ سے ابتدا کرو، آؤ اس بلند جگہ چلتے ہیں جہاں سے ہمیں اس سے بات کرنے میں لطف آئے گا۔"

میں نے گردن خم کردی اور اس کے بعد ہم اس ٹوپی نما چٹان کے پاس پہنچ گئے جس کے چاروں طرف سنسان رات پھیلی ہوئی تھی۔ مدہم مدہم روشنیوں میں منظر بے حد عجیب نظر آ رہا تھا، عامل شاہ مسکرا کر میرے پاس بیٹھ گیا اور پھر میں انسٹافون پر صفدر شاہ کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد دوسری طرف سے رابطہ قائم ہو گیا۔

"کون ہے......؟"

"صفدر شاہ سے بات کراؤ۔"

"کون بول رہا ہے؟"

"اس کا بدترین دشمن۔" میں نے پروگرام کے مطابق غراتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کرتے ہو، صفدر شاہ کے دشمن یہاں جی نہیں سکتے۔"

"مگر میں زندہ ہوں اسے صرف اتنا بتادو کہ وہ بات کرنا چاہتا ہے، جس کے لیے وہ پریشان ہے۔" دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔

عامل شاہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا میں انتظار کرنے لگا پھر آواز آئی۔

"تھوڑی دیر انتظار کرو، ابھی رابطہ قائم ہوا جاتا ہے۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

ذرا دیر بعد سیٹ پر ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کون ہے تو، میں صفدر شاہ بول رہا ہوں؟"

"فی الحال دشمنوں میں شمار کرو مجھے صفدر شاہ، ہو سکتا ہے یہ دشمنی دوستی میں بدل جائے، فی الحال مجھے اپنا بدترین دشمن سمجھو۔"

"میری بستی میں، میرے علاقے میں تو کب تک جی سکتا ہے کتے۔ کہاں چھپا ہوا ہے سامنے آ کر بات کر، مردوں کی طرح۔"

"ایسی باتیں مجھے متاثر نہیں کرتیں۔ جہاں بھی چھپا ہوا ہوں، خود کو محفوظ سمجھتا ہوں، لیکن تم بالکل غیر محفوظ ہو، میں نے تمہارے گوداموں کی تصاویر بنالی ہیں اور اگر یہ تصویریں میں سرکاری حکام کو فروخت کرنا چاہوں تو مجھے ان کی شاندار قیمت مل سکتی ہے۔ میں اگر چاہوں تو اخبارات کو بھی یہ تصاویر فراہم کر سکتا ہوں۔ ان تمام تفصیلات کے ساتھ اور اس کے بعد صفدر شاہ تمہیں اپنے اس تمام کاروبار سے محروم ہونا پڑے گا۔ کیا سمجھے، میرا خیال ہے کہ اب تم سمجھ چکے ہو گے کہ میں کون ہوں۔"

"میرے خیال میں تجھے کسی ایسی کتیا نے جنم دیا ہے جو خارش زدہ ہوگی۔ ایک بار میرے ہاتھ آ......بس ایک بار۔ میں تجھ سے پورا تعارف کرادوں گا اپنا۔"

"تم کوشش تو کر رہے ہو مجھے پکڑنے کی اور دلاور جان تعاون کر رہا ہے۔"

"بہت خوش ہے تو اس بات پر کہ ابھی ہمارے ہاتھ نہیں آیا، خوش ہولے مگر تیری یہ خوشی عارضی ہوگی۔"

"ابھی تک تو تم کچھ نہیں کر سکے۔"
"ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے' تیری یہ خواہش پوری ہو جائے گی' پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی ہے ہم نے۔"
"اور میں تمہاری شہ رگ پر بیٹھا ہوا ہوں۔"
"کتے کی اولاد...... کب تک چوہے کے بل میں چھپا رہے گا' نکال لیں گے ہم تجھے۔ نر کا بچہ تو سامنے آ کر بات کر۔" صفدر شاہ نے کہا۔
"افسوس کچھ ایسی بات ہو گئی ہے کہ اب تمہارے لیے کوئی بُرا لفظ استعمال نہیں کر سکتا۔" میں نے مسکرا کر عامل شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور کیا کہنا ہے تجھے؟"
"ایک اہم انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ دنیا میں نسلیں بیٹوں سے چلتی ہیں۔ کیا تم دولت کے لیے اپنی نسل کشی کرنا پسند کرو گے؟"
"کتے کے بچے' تیری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"
"کاش میں بھی جواب میں یہی کہہ سکتا۔" میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔
"سنو! تمہاری نسل تباہ ہو رہی ہے' اسے بچانا چاہتے ہو تو مجھ سے بات کرو۔"
"تُو کیا بکواس کر رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"
"تمہارا بیٹا عامل شاہ میرے قبضے میں ہے' اس وقت وہ جس حالت میں ہے اس کی تصویر زبانی سن لو وہ الٹا لٹکا ہوا ہے' اس سے چار فٹ کے فاصلے پر انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ اس کا بدن بے لباس ہے' ابھی اس پر اذیتوں کا آغاز نہیں کیا گیا ہے۔"
"کک...... کیا بکواس کر رہا ہے؟"
"اگر تم مہذب نہ ہوئے اور اس کے بعد تمہاری زبان سے ایک بھی گالی نکلی تو اس پر عذاب شروع ہو جائے گا۔"
"بکواس...... جھوٹ۔" صفدر شاہ کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔
"تو پھر سنو۔" میں نے عامل شاہ کو اشارہ کیا اور فون اس کے قریب کر دیا۔
عامل شاہ تو صداکار تھا اس نے فوراً کہا۔
"آہ...... آہ...... میری پنڈلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ کھول دو' خدا کے لیے مجھے کھول دو۔ کھول دو میرا سر چکرا رہا ہے۔ مر رہا ہوں میں۔ آہ...... آہ......"
ایسی اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز تھی کہ میں بھی دنگ رہ گیا۔ دوسری طرف سے صفدر شاہ کی تڑپتی ہوئی آواز سنائی دی۔
"یہ تُو ہے......؟ میرے بچے عامل۔"
"بچالو بابا جان' بچالو مجھے۔ آہ! میری پنڈلیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ بابا جان مر جاؤں گا میں...... مجھے بچالو' خدا کے لیے مجھے بچالو۔"
"کیا ہو رہا ہے یہ...... کہاں ہے تو...... کون لوگ ہیں یہ؟"
"بچالو مجھے بابا جان بچالو...... آہ مجھے بچالو۔"
عامل شاہ اس بلا کی صداکاری کر رہا تھا کہ اسے داد دینے کو جی چاہ رہا تھا۔
صفدر شاہ کی آواز سنائی دی۔
"دشمن کہاں ہے تُو' میری بات سن۔ فون اپنے چہرے کے قریب کر' میں تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"میں زیادہ دور نہیں ہوں تمہارے لختِ جگر سے صفدر شاہ' بولو کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"
"کیا چاہتا ہے تو' آہ تو نے کیا سلوک کر رکھا ہے میرے بچے کے ساتھ۔ سن فوراً کھول دے اسے ورنہ تیری نسلوں کو تباہ کر دوں گا میں' ہر اس شخص کو تباہ کر دوں

گا جو تیرا نام بھی جانتا ہوگا۔''
''ضرور تباہ کر دینا لیکن اس وقت جب تمہارے بیٹے کی لاش تمہارے پاس پہنچ جائے' تم سے گفتگو آخری مراحل میں ہے۔ اس کے بعد اس پر اذیتوں کا آغاز ہو جائے گا۔ ہم اس کی دونوں آنکھیں نکال دیں گے' اس کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں کاٹ دیں گے' اس کے جسم پر جگہ جگہ اتنے داغ لگائیں گے کہ تم وہ داغ گن نہ پاؤ گے اور اس کے بعد تمہارا یہ ٹوٹا پھوٹا بیٹا تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے۔ ابھی یہ زندہ سلامت ہے' لیکن بہت تھوڑا سا وقت لگے گا' اس میں بہت تھوڑا سا وقت لگے گا۔''
صفدر شاہ اتنے کرب سے چیخا کہ خود مجھے اس کی دلدوز چیخوں پر دُکھ ہوا۔
میں نے کہا۔
''سوچ لو صفدر شاہ' فیصلہ کر لو۔''
''نہیں۔ معافی چاہتا ہوں تجھ سے' معاف کر دے مجھے' جو کچھ کہہ چکا ہوں اسے بھول جا۔ جو سزا چاہے دے لینا میری ان باتوں کی مجھے' پہلے اسے کھول دے' الٹا لٹکے لٹکے اس کی پنڈلیاں ناکارہ ہو جائیں گی' کھول دے اسے' یوں سمجھ لے کہ جو کچھ تو کہے گا میں مان لوں گا' اپنی گردن پیش کر دوں گا تجھے۔ اگر یہ سلوک تو میرے ساتھ کرنا چاہے' جو تو نے میرے بیٹے کے لیے اپنی ناپاک زبان سے کہا ہے' تو میں اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دوں گا۔''
''نہیں صفدر شاہ' اگر تو میری بات مان لے تو نہ تیرے بیٹے کو کوئی اذیت پہنچے گی اور نہ تجھے' میں بھول جاؤں گا سب کچھ' کہ تو نے کیا کیا نقصانات پہنچائے ہیں میرے وطن کے لوگوں کو۔ بول صفدر شاہ اپنے بیٹے کے عوض یہ سودا کر رہا ہے؟''
''دیوانے' بے وقوف۔ عامل شاہ کے لیے تو میں اپنی ساری کائنات کا سودا کر سکتا ہوں' بہت دولت ہے میرے پاس' اتنی دولت ہے کہ تو سوچ بھی نہیں سکتا' اس جیسے دو شہر آباد کر دوں گا میں دو شہر آباد کر دوں گا۔ میرے بچے کو پہلے کھول دے' اس کی زبان سے یہ کہلوا دے کہ اب وہ بہتر حالت میں ہے۔''
''ٹھیک ہے اچھے تعاون کے لیے تیری اس خواہش پر عمل کر رہا ہوں۔ کھول دو اسے۔'' میں نے اس طرح کہا جیسے اپنے ساتھیوں کو حکم دے رہا ہوں' پھر چند لمحات کے بعد میں نے ٹیلیفون سیٹ عامل شاہ کے سامنے رکھ دیا۔
''اس کی بات مان لو بابا...... بابا جان اس کی بات مان لو......
یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر دو...... ورنہ ورنہ یہ بڑے وحشی لوگ ہیں۔
بابا جان یہ مجھے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیں گے۔ اس کی بات مان لو' خدا کے لیے اس کی بات مان لو۔''
''انہوں نے تجھے کھول دیا......؟''
''ہاں' بابا جان مگر میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا' آہ! میری پنڈلیاں ناکارہ ہوگئی ہیں۔''
''دیکھو' کون ہو؟ تم کسی سے اس کی پنڈلیاں ملوا کر اس کا دوران خون بحال کرا دو' تمہارا احسان ہوگا مجھ پر۔ اسے فوری طبی امداد دو' یوں سمجھ لو غلام بن گیا ہوں تمہارا' میری زندگی اب تمہاری مٹھی میں ہے۔''
''ایک عظیم باپ کی شکل میں تمہیں سلام کرتا ہوں صفدر شاہ' تمہاری یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی' اب سنو اس ٹیلیفون سے ایک ٹیپ ریکارڈ منسلک ہے' جس پہ تمہاری تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ یہ اعترافات تمہارے انحراف کی شکل میں جس طرح بھی ممکن ہوئے تمہارے خلاف استعمال کیے

جائیں گے لیکن تمہیں اپنا اسٹیٹمنٹ دینا ہوگا' اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے۔''
''فون اُسے دو۔'' صفدر شاہ نے کہا اور میں نے فون عامل شاہ کے سامنے کر دیا۔ عامل شاہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔
''بابا جان۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''عامل' میرے بیٹے! تکلیف کم ہوئی؟''
''ہاں بابا جان۔ اب ٹھیک ہوں۔''
''فکر مت کرو' میری جان میں تجھے زندگی دے کر بھی بچا لوں گا' فکر نہ کرنا سب ٹھیک ہو جائے گا' فون اسے دے دو۔''
''ہاں! صفدر شاہ۔''
''بولو' کیا چاہتے ہو؟''
''تمہارے جرائم کی تفصیل۔''
''کہاں سے شروع کروں؟''
''جہاں سے تم نے مجرمانہ زندگی کا آغاز کیا۔''
''تفصیل طویل ہو جائے گی' مختصر مگر کام کی بات ہو۔ میں صفدر شاہ اعتراف کرتا ہوں کہ پچھلے تیرہ سال سے میں منشیات کا تاجر ہوں' میں نے کروڑوں روپے کی ہیروئن مختلف ملکوں کو فروخت کی ہے۔ اس کے بعد میں نے دوسرے ناجائز کاروبار کیے۔ اس وقت ملک کے دوسرے شہروں کے تمام بینکوں میں میری کوئی اسّی ارب ڈالر کی دولت جمع ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں میرے بیس ارب ڈالر جمع ہیں۔ میں اب اسلحہ کی تجارت کر رہا ہوں اس کے علاوہ جعلی کرنسی کا بہت بڑا کاروبار بھی ہے۔ یہ کرنسی کئی ملکوں سے چھپ کر میرے پاس آتی ہے اور میں اس کا سب سے بڑا مقامی ڈیلر ہوں۔ یہ تمام اعترافات میں پورے ہوش و حواس میں کر رہا ہوں۔''
''اطمینان بخش اعتراف ہے۔''
''اور کیا چاہتے ہو؟''
''دلاور جان کے بارے میں معلومات۔''
''دلاور جان مجھ سے بڑا اسمگلر ہے' وہ اس وقت سویابین اسمگل کر رہا ہے۔''
''کیا طریقہ کار ہے اس کا؟''
''خدا کی قسم نہیں جانتا۔ اگر جانتا تو اس وقت تم سے کچھ نہیں چھپاتا۔ اس کا طریقہ کار مجھے نہیں معلوم۔''
''تاربین کے جنگلات میں اس کی رہائش گاہ ہے۔''
''سب کچھ وہیں سے ہوتا ہے۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے اپنا صرف ایک پوائنٹ بنا رکھا ہے باقی اس کا کسی جگہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پوائنٹ کو اس نے سب سے مضبوط جگہ بنا رکھا ہے۔''
''کیا تم تاربین کے جنگلات میں اس کے گھر گئے ہو؟''
''ہاں جاتا رہتا ہوں۔''
''اس جگہ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟''
''تاربین کے جنگلات سے گزرنا ہوتا ہے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''
''کیا ان جنگلات سے گزرنا ممکن نہیں''
''بالکل' وہ سب جانتا ہے کہ کون کب ادھر داخل ہوا ہے۔''
''کوئی طریقہ ایسا بتاؤ جس سے اس تک پہنچا جا سکے؟''
''میں نہیں جانتا۔''
''کیا اسے وہاں بیٹھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جنگل میں کون داخل ہوا؟''
''وہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ میری بات پر یقین کرو اگر معلوم ہوتا تو تم سے کچھ نہ چھپاتا۔'' صفدر شاہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سے بے پناہ خوف ٹپک رہا تھا۔

”مسٹر صفدر شاہ یہ تمام اعترافات ریکارڈ ہو چکے ہیں، کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ان اعتراضات کے بعد تمہاری کیا پوزیشن ہو گئی ہے؟“

”صرف میرے بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔“

”کیا مطلب ہے......؟“

”ان سے صرف میں پھنستا ہوں۔ میرے بچے نہیں پھنستے اور یہ سچ بھی ہے۔ عامل بالکل بے گناہ ہے اسے چھوڑ دوستو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ......“

”صفدر شاہ، عامل شاہ کو ابھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔

”تمہیں دلاور جان کے خلاف ہماری مدد کرنا ہو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں جرم کی یہ زندگی بھی ختم کرنی ہو گی۔ بہت سے کاموں کے بعد تمہیں اپنے بیٹے کی صورت دیکھنا نصیب ہو گی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“

”آہ میں...... میں اس تصور سے ہی مر جاؤں گا کہ وہ......وہ کسی کی قید میں ہے۔“

”اس کی زندگی تمہارے آئندہ تعاون سے بچے گی، ہاں یہ وعدہ ہے تم سے کہ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی لیکن صرف اس شرط پر کہ تم تعاون کرو گے۔“ میں نے فون بند کر دیا۔

عامل شاہ کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مفہوم میری سمجھ میں آ گیا۔

”ہاں عامل شاہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا؟“

”وہ ایک قابلِ رشک باپ ہے۔ میں نے اس سے قبل محبت کا یہ معیار نہیں دیکھا۔“

عامل شاہ مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”اسے معاف کر دو دوست، تمہارے اس حکم کی تعمیل کروں گا اور میں جھوٹا انسان نہیں ہوں۔“

عامل شاہ نے یہ جگہ خوب بنائی تھی۔ تین چار دن ہم نے بالکل خاموشی سے گزارے۔ راتوں کو ہم تاربین کے جنگلات کا تجزیہ کرتے رہے۔ اس دوران ایک رات ہنگامہ خیز رہی تھی۔ اس رات ٹرکوں کی ایک لمبی قطار ان جنگلات میں داخل ہوئی تھی۔ کوئی سو کے قریب ٹرک تھے جو جنگل میں غائب ہو گئے تھے۔ پھر دوسری رات وہ واپس ہوئے تھے۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان میں کیا آیا ہے۔ بیرونی خبریں، رمضان خان اور امانت گل دیتے رہتے تھے۔ امانت گل نے بتایا کہ اس کی بھاوج سبیلہ بہت غمزدہ ہوئی تھی، اس کا خیال تھا کہ ہم سب دلاور جان کے ستائے ہوئے ہیں۔ امانت گل نے اسے حقیقت نہیں بتائی تھی۔

اس وقت بھی ہم ٹیلے سے تاربین کے جنگلات کا جائزہ لے رہے تھے اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ اچانک ڈیز ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

”کچھ کہنا ہے چیف!“

میں اور عامل شاہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے......؟“

”ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تاربین کے جنگلات میں داخل ہو کر دلاور جان کا یہ ٹھکانہ تباہ کر دیں۔ بہت انتظار ہو گیا، اب عمل ضروری ہو گیا ہے۔“

”چیف ابھی تک ہمارے ذہنوں میں کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ بس یہ بات ہمارے علم میں آئی ہے کہ تاربین کے ان چھدرے اور گھنے درختوں سے گزر کر ہمارا مرکز ایک ایسی عمارت ہے جہاں سے ہمارے ملک کی معاشی زندگی کے لیے بدترین کارروائیاں ہوتی ہیں، ہم کارروائیوں کے اس مرکز کو جس طرح بھی بن پڑا فنا کر دیں گے۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جو کچھ بھی کرو۔ اس کی منصوبہ بندی اتنی مضبوط ہو کہ ناکامی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو۔ خدانخواستہ تم ناکام رہے تو اس ناکامی

کے اثرات پورے وطن پر پڑیں گے۔ دلاور جان ہوشیار ہو جائے گا اور ہم نے اب تک جو کیا ہے وہ سب مٹی میں مل جائے گا۔"

ڈیز گروپ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح مشورے کرتے رہے۔ پھر ڈی فائیو نے کہا۔

"چیف آج کی رات فیصلے کی رات ہے۔ آج ہم کوئی کام کرنے نہیں جا رہے لیکن کل ہم کوئی ایسا موثر منصوبہ تیار کریں گے جس سے ہم تاربین کے جنگلات میں داخل ہو کر اپنا فرض پورا کر سکیں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ وہ سب آرام کرنے چلے گئے تو عامل شاہ نے مجھ سے کہا۔

"آپ کو بھی نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں۔ کہو کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔ میں آپ لوگوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ بہت جذباتی ہو گیا ہوں۔ ایک بار دل میں پھر کچھ سوالات جاگ رہے ہیں۔ بہت کہنے کو جی چاہ رہا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ میرا اس نیک کام میں کیا کردار ہو گا؟"

میں نے گہری نگاہوں سے عامل شاہ کو دیکھا۔ پھر کہا۔

"عامل شاہ، تم نے اپنا فرض تو ادا کر دیا ہے۔ کم از کم اس وقت تو صفدر شاہ ہمارا مد مقابل نہیں ہے، کیا یہ کم ہے کہ ہم تمہاری وجہ سے دو طاقتوں کے درمیان پسنے سے بچ گئے اور اس وقت صرف دلاور جان کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ یہ آسانی تم نے فراہم کی ہے ورنہ شاید یہ سب کچھ اتنا آسان نہ ہوتا۔"

"آپ مجھے ٹال رہے ہیں مسٹر جہانزیب، میں دل کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک آپ نے مجھے بتایا ہے کہ اس میں میرے وطن کی بقا مضمر ہے۔ میں بھی اپنی اس زمین سے پیار کرتا ہوں، اس کے لیے شخصیات تک بات کا محدود رہنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے بھی میری اس زمین کے لیے کچھ کرنے کا موقع دیجئے، جو ہوا ہے وہ تو ایک تجویز تھی ایک تدبیر تھی لیکن میں عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"وعدہ کرتے ہو کہ جو کچھ میں کہوں گا وہی کرو گے۔"

"وعدہ کرتا ہوں اور اس وعدے کے لیے نہ کوئی قسم کھاؤں گا اور نہ ہی اعتماد دلاؤں گا۔ یہ دل سے دل کا معاملہ ہے، آپ کا دل گواہی دے تو مجھ پر یقین کر لیجئے۔"

"یقین نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وعدہ کیا ہے تو سنو، تم یہاں مقیم رہو، ایلا اور اس کی والدہ کا خیال رکھو۔ اپنے آپ کو ہمارے لیے محفوظ رکھو تاکہ صفدر شاہ فوراً کوئی عمل نہ کر سکے اور جب ہم کامیاب ہو کر واپس آئیں گے تو تم سے دل کی وہ بات کہیں گے جو ہمارے سینے میں تمہارے لیے ہے۔ اس وقت تک کے لیے تم نہ کوئی ضد کرو گے اور نہ ہی برا مانو گے اور نہ یہ سمجھو گے کہ ہم نے تمہاری خواہش کی تکمیل نہیں کی۔

یوں سمجھو کہ اس مہم کے مختلف حصے ہیں اور اس مہم کے لیے کام کرنے والوں کی مختلف ذمہ داریاں ہیں، رمضان خان اور امانت گل دونوں باہر کے معاملات سے نمٹ رہے ہیں۔ تمہیں ان سے بھی رابطے رکھنے ہوں گے اور یہاں تم ہماری کامیابی کے منتظر رہو۔ یہی اس وقت تمہارا سب سے بڑا کارنامہ ہو گا۔"

عامل شاہ نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی اور بولا۔

"ٹھیک ہے اس ہدایت پر عمل کروں گا۔"

اس کے بعد میں بھی آرام کرنے چلا گیا تھا۔

ڈیز گروپ رات بھر نجانے کیا منصوبہ بندیاں کرتے رہے لیکن میں نے ایک دو بار ان کی آہٹیں

محسوس کی تھیں۔ جیسے وہ سوئے نہ ہوں جاگ رہے ہوں اور کچھ کر رہے ہوں۔ صبح کو البتہ عامل نے بتایا کہ پانچوں کے پانچوں گہری نیند سو رہے ہیں۔

ڈیز گروپ کے خراٹے کمرے کے نیم تاریک ماحول میں ابھر رہے تھے۔ ہم نے اس کمرے کے ایک کونے میں درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں کے ڈھیر دیکھے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی تین تین فٹ لمبی لکڑیاں جن میں سے کوئی کوئی چار اور پانچ فٹ کی بھی تھیں نظر آئیں۔ یہ لکڑیاں مضبوط اور ایک خاص طریقے سے چھیل کر بنائی ہوئی تھیں۔ نہ صرف میں نے بلکہ عامل شاہ نے بھی اس انوکھے ذخیرے کو دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل آئے۔ عامل شاہ بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تاربین کے جنگلات تک پہنچ گئے۔ یہ پتے اور ٹہنیاں تاربین کے جنگلات کے درختوں کی ہیں۔''

''وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اچھا یہ بتائیے کہ ناشتا ان کے بغیر کریں گے یا پھر ان کا انتظار کیا جائے؟''

''نہیں بھئی، مجھے تو بھوک لگ رہی ہے اور ان کے انداز سے لگ رہا ہے ابھی وہ دیر تک سوئیں گے۔''

''تو پھر آیئے ہم ناشتا کریں۔'' عامل نے کہا۔

ایلا نے ناشتا تیار کیا اور پھر ہم دونوں نے ناشتا کیا۔ اس دوران باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر ہم حیران رہ گئے کیونکہ ناشتا کر کے ہم چائے کے گھونٹ پی رہے تھے کہ پانچوں ہمارے سامنے پہنچ گئے لیکن اس طرح تیار جیسے صبح سے تیار بیٹھے ہوں۔ عامل شاہ بے اختیار ہنس پڑا تھا اور وہ بھی ناشتے میں شامل ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

''تم لوگ رات کو کیا کرتے رہے؟''

''تاربین کے آس پاس چکراتے رہے یہ جائزہ لیتے رہے کہ وہاں انتظامات کس قسم کے ہوتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ وہاں عام طور سے انسان نظر نہیں آتے یا ہوتے بھی ہیں تو اس طرح ساکت اور اپنی جگہ محدود کہ ہم انہیں گشت پر نہیں کہہ سکتے جہاں تک میرا اندازہ ہے تاربین کے جنگلات میں باقاعدہ ایسے انتظامات کیے گئے ہیں کہ اگر کوئی ان میں داخل ہو تو اپنے آپ ہی مصیبتوں کا شکار ہوتا رہے۔ شکنجے جگہ جگہ ہوئے ہیں۔''

''لازمی بات ہے مگر تمہارے کمرے میں لکڑی اور پتوں کے انبار کس لیے ہیں؟''

''ہم اپنے منصوبے کی تمام تفصیل آپ کو بتا دیں گے اور اس کے ایک مرحلے پر عمل کر چکے ہیں۔''

''وہ کیا......؟''

''ضروری ساز و سامان تاربین کے جنگلات کے ابتدائی سروں پر پہنچا دیا گیا ہے۔ ہم اب پوری طرح مستعد ہو کر وہاں جائیں گے۔ یہ ضروری سامان ہیڈ کوارٹر کی تباہی کے کام آئے گا۔''

''تم وہ چیزیں تاربین میں چھوڑ آئے ہو؟ اگر تمہارا خیال ہے کہ وہاں سائنسی ذرائع سے حفاظت کا بندوبست کیا گیا ہے تو کیا تمہارا پہنچایا ہوا سامان کسی کی نگاہوں میں نہیں آئے گا۔''

''آپ مطمئن رہیں۔ ہمارا ساز و سامان محفوظ رہے گا۔''

''معاہدہ کے مطابق چیف ہم آپ کو اپنا منصوبہ بتانے کے لیے مجبور ہیں۔ تشریف لایئے۔'' ڈی ون نے کہا۔

وہ لوگ مجھے اور عامل کو ایک کھلی جگہ لے گئے۔ ڈی ون نے باقی چاروں کو اشارہ کیا اور وہ چاروں اندر چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد وہ لکڑیاں اور پتے وغیرہ اُٹھا کر

ہمارے پاس آ گئے، پھر انہوں نے زمین پر بیٹھ کر مختلف سائز کی لکڑیاں اپنے پیروں میں باندھنا شروع کر دیں۔ انہیں خاص طریقے سے تسموں کے ذریعے انہوں نے اپنے پیروں سے باندھا تھا، جس جگہ وہ یہ مظاہرہ کررہے تھے وہ خاصی وسیع وعریض تھی۔ پتے اور شاخیں انہوں نے اپنے جسم میں اس طرح سے باندھیں کہ وہ چھوٹے موٹے درختوں کی شکل اختیار کر گئے اور کچھ دیر کے بعد وہ اپنے اس کام سے فارغ ہو گئے۔ نہ صرف عامل بلکہ عقب میں ایلا اور اس کی ماں بھی کھڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ ایلا دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن شاید اسے کوئی احساس ہو گیا تھا اس کی ماں آہستہ لہجے میں اسے کچھ بتارہی تھی ڈیز گروپ نے لکڑیوں کے سہارے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور اس کے بعد یقینی طور پر وہ چھوٹے چھوٹے درختوں کی شکل میں نظر آنے لگے۔ انہوں نے نہایت مہارت سے دونوں پاؤں اس طرح جوڑ لیے کہ ایک ناقابلِ یقین شکل سامنے آ گئی۔ اگر کوئی سرسری نگاہ سے دیکھے تو وہ درخت کا نچلا حصہ ہی محسوس ہو، شاخیں اس طرح جسم میں اُگائی یا سجائی گئی تھیں کہ وہ درختوں سے پھوٹتی ہوئی شاخیں محسوس ہوں۔ عامل شاہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''اوہ خدایا! جہانزیب صاحب مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ یہ زمین کی مخلوق نہیں ہے آپ ذرا ٹیلے پر چل کے دیکھئے تاربین کے جنگلات میں اونچے اور گھنے درختوں کے ساتھ ساتھ بالکل ایسے درختوں کی بہتات بھی ہے جن کی شکل انہوں نے اس وقت اختیار کی ہے اور اگر سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ تاربین کے جنگلات میں کھڑے ہوئے درخت ہی محسوس ہوتے ہیں۔''

عامل یہ کہہ رہا تھا کہ دفعتاً وہ متحرک ہو گئے۔ وہ برق رفتاری سے اپنی جگہ تبدیل کررہے تھے۔ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ لکڑی کے ان ٹکڑوں پر اس برق رفتاری سے چلا جاسکتا ہے، وہ لوگ ایسی دھماچوکڑی مچائے ہوئے تھے کہ ہماری نگاہیں ان پر ٹک نہیں رہی تھیں۔ تقریباً دس منٹ تک وہ اپنی اس حیرت انگیز صفت کا مظاہرہ کرتے رہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گئے۔ لکڑیاں اور پتے کھول دیئے پھر ہمارے سامنے آ کر گردنیں خم کیں۔ ڈی ون نے کہا۔

''ہم اس طرح جنگلوں میں اپنے لیے جگہ بنائیں گے وہاں ہمیں متحرک ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، اگر کسی کو یہ شبہ ہو گیا کہ کوئی جنگل میں داخل ہوا ہے تو اسے داخل ہونے والے کو تلاش کرنے میں دانتوں پسینے آجائیں گے اور یہ ننھے ننھے زہریلے ستارے اسے زندگی سے محروم کردیں گے۔ یہ دیکھئے ان ستاروں کے چھ کونے ہیں اور ان میں ایک خاص قسم کے جانور کا زہر پوشیدہ ہے، آپ کو شاید اس زہریلے پہاڑی بچھو کے بارے میں علم ہو جو پتھر پر ڈنگ مارتا ہے تو پتھر جل کر خاک ہو جاتا ہے اور اس پتھر کا ایک ریزہ انسانی زبان تک پہنچ جائے تو وہ کچھ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہتا۔ یہ پہاڑی بچھو ہمیں چلی کے نواح میں دستیاب ہو گیا تھا اور ہم نے اس کا زہر محفوظ کرلیا تھا۔''

''کہاں......؟''میں نے بے اختیار پوچھا۔

''ڈیز گروپ میں سے ایک بولا۔

''ہمارے لباس میں ایسے بے شمار ننھے ننھے خانے موجود ہیں جو ایسی چیزیں چھپا سکتے ہیں۔''

عامل شاہ پھر ہنس پڑا تھا اس نے کہا۔

''میں صرف ایک بات کہوں گا' جہانزیب صاحب کہ یہ لوگ بہت ذہین ہیں اور دلاور جان کی شامت آ گئی ہے۔''

میں نے تشویش زدہ نگاہوں سے ڈیز گروپ کو

دیکھ کر کہا۔

"اس طرح تم ان کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچ جاؤ گے اور اسے تباہ کر دو گے۔"

"اسے تباہ کرنے کے بعد ہم آپ کے پاس پہنچیں گے اور سرخرو ہو کر گردنیں خم کر دیں گے۔"

"میں اس تجویز میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ تم اپنا کام بے شک جاری رکھو گے لیکن تمہاری تمام تر یہی کوشش ہو گی کہ تم اس ہیڈ کوارٹر کے آس پاس رہو اور تمہارے ٹرانس میٹر آن رہیں گے، میں تمہیں اس صورت حال کی اطلاع دیتا رہوں گا جو درپیش آ رہی ہو، بلکہ جو کچھ مجھے پیش آ رہا ہو گا وہ تمہارے کانوں سے دور نہ رہ سکے گا۔ تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو گے، میں تاربین کے جنگلات میں جا کر گرفتار ہونا چاہتا ہوں۔" سب حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے اور پریشان تھے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

"میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں یہ پانچوں ذہین لوگ ہر کام کر سکتے ہیں لیکن میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ میرے پورے پروگرام پر مشتمل ہے۔ دلاور جان سے ایک ملاقات اور اس کے بعد اس کے اغراض و مقاصد، اس کی پہنچ اور اس کا عمل میرے علم میں آنا ضروری ہے اور اس کے لیے مجھے اپنے آپ کو اس کی تحویل میں دینا ہو گا۔"

"لیکن دلاور جان دیوانہ ہے اگر اس نے اس دیوانگی میں آپ پر حملہ کر دیا تو آپ کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے اور اس طرح تو سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔"

"نہیں دوست۔ اب مجھے اس قدر ناکارہ بھی نہ سمجھو اور درخواست میں اپنے ان ساتھیوں سے کروں گا۔ میرا کام بہت ضروری ہے اور اس میں کوئی ترمیم میرے لیے ناقابلِ قبول ہو گی، جبکہ میں تم لوگوں کا منصوبہ مسترد کر سکتا ہوں۔ تم لوگ سمجھتے نہیں یہ انتہائی ذاتی معاملہ ہے اور یہ سب کچھ کرنا میرے لیے ازحد ضروری ہے، تاربین کے جنگلات میں داخل ہونے کا منصوبہ تو میرے ذہن میں بھی تھا، بس اتنا وقت اسی لیے صرف کیا کہ وہاں تک پہنچنے کی کوئی ایسی صورت حال ہو کہ مجھے تھوڑا سا بیرونی تحفظ بھی مل سکے۔"

عامل شاہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"میں ان دلکش لمحات کا ساتھی نہ بن سکوں گا مجھے تو اس کا بے حد افسوس رہے گا۔"

"دوست ہم پکنک پر نہیں جا رہے اور نہ ہی تمہیں ایسی بات سوچنی چاہیے، عمل کامل ہونا چاہیے۔ بس یہی ہم سب کی خواہش ہے۔"

عامل شاہ نے سمجھ جانے والے انداز میں گردن ہلا دی تھی اور اس کے بعد ڈیز گروپ ہم سے اجازت لے کر اپنی رہائش گاہ میں جا گھسے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ اب اس منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی اور اس کا آغاز آج رات ٹھیک نو بجے کر دیا جائے گا۔ دلاور جان کو اس طرح قتل کر دینا یا اس کا ہیڈ کوارٹر تباہ کر دینا بے شک ایک بڑا کام تھا لیکن اس کے بعد یہ خیال ستاتا رہتا کہ کہیں کوئی خامی نہ رہ گئی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دلاور جان اس سلسلے میں کوئی اور راہ ڈھونڈ لے اور بعد میں وہ اپنا کام اسی انداز میں پھر سے جاری کر دے۔ میں تو اطمینان بخش تکمیل چاہتا تھا تاکہ اس منصوبے میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔ میں نے باقی دن پُرسکون گزارا تھا ہاں تھوڑی سی منصوبہ بندی میں نے بھی اپنے ذہن میں کر لی تھی اور تمام تیاری مکمل کر لی تھی۔ وہ اشیاء جن کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی سب جمع کر لی گئی تھیں اور ساتھ ہی قمیص میں لگنے والے چھوٹے ٹرانسمیٹر بھی آپس میں بانٹ لیے تھے۔ ایک کیمرہ بھی احتیاطاً رکھ لیا تھا۔ یہ تمام چیزیں وہ تھیں جنہیں

اصل میں، میں نے دلاور جان کے لیے اپنے پاس رکھی تھیں۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ دن میں مطلع بالکل صاف تھا لیکن جونہی رات ڈھلی، آسمان پر گھرے بادل جمع ہونے شروع ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے لیے نیک فال قرار دیا کیونکہ اس طرح دشمن کی نگاہوں سے چھپنے کا موقع مل سکتا تھا۔ ہولناک جنگل اپنی روایتی کیفیت میں میرے سامنے تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ میں جنگل میں تنہا ہوں۔

میرے اس محتاط سفر کو تقریباً بیس منٹ گزر گئے اور میں جنگل میں بہت دور نکل آیا تھا۔ پھر اس وقت میں ایک تناور گھنے درخت کے پاس سے گزر رہا تھا کہ معرکہ شروع ہو گیا۔ پستول پر ویسے بھی میں نے سخت گرفت نہیں رکھی تھی لیکن اس پر پڑنے والے ہاتھ میں بھی مہارت تھی کیونکہ وہ نہایت صفائی ستھرائی سے میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ فوراً ہی عقب سے تین ہاتھ میرے بدن کے مختلف حصوں کو چھونے لگے۔ ایک گردن کو، دوسرا کنپٹی اور تیسرا کمر کو۔ پھر ایک کرخت آواز سنائی دی۔

''تم تین پستولوں کی زد پر ہو۔ ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ زندہ رہو۔'' میرے دونوں ہاتھ بلند ہو گئے تھے۔

''تلاشی لو۔'' وہی آواز سنائی دی اور کمر پر سے پستول کا دباؤ ختم ہو گیا' سیاہ لبادے میں لپٹے ہوئے شخص نے سامنے آ کر میری جیبوں سے لے کر ٹخنوں تک کی تلاشی لے ڈالی۔ فالتو راؤنڈ کے علاوہ میرے پاس سے اور کیا برآمد ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' تلاشی لینے والے شخص نے کہا۔ ''دلاور... سردار دلاور جان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے اجنبیت کا اظہار کرو گے؟'' وہی آواز سنائی دی۔ بولنے والا صاف اُردو بول رہا تھا۔

''کیا مطلب......؟''

''وقت ضائع کرنا چاہتے ہو یا کسی کا انتظار' تاریکی میں خفیہ طور پر پستول لے کر داخل ہونے والا کوئی مسخرہ نہیں ہو سکتا۔''

''چلو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''پستول کے نشانے پر چل رہے ہو۔ اگر کوئی غلط جنبش کی تو دونوں پنڈلیوں میں گولی مار دی جائے گی اور اس کے بعد تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ تمہارے زخموں پر ایک ایسا کیمیکل اسپرے کر دیا جائے گا کہ تم تکلیف محسوس نہیں کر سکو گے اور خون بھی نہیں بہے گا۔ اس طرح تم پورے حواس میں دلاور جان تک پہنچو گے وہ تم سے باتیں کریں گے اور پھر تم مر جاؤ گے۔ وقت سے پہلے مر جانا دانشمندی نہیں ہے۔''

''میں وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔'' میں نے خوشدلی سے کہا۔

''سمجھدار ہو' بائیں سمت مڑ جاؤ۔''

کوئی دس منٹ تک سفر کرنا پڑا تھا۔ پھر کچھ مدھم روشنیاں درختوں سے چھنتی نظر آئیں اور پھر ہم ایک عمارت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تاریکی کی وجہ سے عمارت کا حدود اربعہ تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی رات کی رانی کی مہک نے استقبال کیا۔ بہت تیز خوشبو تھی۔

''چلتے رہو۔'' میرے راہبر نے کہا۔ عمارت کے سامنے والے حصے کے بجائے وہ مجھے بغلی سمت سے لے کر اندر داخل ہو گئے۔ شاید پوری عمارت میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ پاؤں نرم قالین پر ہی پڑ رہے تھے۔ پھر روشنی میں آ گیا نہایت نفیس عمارت بنی ہوئی تھی۔ کئی پیچ در پیچ راستے اختیار کیے پھر ایک بڑے

کمرے میں داخل ہو گیا' وہاں ایک آدمی موجود تھا۔
''خان آپریشن ہال میں ہے۔'' اس نے کہا۔
''مہمان کے بارے میں کوئی ہدایت۔''
''آپریشن ہال میں لے جاؤ۔''
''آؤ!'' وہ شخص بولا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں ان تینوں کو بخوبی دیکھ رہا تھا قوی ہیکل اور خطرناک آدمی تھے۔ ایک لفٹ میں داخل ہو کر پہلی منزل پر پہنچ گئے۔
بڑی ڈرامائی سچویشن پیدا کی گئی تھی۔ یہاں بس چند قدم چلنا پڑا تھا اور اس کے بعد ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں تیز دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر چند چاندی جیسی چمکتی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی با قاعدہ سائنسی تجربے گاہ لگ رہی تھی' کوئی چار انچ موٹا قالین بچھا ہوا تھا اور ایک خاص قسم کی چوڑی کرسی پر ایک شخص شلوار قمیص میں ملبوس بیٹھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت' روشن آنکھیں بس ناک انتہائی بھدی تھی' مونچھیں جبڑوں سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

''میرا نام دلاور جان ہے۔'' وہ بولا۔
''ہیلو۔'' میں نے کہا اور وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ پھر بولا۔
''بیٹھ جاؤ۔'' اشارہ ایک کرسی کی طرف تھا۔ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔
''جیمز بانڈ ہو......؟'' اس نے پوچھا۔
''جو آپ سمجھ لیں ڈاکٹر نو۔''
''ڈاکٹر نو......؟'' وہ حقارت سے بولا۔
''وہ ایک فرضی کردار تھا میں حقیقت ہوں۔''
''جیمز بانڈ ایک اداکار تھا اور میں ......'' میں نے جواب دیا۔
''کاشف۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''جی خان جی۔''
''اس کی آواز سن رہے ہو۔''
''وہی ہے خان اور تم جانتے ہو کاشف صرف ایک بار جو شکل دیکھ لے اور آواز سن لے اس کے دماغ سے کبھی مٹ نہیں سکتی۔''
''تب تو کام کی چیز ہاتھ آئی ہے۔''
''ساری مشکلوں کا حل ہے خان جی۔''
''مشکل......'' اچانک دلاور خان کا لہجہ خون خوار ہو گیا۔
''میرا مطلب ہے خان......''
''یہ جملہ حساب میں درج کرو۔ تمہیں اس بات کی جواب دہی کرنا پڑے گی۔'' دلاور جان نے کہا اور اس شخص کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ دلاور جان میری طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔
''تمہیں کس نام سے مخاطب کروں......؟''
''یوسف......''

وہ ہنسا پھر بولا۔
''دیسی جیمز بانڈ......!''
''سردار دلاور جان۔ جب میں اس عمارت میں داخل ہوا تھا تو مجھے اس عمارت کی ڈرامائی سچویشن کا احساس ہوا تھا اور تم یقین کرو میرے ذہن میں آئن فلمینگ کا خیال آیا تھا۔''
''تمہارے ذہن پر وہی فلمیں سوار ہیں۔''
''ہاں۔ میں اس سے متاثر ہوں۔''
''اندازہ ہو رہا ہے۔''
''یہ باتیں تو ہوئیں میرے بارے میں اب اپنے بارے میں بتاؤ۔''
''میں حاضر ہوں سردار دلاور جان۔'' میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔
''سیکرٹ ایجنٹ ہو۔''

''بالکل نہیں۔''
''کیا......'' وہ چونک پڑا۔
''تو پھر کون ہو؟''
''تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''
''میں جھوٹ بہت کم بولتا ہوں۔ تمہارے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔''
''یہ اچھی بات ہے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے سے سچ بول سکیں گے۔''
''تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ ابھی تک تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''
''ایک بڑا آدمی جب دوسرے بڑے آدمی سے ملتا ہے تو گفتگو میں کچھ اقدار ہونی چاہئیں۔''
''اوہ! میں سمجھا۔'' اچانک دلاور جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے ایک وائرلیس اُٹھا کر اس کا بٹن آن کیا اور بولا۔
''ٹاپ......''
''کیا پوزیشن ہے؟''
''نارمل ہے خان جی۔''
''ایک کام کرو۔ آسمان پر بھی نگاہ رکھو۔ ہوسکتا ہے ہمارے خلاف فضائی کارروائی کی جارہی ہو اور ہر طرف نگرانی سخت کر دو۔'' دلاور جان خاموش ہو کر میری طرف متوجہ ہوا۔
''کیا خیال ہے۔ میں نے تمہاری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔''
''نہیں سردار، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
''سچ بات کی تھی ابھی ہم نے۔''
''یقیناً......''
''کیا تمہیں اپنے ساتھیوں کا انتظار نہیں ہے؟''
''بالکل نہیں۔''
''میرا یہ اندازہ ہے کہ تم نے کوئی فضائی بندوبست کیا ہے اور اپنے آدمیوں کے پہنچنے کا انتظار کر رہے ہو۔''
''نہیں دلاور جان۔''
''خیر جو ہے اس کا پتہ چل جائے گا۔ ہاں اب تم اپنے بارے میں سچ بتادو۔''
''میرا نام یوسف خان ہے اور دولت کے حصول کی اس جنت میں اپنے لیے جگہ تلاش کر رہا ہوں۔ سونے کی اس زمین پر صرف تم چند افراد نے قبضہ کر رکھا ہے۔ دوسروں کو بھی تو موقع دو سردار۔''
''اوئے خانہ خراب۔ بالکل نئی بات کہی ہے تو نے میں نے ادھر سوچا بھی نہیں تھا۔''
''کیا سوچا تھا تم نے میرے بارے میں سردار؟''
''اوئے میں تجھے کوئی سر پھرا جاسوس سمجھتا تھا' جس پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہو۔ مگر کیا ضمانت ہے اس بات کی' کہ تم سچ بول رہے ہو؟''
''میں نے تم سے کوئی ضمانت مانگی ہے سردار!''
''میری بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے اور میری بات کی ضمانت آج تک کسی نے نہیں مانگی اور میری زبان ایک تاریخ ہے جو منہ سے نکل گیا اگر وہ سچ نہ بھی ہو تو ہزاروں لوگ اسے سچ بنا دیتے ہیں۔''
''میں یہی طلسم توڑنا چاہتا ہوں سردار۔''
''تمہارے پاس کتنے ہزار آدمی ہیں؟''
''صرف پانچ اور چھٹا میں ہوں۔''
''جانتا ہے میرے لیے کتنے آدمی کام کرتے ہیں' بارہ سو آدمی ہیں میرے پاس' پورے بارہ سو۔''
''اسی عمارت میں......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''پورے ملک کی بات کر رہا ہوں۔''
''ہوں گے دلاور جان' مجھے اس سے کیا۔''
''چونکہ تو دلاور جان سے ٹکرانے چلا تھا۔ اس لیے اب یہ ضروری ہو گیا کہ میں دلاور جان کا تجھ سے پورا

تعارف کرادوں۔ کیا تو دلاور جان کو جانتا ہے؟"

"کوئی اور بھی دلاور جان ہے؟" میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہے۔ اسے دیکھ اس سے مل۔" دلاور جان نے کہا اور پھر اس نے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ اچانک ہی مجھے اپنا جسم سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے یہ کرسی جنبش کر رہی ہے جس پر میں بیٹھا ہوں۔ میں چکرا گیا' کرسی نے راؤنڈ لیا تھا اور میں نے پورے کمرے کا ماحول بدلتا دیکھا تھا۔ کسی شاندار مشینی نظام کے تحت دیواریں رُخ تبدیل کر رہی تھیں' فرش اپنی جگہ سے کھسک رہا تھا۔ نئی چیزیں سامنے آتی جا رہی تھیں اس میں کنٹرول بورڈ اور بڑے بڑے اسکرین شامل تھے۔ میں دلچسپی سے یہ پورا منظر دیکھتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور دراز پہاڑی علاقے میں اس قسم کا کوئی مشینی نظام تیار کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن ظاہر ہے دلاور جان یہاں اقتدار رکھتا تھا اس کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا پھر سرحد پار سے بھی اس کا رابطہ تھا اور اُدھر سے اس قسم کی ٹیکنالوجی اِدھر منتقل ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ یہاں تک کہ دلاور جان کی کرسی کے سامنے ایک کنٹرول بورڈ بھی آ گیا۔ دلاور جان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ میری دلچسپی کو محسوس کر کے خوش ہو رہا تھا۔

انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کہ کوئی شخص اگر کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے لیتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے دیکھنے والے اور اس پر حیران ہونے والے بھی ہوں' میں نے اپنے چہرے پر اس طرح دلچسپی کے آثار پیدا کر لیے تھے جیسے میں ان تمام چیزوں سے زیادہ مرعوب ہو گیا ہوں اور یہ بات دلاور جان کے ذہنی گوشوں کو نرم کر رہی تھی۔ میرے چہرے کا اشتیاق اسے میری جانب دوستی کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پھر یہ ردوبدل کا عمل ختم ہو گیا اور دلاور جان نے میرے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کیسا لگا یہ سب کچھ' کیا ڈاکٹر نو کی لیبارٹری اس سے زیادہ شاندار تھی؟" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے' کیا کہنا چاہیے آپ کے بارے میں' اگر تعریفی الفاظ استعمال کروں گا تو آپ یہ تصور کریں گے کہ شاید میں آپ سے اپنے لیے کوئی رعایت مانگ رہا ہوں' حالانکہ ایسی بات نہیں ہوگی۔"

"حقیقتوں کو حقیقتوں کے ہی الفاظ دو۔ یہی ایک سچے آدمی کا کام ہوتا ہے تم یہاں اس میرے علاقے میں اپنے پاؤں گاڑنا چاہتے ہو اور وہ بھی صرف چند افراد پر مشتمل گروہ بنا کر' یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے' ہاں اگر یہاں داخل ہوتے ہوئے تم کچھ کرنا ہی چاہتے تھے تو سب سے پہلے دلاور جان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے درخواست کرتے کہ دلاور جان تمہیں اپنے زیرِ پناہ لے لے مگر احمق ہو تم۔ تم نے میرے سترہ آدمیوں کو ہلاک کر دیا اور اپنی دانست میں بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ بارہ سو آدمیوں میں سے اگر سترہ آدمی کم ہو جائیں تو آٹے میں نمک کا حساب بھی نہیں بنتا مجھ پر کیا اثر پڑا لیکن تمہارا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ارے وہ تو معمولی لوگ تھے۔ سڑکوں پر میرے لیے کام کرنے والے۔ بھلا ان کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے میری نگاہوں میں' تمہیں مجھے پوری طرح جان لینا چاہیے تھا اور اگر بات کرتے ہو صفدر شاہ کی تو وہ۔" دلاور جان استہزائیہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔

"اچھا آدمی ہے' مجھ سے ہمیشہ وفادار بھی رہا ہے۔ کام بھی کر لیتا ہے ٹھیک ٹھاک۔ چنانچہ میں نے اسے موقع دے دیا اور کہا جا کھا کما' مجھے تجھ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ باقی جو چھوٹے چھوٹے

تھے وہ اپنی موت آپ مر گئے' یقین کرو میں نے اپنے ہاتھوں سے کبھی کسی کو نہیں مارا لیکن رفتہ رفتہ وہ خود اس طرح فنا ہو گئے کہ اب ان کا نام ونشان باقی نہیں ہے' صفدر شاہ بھی اس وقت تک جی رہا ہے' جب تک میرے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے' جس دن اس نے مجھ سے نگاہیں ملائیں وہ نابینا ہو جائے گا اور تم اس دلاور جان کے مقابلے پر آئے تھے۔ ٹیلیفون پر کیا کہا تھا تم نے مجھ سے......''

''ان حالات میں تو میں معافی بھی نہیں مانگنا چاہتا۔'' میں نے جواب دیا اور دلاور جان کا گرج دار قہقہہ فضا میں بلند ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''خیر' میرے اور تمہارے درمیان تو بہت سی باتیں بعد میں ہوں گی۔ آؤ میں تمہیں اپنا پورا نظام دکھاؤں' دیکھو اور غور کرو۔ تم نے مجھے ڈاکٹر نو ہونے کا طعنہ دیا تھا لیکن پیارے جاسوس تم نہ اس انداز میں کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہو اور نہ تم جاسوس ہو' یہاں پر آ کر تو کہانی بدل جاتی ہے' کیا خیال ہے تمہارا......''

''میں اپنے الفاظ محفوظ رکھنا چاہتا ہوں دلاور جان۔''

''ٹھیک ہے' اس نے کہا۔ یہ ساری باتیں بعد میں ہوں گی۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ دلاور جان کیا ہے۔''

اس نے اپنے سامنے نصب کنٹرول بورڈ پر کچھ ردوبدل کیا اور کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ میرے سامنے وہ بڑی اسکرین روشن تھی جو ایک دیوار کے پلٹ جانے سے سامنے آئی تھی۔ اسکرین پر روشن نقطے تڑپ رہے تھے اور اس کے بعد یہ نقطے آپس میں ملنا شروع ہو گئے پھر ایک رنگین منظر ابھرا' یہ تاربین کے جنگلات کا منظر تھا حالانکہ باہر جنگلات پر تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن اسکرین پر پورا جنگل روشن نظر آ رہا تھا۔ گو یہ روشنی بہت زیادہ تیز نہیں تھی اور رات کا منظر پیش کرتی تھی تاہم اتنی ضرور تھی کہ اسے دیکھا جا سکے' البتہ اس میں سرخ رنگ شامل تھا جس کا مطلب تھا کہ وہاں الٹرا وائلٹ کیمرے نصب ہیں' الٹرا وائلٹ کیمرے رات کی تاریکی کے مناظر پیش کر دیا کرتے ہیں لیکن ان کی روشنی سرخ ہوتی ہے' یہ رنگین مناظر ہلکے ہلکے رنگ اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ان پر سرخ رنگ نمایاں تھا۔ میں نے سمجھنے کے باوجود بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ دلاور کی آواز ابھری۔

''یہ تاربین کے جنگلات ہیں' میری ملکیت' ان کی سرحدوں میں اندر داخل ہونے والا ہر شخص میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ یہاں درختوں پر رہنے والے پرندے بھی میرے گنے چنے ہیں نئے پرندے آ جاتے ہیں تو مجھے ان کا علم ہو جاتا ہے اور تم نے میرے دوست' تم نے اس جنگل میں داخل ہو کر دلاور جان کے ہیڈ کوارٹر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ تمہارا آدمی یہاں میرے بچھائے ہوئے شکنجے کا شکار ہو گیا' تم اسے چالاکی سے لے کر نکل گئے لیکن کہاں جا سکتے تھے' تاربین کے جنگلات کی بات ہی تھوڑی ہے۔ اس شہر پر مکمل کنٹرول ہے میرا' سمجھے میرے دوست بھلا میرے کنٹرول کو کون ختم کر سکتا ہے' خیر چھوڑو ان باتوں کو تاربین کے جنگلات میں ہونے والی ہر کارروائی میری نگاہ میں ہوتی ہے۔ دیکھو' میں تمہیں اس کے گوشے گوشے کی سیر کراتا ہوں۔'' میرے دل پر ایک ہلکا سا بوجھ آ پڑا تھا' میں جانتا تھا کہ ڈیز گروپ تاربین کے جنگلات میں بھٹک رہا ہے

کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں دیکھ لیا جائے۔

دلاور جان غالباً کسی مشینی عمل کے تحت ہی مناظر تبدیل کر رہا تھا اور درختوں اور زمین کے مناظر اسکرین پر نمایاں ہو رہے تھے۔ دفعتاً ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے ایک درخت کو جنبش

کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن میرا خوف اس لیے تھا کہ مجھے اصلیت معلوم تھی۔ جب کہ دلاور جان سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی مملکت' اس کی اس ملکیت میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں' اس نے بے شک یہ لیبارٹری بنا کر ایک بیش بہا کارنامہ سرانجام دیا تھا لیکن اس سے زیادہ قیمتی کارنامے سرانجام دینے والے اس کے علاقے میں بھٹک رہے تھے۔ درخت اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ جہاں ڈیز نظر آیا ہے مجھے وہ جگہ اس عمارت سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ عمارت کے پاس بھٹک رہے ہیں۔ دل میں خوشی کی لہریں اٹھی تھیں لیکن میں نے انہیں ظاہر نہ ہونے دیا اور دلاور جان سے متاثر ہونے کا اظہار کرتا رہا۔ دلاور جان نے منظر تبدیل کر دیا اور اب ایک عمارت کا حصہ نظر آ رہا تھا اس کی آواز ابھری۔

''تم نے میری ملکیت دیکھی۔ یہ جنگل محفوظ ترین ہے۔ آؤ اب میں تمہیں کچھ اور دکھاتا ہوں۔ پہلے یہ چند تصویریں دیکھو۔'' اسکرین پر کچھ ٹرک نظر آنے لگے' یہ صرف تصویریں تھیں۔ دلاور جان نے کہا۔

''ویجی ٹیبل کنگ' لوگ مجھے ویجی ٹیبل کنگ کہتے ہیں لیکن یہ میرا اپنا نام ہے۔ اصل میں جو بھی کام کرتا ہوں اس کو بڑے پیمانے پر ترتیب دیتا ہوں اور میرے شناسا میری اس تربیت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ یہ میرا ذہنی مسئلہ ہے' میں سوچتا ہوں کہ جو کام بھی کیا جائے اس میں اس طرح ندرت اور جدت پیدا کی جائے کہ دوسرے اس کی حقیقت کو نہ پا سکیں اور جب حقیقتیں ان کے سامنے نمایاں ہوں تو وہ ششدر رہ جائیں۔ یہی میرا پسندیدہ کام ہے۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ میرا طریقہ کار کیا ہے......

دراصل ان دنوں پڑوسی ملک میں گھی کی زبردست مانگ ہے' بناسپتی گھی کی شدید قلت ہے اور وہ لوگ ہمیں اس کی اچھی قیمت ادا کرتے ہیں۔ میں نے ایک طویل ترین منصوبے کے تحت کام کا آغاز کیا' ملک میں گھی کی قیمتیں آسمان تک پہنچ چکی ہیں لیکن یہ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ پڑوسی ملک ہمیں اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرے' اپنے ملک میں کیا ہوتا ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن یہ ایک سچ ہے کہ اگر میں نے گھی کی قیمتیں نہ بڑھائی ہوتیں تو اس وقت اس سے آدھی قیمت پر گھی بک رہا ہوتا لیکن مجھے اس سے عظیم نقصان ہوتا کیونکہ میری تجارت میں منافع کی شرح بہت کم ہو جاتی' میرے پاس ملکی پروڈکشن کا بہت بڑا حصہ پہنچ جاتا ہے اور میں اسے پڑوسی ملک میں سپلائی کر دیتا ہوں۔ اصل کام وہ ہے جو میں نے سپلائی کے لیے متعین کیا ہے' دیکھو اور میرے ذہن کی داد دو۔''

اس نے پھر کوئی بٹن دبایا اور اسکرین پر مجھے ایک بڑا ہال نما کمرہ نظر آیا۔ یہاں پر چند افراد کام کر رہے تھے اور مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ پھر مجھے بڑے بڑے گول سوراخ نظر آئے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ بڑا عجیب سا ماحول نظر آ رہا تھا۔

''یہ دیکھو' یہ میرا سپلائی روم ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں سے میں گھی پڑوسی ملک کو سپلائی کرتا ہوں' اس بڑے سپلائی روم میں گھی منتقل کر دیا جاتا ہے اور پھر یہاں سے یہ مشین گاڑھے اور جمے ہوئے گھی کو اس پائپ لائن میں منتقل کرتی ہے پائپ لائن جب روبہ عمل ہوتی ہے تو اس میں ایک برقی نظام دوڑایا جاتا ہے۔ یہ برقی نظام اس گاڑھے اور جمے ہوئے گھی کو گرم کر کے پتلے سیال میں تبدیل کر دیتا ہے کیونکہ یہ پائپ لائن جس کے ساتھ ساتھ تم سفر کرو گے خاص قسم کی بنائی گئی ہے' اس طرح گھی اس میں رکنے نہیں

پاتا۔ ویسے بھی اس کے ڈھلان اس طرح بنائے گئے ہیں کہ کوئی چیز ان میں رُک نہ سکے یوں یہ گرم گھی ایک لمبا سفر طے کر کے ان پائپ لائنوں کے ذریعے پڑوسی ملک کی سرحدوں سے اندر چلا جاتا ہے اور ان کا منظر بھی دیکھ لو۔ یہ وہ بڑے بڑے ٹینک ہیں جن میں یہ گھی جا کر گرتا ہے اور پھر وہاں سے پڑوسی ملک کے افراد اس کی پیکنگ اپنے ڈبوں میں کرتے ہیں اور یہ ایک نئے نام سے فروخت کرتا ہو۔

''یہ عظیم الشان نظام قائم کرنے میں مجھے خاصا وقت لگا تھا لیکن اب میرا یہ کاروبار انتہائی منافع بخش ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب تک جاری رہے گا اگر کوئی خاص وجہ سے یہ کاروبار بند ہو جاتا ہے تو میرے پاس اور بھی بے شمار ذرائع ہیں۔ تم مجھے اس بات پر داد دو گے کہ میں کس طرح ملکی فیکٹریوں میں پام آئل سے تیار ہونے والا گھٹیا درجے کا گھی ان پائپ لائنوں کے ذریعے پڑوسی ملک میں منتقل کر دیتا ہوں اور مجھے اس کے بدلے جو کچھ ملتا ہے وہ کوئی بھی تصور نہیں کر سکتا۔ اس طرح میرا یہ کام ہوتا ہے اور میں نے فی الحال اپنے آپ کو ویجی ٹیبل کنگ کہنے پر ہی اکتفا کیا ہے' کیا خیال ہے تمہارا۔''

''واہ' جواب نہیں خان جی آپ کا کہ آپ کس ذہانت سے یہ کام کر رہے ہیں اب تو مجھے اپنے آپ سے شرم آرہی ہے کہ میں نے غلط قدم اٹھایا ہے اور اب تو میں اپنے کیے کی معافی بھی نہیں مانگ سکتا اگر میں بھی آپ کی جگہ ہوتا تو اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔ بہر حال یہ جگہ دنیا کی عجیب جگہ ہے۔ یہ سب حیرت انگیز ہے۔'' دلاور جان میری باتوں سے کچھ کچھ متاثر نظر آرہا تھا پھر میں نے گردن جھکالی۔

چند لمحات کے بعد دلاور جان بولا۔

''دلچسپ بات یہ ہے مسٹر یوسف کہ یہ سارا نظام بہت سے لوگوں کے علم میں ہے' سرکاری حکام میری جانب نظر اُٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ میں اطمینان سے اپنا یہ کام کر رہا ہوں حالانکہ بہت سے لوگوں کو میرے اس کام کا علم ہے لیکن بس مل جل کر کام ہو جاتا ہے لیکن اگر میرے خلاف کسی سازش کی کوشش بھی کی جائے تو میں نے اس جگہ پر ایک اسلحہ خانہ بھی بنا رکھا ہے۔ میرا اسلحہ خانہ دیکھو گے......''

''ضرور خان جی......''

تب اس اسکرین پر مجھے اس اسلحہ خانہ کے منظر نظر آئے اور میں سنسنی خیز نگاہوں سے اس عظیم الشان اسلحہ خانے کو دیکھنے لگا جس میں سب کچھ موجود تھا میری نگاہیں ہر چیز کو پہچان سکتی تھیں۔ بارودی سرنگیں' ریموٹ کنٹرول بم' خودکار رائفلیں' چھوٹے پستول' غرض ہر وہ چیز یہاں موجود تھی جو ایک باقاعدہ اسلحہ ڈپو میں ہوتا ہے۔ میری نگاہیں ان سب کا جائزہ لیتی رہیں اور میرے ذہن میں طرح طرح کے منصوبے بنتے رہے۔ تاہم میں نے اپنے چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات پیدا نہ ہونے دیئے اور ایسا بنا رہا جس سے دلاور جان کو یہ احساس ہوا کہ میں ذہنی طور پر اس کا غلام بن کر رہ گیا ہوں۔ تاہم میں نے ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے کہا۔

''یہ اسلحہ ڈپو بھی اس عمارت میں ہے؟''

''ہاں۔ تاربین کے ان جنگلات کو میں نے اس قدر محفوظ کر رکھا ہے کہ اگر کبھی میرے خلاف فوجی کارروائی بھی ہو تو ایک طویل عرصہ فوجوں کو مجھ تک پہنچنے میں لگ جائے۔ تم نے دلاور جان کو واقعی بہت غلط سمجھا تھا اور اب میں اس بات پر پریشان ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ ایک ناواقف آدمی اگر کسی مینڈک کی طرح اچھلتا ہے تو اس پر فوراً ہی پاؤں رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ تمہارے بارے میں

سوچوں گا۔'' اس نے کہا اور اس کے بعد مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میرے چہرے سے اسے جو کچھ مل رہا تھا وہ اس کی تسلی کے لیے کافی تھا' اس نے ان تمام چیزوں میں ردوبدل کا عمل شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ پھر پہلے جیسا ہو گیا۔

☆☆☆

اچانک دروازہ کھلا اور دفعتاً ہی ایک آدمی اچھل کر اندر آ گرا' وہ بری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ دلاور جان نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے پیچھے ہی ڈیز جن کے ہاتھوں میں ہلکی اسٹین گنیں دبی ہوئی تھیں اس نے اندر آتے ہی کمرے کی ہر چیز پر فائرنگ شروع کر دی اور دوسرے نے دلاور جان کو اسٹین گن سے کور کر لیا۔ یہ ڈیز تھری اور فور تھے۔ ڈی فور نے دلاور جان سے کہا۔

''اگر تم نے ذرا جنبش کی تو گولیاں تمہارے جسم میں ہزاروں آنکھیں پیدا کر دیں گی۔''

دلاور جان ایک لمحے کے لیے نروس ہو گیا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر اپنے آدمی کو اور اس کے بعد ساکت ہو گیا۔ ڈی تھری فوراً ہی اس کے قریب پہنچ گیا تھا اس نے عقب سے دلاور جان کی کمر پر اپنی مشین گن کی نال رکھ دی۔

''دلاور جان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہیں یہ کتے کے پلے؟''

ڈی فور نے اچانک ہی ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دلاور جان کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے نجانے کس طرح انتہائی برق رفتاری سے اپنے ہاتھوں کو جنبش دے کر ایک پھندا تیار کر لیا تھا اور اسے دلاور جان کے پیروں میں ڈال کر زور سے کھینچ لیا' دلاور جان ایک دھاڑ کے ساتھ اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ اپنے آپ کو فرش سے ٹکرانے سے بچانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ زمین سے ٹکائے تھے لیکن ڈی تھری نے ٹھوکر لگا کر اس کے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے اور اس کے بعد ان پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دلاور جان خوفناک آواز میں غرایا لیکن میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس نے اپنی تمام تر قوت صرف کی کہ اپنے ہاتھ ڈیز کے پیروں کے نیچے سے نکال لے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوا تھا البتہ ڈیز نے اپنی ایڑیوں کو ایک مخصوص انداز میں جنبش دی اور دلاور جان دھاڑ کر چت لیٹ گیا۔ اسے شاید اپنے ہاتھوں میں بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملنے لگا۔

ڈیز نے آہستہ سے کہا۔

''یہ تکلیف تمہارے جسم کے مختلف حصوں میں پیدا ہو سکتی ہے اس لیے اپنے ہاتھ سیدھے کر لو فوراً۔''

دلاور جان نے کسی قدر بدحواسی کے عالم میں ڈیز کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ ڈیز نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے اوندھا کیا اور اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ یہ کام وہ نہایت اطمینان سے کر رہا تھا لیکن میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شخص جو زخمی ہو کر نیچے آ کر گرا تھا دم توڑ چکا تھا اور اس کی ٹیڑھی میڑھی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''باہر کی کیا پوزیشن ہے؟ یہاں اس کے کافی آدمی موجود ہیں۔''

''موجود تھے کم بختوں نے کوئی رعایت ہی نہیں کی۔ ان میں سے چھ کو ختم کرنا پڑا' پانچ باندھ کر ڈال دیئے گئے ہیں اور ایک یہ ہے جو مرنے سے قبل یہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ سارے کے سارے کل بارہ تھے اس عمارت میں۔ چار وہ تھے جو آپ کو لے کر یہاں آئے تھے' انہوں نے شدید مزاحمت کی تو

ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔"
"باقی ڈیز پوری عمارت کے گشت پر ہیں۔"
"تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟ میں تیرے بارے میں سوچ رہا تھا کہ تیرے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے لیکن میرا بھی وقت آئے گا' تم سب کو دیکھ لوں گا۔"
ڈیز فور نے کہا۔
"چیف اگر اس کی آواز ناگوار گزر رہی ہو تو اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جائے۔"
"نہیں' بولنے دو اسے' لیکن اس سے پہلے میں خود بھی اس کی عمارت کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔"
ڈیز نے گردن خم کر دی تھی۔ پھر میں نے انہی سے ایک پستول لے لیا اور اسے سنبھالے ہوئے دروازے سے باہر نکل آیا۔ میں محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دفعتاً ہی میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا مجھے وہ لوگ یاد آ گئے جو سپلائی روم میں تھے یعنی ان پائپ لائنوں کے پاس جہاں سے گیس کی ترسیل کی جاتی تھی' یقیناً ڈیز گروپ ان کا سراغ نہ پا سکے ہوں گے۔ ڈی ون نے مجھے دیکھ لیا تھا اور دوڑتا ہوا میرے قریب آ گیا' میں نے آہستہ سے کہا۔
"عمارت کی کیا پوزیشن ہے؟"
"یوں لگتا ہے جیسے اب یہاں کوئی موجود نہ ہو لیکن آپ کا کیا خیال ہے مزید تلاشی لی جائے؟"
"یہاں ایک ایسی پوشیدہ جگہ موجود ہے۔"
"آیئے ہم معلوم کیے لیتے ہیں۔"
ڈیز نے کہا اور میں ایک لمحے کے لیے اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ تب مجھے یاد آیا کہ یہاں پانچ افراد ایسے موجود ہیں جو زندہ ہیں اور بندھے پڑے ہوئے ہیں۔
ڈیز گروپ جو بھی کام کرتے تھے' جس تار سے انہیں باندھا گیا تھا دیکھنے میں ایک رسی محسوس ہوتا تھا لیکن ایسا تھا کہ اگر اسے کھولنے کے لیے جدوجہد کی جائے تو نسوں ہی کو کاٹ کر رکھ دے اور یہ بھی ایک بہت اچھا طریقہ کار تھا۔ ورنہ بندشیں کھولنے کی جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ اس نے ان میں سے ایک کے منہ سے کپڑا نکالا اور اسے بالوں سے گھسیٹتا ہوا دوسرے لوگوں سے کچھ فاصلے پر لے آیا' میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا' گرفتار شدہ آدمی کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ تب میں نے غرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔
"سپلائی روم کا دروازہ کون سا ہے؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری' دہشت زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بولا۔
"روم نمبر فائیو میں' سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے تین سرخ بٹن' ایک دو تین کی ترتیب سے دبائے جائیں تو روم فائیو کا دروازہ کھل جاتا ہے۔"
"وہاں کتنے آدمی موجود ہیں اس وقت؟"
پانچ آدمی وہاں ہر وقت ڈیوٹی پر رہا کرتے ہیں۔"
"کیا باہر سے ان کا رابطہ نہیں ہے۔"
"اگر خان چاہے تو......
"جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"
"نہیں سچ۔"
"ہوں ٹھیک ہے اسے اس کی پوزیشن میں واپس لے آؤ۔"
روم نمبر فائیو تلاش کرنے میں مجھے اور ڈیز کو کوئی دقت پیش نہیں ہوئی' دیوار پر سرخ بٹن بھی نظر آ رہے تھے اور اندازہ ہو رہا تھا کہ اس شخص نے جو کچھ بتایا ہے غلط نہیں ہے۔ میں نے ڈیز کو ہوشیار کیا اور اس کے بعد ترتیب سے ایک دو تین نمبر کے بٹن دبائے' دیوار میں ایک چوکور راستہ کھل گیا تھا اور ہم دونوں نہایت برق رفتاری سے اندر داخل ہوئے تھے۔ سامنے ہی دو آدمی

اطمینان سے بیٹھے ہوئے شاید رمی کھیل رہے تھے ہمیں دیکھ کر اٹھے مگر ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ڈیز گروپ نے فوراً ہی مشین گن کا منہ کھول دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ وہ تینوں آدمی بھی دوڑے چلے آئے تھے جنہیں پہلی نگاہ میں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ جگہ جیسا کہ اسکرین پر نظر آئی تھی بالکل ویسی ہی تھی اور وہاں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا لیکن ان تینوں نے صورت حال کو دیکھ کر پستول نکالنے کی کوشش کی اور ان میں سے ایک شخص میرے پستول کی گولی کا نشانہ بن گیا' البتہ اس کی پیشانی کے چیتھڑے دیکھ کر باقی دونوں نے خوفزدہ انداز میں ہاتھ بلند کر دیے تھے اور دہشت بھری نگاہوں سے ہم کو دیکھنے لگے تھے۔ ڈیز کے ہاتھ میں دبی ہوئی اسٹین گن ان لوگوں کے لیے زیادہ خوف کا باعث تھی۔ ان میں سے ایک نے بقیہ دو لاشوں کو دیکھ کر کہا۔

''نہیں۔ تم ہمیں جان سے نہیں مارو گے۔ ہم تمہاری اطاعت کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

ڈیز نے میری جانب دیکھا اور میں نے گردن ہلا دی اور اس کے بعد دو افراد کو بھی اس طرح باندھ کر زمین پر ڈال دیا گیا تھا۔ ہمیں بہترین کامیابیاں حاصل ہوتی جا رہی تھیں۔ ان تینوں افراد کو بھی اٹھا کر اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں باقی لوگ موجود تھے۔ اس کے بعد ہم نے بڑے دروازے کی خبر لی' دو ڈیز وہاں جمے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے گفتگو کی اور اندر کی پوزیشن کے بارے میں بتایا تو ڈی ون نے کہا۔

''چیف' میرا خیال ہے کہ ہم یہاں فائیو کو چھوڑ دیتے ہیں' ایک آدمی کافی ہے نگرانی رکھے گا' بلکہ بہتر یہ ہے کہ دروازے کو اندر سے بند کر کے بلندی سے جائزہ لیا جائے اور ماحول پر نظر رکھی جائے۔ باقی پوری عمارت کی تلاشی لے ڈالتے ہیں۔

''ایسا کر لو لیکن ہمیں اس بات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ رات کے کسی بھی حصے میں یہاں اور افراد آ سکتے ہیں۔ دروازہ اور عمارت کے دوسرے حصوں پر بھرپور نظر رکھنا ہو گی۔''

''اگر اندرونی کنٹرول درست رہے تو ظاہر ہے پھر پوری توجہ دروازے پر ہی دی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے' فی الحال فائیو کو یہاں چھوڑ دو۔ آؤ ایک بار پھر پوری عمارت کا جائزہ لیتے ہیں' تھوڑے سے کام بھی ہیں۔''

چنانچہ باقی ڈی ڈیز کو بھی ساتھ لے لیا گیا' اور اس کے بعد ہم نے برق رفتاری سے اپنے آئندہ مراحل طے کرنے شروع کر دیئے' لاشوں کو اکٹھا کر کے ایک ایسی جگہ ڈال دیا گیا جو ناکارہ سامان سے بھری ہوئی تھی اور یہاں کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ باقی آٹھ افراد قیدیوں کی حیثیت سے موجود تھے' انہیں بھی ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ جہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی بس فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے...... یہ غالباً نشست کا کمرہ بنایا گیا تھا۔

تمام کاموں سے فراغت کے بعد ہم دلاور جان کے سامنے پہنچ گئے۔ دلاور جان کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اسے دیوار سے پشت لگا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے کر کہا۔

''تعجب کی بات ہے دلاور جان آپ نے اتنی بڑی آرگنائزیشن بنا لی۔ بارہ سو افراد آپ کے لیے کام کرتے ہیں اور یہاں اس عمارت میں صرف سترہ افراد تھے۔ اب یہ بتایئے کہ رات کے اس آخری حصے میں یہاں اور کون کون آ سکتا ہے؟''

''کوئی نہیں آئے گا۔'' دلاور جان بھرائی ہوئی آواز

میں بولا، پھر کہنے لگا۔
"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں یوسف۔"
"ٹھیک ہے میرا خیال ہے آپ کو یہاں سے کسی اور کمرے میں منتقل کر دیا جائے" کچھ دیر کے بعد ہم دلاور جان کے سامنے تھے۔ دلاور جان کہنے لگا۔
"تم نے کہا تھا کہ یہاں تم بھی اپنی کوئی ٹیم بنا کر کام شروع کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے اندر بے پناہ صلاحیتیں ہیں اور یہ ایک سچائی ہے کہ تم نے مجھے فیل کر کے یہ سب کچھ اپنے قبضے میں لے لیا ہے' کیا مجھ پر تھوڑا سا اعتبار کر سکو گے' میں تمہیں اپنے کاروبار میں آدھا شریک بنا سکتا ہوں اپنے آدمیوں کے ساتھ میرے لیے کام کرو۔ اربوں ڈالر کی آمدنی ہے مجھے اور تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تمہیں میرے ساتھ مل کر کیا کچھ حاصل ہو سکے گا۔"
"نہیں۔ افسوس یہی ہے کہ میں تنہا کام کرنے کا عادی ہوں اور اب ذرا صورت حال بدل بھی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ میں جرائم پیشہ نہیں ہوں اور پہلے جو میں نے تم سے کہا تھا وہ غلط تھا۔"
"کیا مطلب......؟" دلاور جان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
"میں دراصل صرف ایک محبِ وطن ہوں جسے ملک کے خلاف ہونے والی ہر سازش سے نفرت ہے' جو وطن پاک کی ایک اینٹ کو بھی نقصان پہنچتے دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہے۔"
"تم اب جھوٹ بول رہے ہو۔" دلاور جان نے کہا۔
"نہیں یہ ایک حقیقت ہے۔"
"ذہانت اور حماقت کیسے یکجا ہو سکتے ہیں۔ تم نے مجھے بے بس کر کے وہ سب کچھ کر ڈالا ہے جو کسی کے بس میں نہ تھا' تم اور تمہارے یہ ساتھی دنیا کے شاطر ترین آدمی ہیں اور تم ایسی حماقت کی بات کرتے ہو' پورے ملک میں صرف تم محبِ وطن ہو تو دوسرے کون ہیں۔"
"جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو میں سمجھ رہا ہوں۔ تم ملکی حالات پر طنز کرنا چاہتے ہو' مانتا ہوں لیکن گنے چنے افراد تو پورے وطن کی نمائندگی نہیں کرتے' میرا دیس' میرا وطن اپنی زمین پر بسنے والوں کی محبت سے مالا مال ہے۔ اس کے ہرے بھرے کھیتوں کی ہریالی اس میں رہنے والوں کو زندگی بخشتی ہے۔ ہم ہیں وہ جنہیں اپنے وطن کے چپے چپے سے پیار ہے اور ہم جیسے کروڑوں ہیں جو ہمارے ہم آواز ہیں' اگر تم بات کرتے ہو ان خود پرستوں کی جو اپنی ذات کیلئے' اپنے اقتدار کے لیے وطن کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے ہیں جنہیں وطن کے مفاد سے زیادہ اپنا مفاد عزیز ہے تو ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور اتنے کم افراد اپنے اختیارات سے کام لے کر وطن کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی بنیادیں کمزور نہیں کر سکتے۔ یہ نقصان بھی وہ صرف وقتی طور پر ہی پہنچا سکتے ہیں اور بالآخر ان کی ریشہ دوانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور پیارا وطن اپنی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ دلاور جان مختلف طریقوں سے میرے وطن کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ میں اپنے وطن کا ایک ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے جتنی میری بساط ہے وطن دشمنوں کے خلاف کام کر رہا ہوں۔
تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم وطن کے دشمنوں کا مختلف انداز ہے' مختلف عمل ہے۔ ان کے مختلف کام ہیں اور ان میں تمہارا کام جو کچھ ہے وہ تم خود مجھے دکھا چکے ہو۔ دولت بے شک ایک اہم چیز ہے اس کی ضرورت ہر انسان کو ہوتی ہے لیکن وطن کو نقصان پہنچا کر جو دولت حاصل کی جائے اسے کبھی کسی کے کام نہیں آنا چاہیے۔ دلاور

جان ماضی میں تم جو کچھ کر چکے ہو اور اس سے وطن والوں کو جو کچھ نقصان پہنچا ہے تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو گیا ہے تو تم ایک بے ضمیر انسان ہو۔

میں صرف ایک چھوٹی سی بات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا تم سے جس پر تم عمل پیرا ہو۔ سوچو ذرا میرے وطن میں کتنی غربت ہے۔ کتنا افلاس ہے' چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والے زندگی کی مسکراہٹوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ مہنگائی کا مہیب عفریت انہیں خوف کا شکار کیے ہوئے ہے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ بازاروں میں قیمتیں آسمانوں پر پہنچ رہی ہیں۔ ہر دن مہنگائی کا دن ہوتا ہے اور تم جیسے بے ضمیر لوگ منافع خوری کا مینار قائم کر رہے ہیں۔ ہاں میرے وطن کے لوگوں کی آہیں' کراہیں اور سسکیاں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ سسکتے ہوئے جاگتے ہیں روتے ہوئے سو جاتے ہیں لیکن اس میں سب سے بڑا ہاتھ تم جیسے لوگوں کا ہے۔ اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے تم نے مہنگائی مسلط کی ہے۔ تم ویجی ٹیبل آئل پڑوسی ملک کو دے رہے ہو اس ملک کو جو ہمارا بدترین دشمن ہے' جس نے کبھی ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا' تم اس کی ضروریات پوری کر رہے ہو اپنے وطن کے لوگوں کی حق تلفی کر کے اور اس سے تمہیں دولت حاصل ہو رہی ہے۔"

"تم...... تم اتنے بڑے مجرم ہو دلاور جان کہ موت جیسی چیز تمہارے لیے ناکافی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کون سی سزا دی جائے۔ سرکاری آدمی ہونا ضروری نہیں ہے ایک وطن پرست ہر قوت پر بھاری ہوتا ہے۔ میں تمہارے لیے بدترین سزا تجویز کرتا ہوں' وہ بدترین سزا جو ابھی تک میرے ذہن میں نہیں ہے۔ میرے بارے میں اور کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"جو دل چاہے' کرتے رہو۔ دیکھوں گا تمہیں اس کا کیا صلہ ملتا ہے۔ یہاں کبھی کسی کو کسی کی نیکی کا صلہ نہیں ملتا۔"

"چھوڑو' کیوں بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ ارے صلہ تو اسی لمحے مل جاتا ہے' جب کسی نیک کام سے تمہارا ضمیر مطمئن ہو کر تمہیں سکون کا ایک لمحہ میسر کر دیتا ہے۔ وطن عزیز کی سرزمین پر بکھرے ہوئے انسانوں میں صرف ایک بچے کی مسکراہٹ اگر تمہارے لیے ہو تو اس سے بڑا صلہ اگر تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے تو ہو گا۔ میرے لیے وہ مسکراہٹ ہی بہت کافی ہے کیا سمجھے۔"

"ہاں دیوانگی کی مختلف اقسام ہوتی ہیں اور اگر تم اس قسم کے دیوانے ہو تو واقعی میں تم سے خوفزدہ ہوں۔ کسی ہوش مند کو سمجھایا جا سکتا ہے کسی پاگل کو نہیں۔" دلاور جان نے کہا اور میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں دلاور جان' مجھے اپنی اس دیوانگی پر فخر ہے۔"

"تو پھر جہنم میں جاؤ جو دل چاہے کرو میں کیا کروں۔"

"دوستو! دلاور جان ہمارے کام کی چیز ہے' جہنم میں جانے کے لیے ابھی ہمیں اس کا سہارا درکار ہے۔ چنانچہ ایسا کرو تم یہاں رک جاؤ۔ میں باہر کے معاملات دیکھتا ہوں' مگر دلاور جان کا خیال رکھنا یہ اونچی چیز ہے۔" ڈی ون نے گردن ہلا دی۔

میں نے اپنا کام شروع کر دیا اور عمارت کے چپے چپے اور گوشے گوشے کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ساتھ ڈیز بھی تھے۔ رات کے تقریباً پون بجے دو افراد وہاں پہنچے اور ڈیز انہیں اپنی اسٹین گنوں سے کور کر کے اندر لے آئے۔ انہیں غیر مسلح کیا اور زندہ قیدیوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا۔ اس دوران ہم نے اس عمارت کے تقریباً سب حصوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ یہاں ایک

باقاعدہ اسلحہ خانہ موجود تھا۔ وہ سارا نظام بھی ہم نے کنٹرول سسٹم کے تحت دیکھ لیا جس سے گھی کو پگھلا کر پائپ لائنوں میں بہایا جاتا تھا اور وہ طویل راستہ طے کرکے ان ٹینکروں میں پہنچ جاتا تھا جو دشمن ملک کی سرحدوں میں تھے۔ سارا نظام یہیں سے کنٹرول ہوتا تھا اور اسے اسکرین پر دیکھا جاسکتا تھا۔ اسلحہ خانے میں کافی اسلحہ موجود تھا' یہاں کا نظام جنریٹروں سے جاری رہتا تھا' باقاعدہ بجلی تاربین کے جنگلات میں نہیں آئی تھی۔ ان جنریٹروں کو متحرک رکھنے کے لیے پٹرول استعمال کیا جاتا تھا اور تقریباً سوا دو بجے جس گاڑی کی آواز ہمیں سنائی دی تھی اور جسے سن کر ہم مستعد ہوگئے تھے۔ وہ پٹرول ٹینکر تھا' جو غالباً انہی جنریٹروں کے لیے پٹرول لے کر آیا تھا۔

دو افراد تھے جو ٹینکر سے اتر کر نیچے آئے تھے اور ڈیز گروپ نے بڑے پیار سے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ ظاہر ہے ان کا ٹھکانہ اس عمارت کے علاوہ اور کہاں ہوسکتا تھا' جس میں باقی افراد تھے لیکن پٹرول ٹینکر کو دیکھ کر دفعتاً ہی میرے ذہن میں چرخیاں سی چلنے لگی تھیں اور میں ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ یہ بات طے تھی میرے دل میں کہ دلاور جان ایک بدترین ملک دشمن انسان ہے بلکہ اس کا نام تو ان دشمنوں کی فہرست میں شامل تھا جو مجھے ممالک غیر میں ملی تھی' یعنی دلاور جان ایسا شخص تھا جس کے بارے میں ملک کے دشمن بڑی اچھی رائے رکھتے تھے اور اس کا نام ان لوگوں کے پاس موجود تھا کہ کبھی ملک کے خلاف کوئی بڑی سازش مقصود ہو تو دلاور جان جیسے آدمی کا سہارا لیا جائے۔ ایسے کسی شخص کی زندگی وطن کے لیے کس قدر خطرناک ہوسکتی تھی۔ اس سے چشم پوشی حماقت کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ لوگ جو یہاں موجود ہیں کسی بھی طور رحم کے مستحق نہیں ہیں' اس عمارت کو فنا ہوجانا چاہیے' دلاور جان سمیت ان کے ان ساتھیوں سمیت' جس جس کی موت اسے گھیر کر یہاں لارہی ہے اسے بھلا کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور میں نے اپنے اس منصوبے کی تفصیلات ڈیز گروپ کو بتائیں تو وہ شدت حیرت سے گنگ ہوکر رہ گئے۔ دیر تک ان کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ پھر ان کے چہروں پر مسرت کے آثار نظر آئے اور سب ہی نے میرے منصوبے سے اتفاق کیا۔

"تو پھر تم میں سے کون میرے اس منصوبے کی تکمیل میں میرا مددگار ہے۔"

"ویسے تو ہم سب ہیں' لیکن جسے آپ پسند کریں۔"

"ڈی ٹو اور فائیو کو میں نے اپنے ساتھ لیا اور اس کے بعد ہم نے ایک انوکھے عمل کا آغاز کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جو کچھ کرنے جارہے تھے اس کے نتائج سے ناآشنا تھے ہوسکتا ہے ہم اس انداز میں وہ سب کچھ نہ کرپائیں جس انداز میں فوری طور پر سوچا ہے' لیکن یہاں تو سارے اقدامات ہی اندھے تھے۔ کیا' کیا جاسکتا تھا کوئی باقاعدہ نظام تو تھا نہیں کہ جس کے تحت کچھ کیا جاتا۔ بس یہی تھا کہ جو دل میں آئے وہ کر ڈالا جائے اور نتائج تقدیر پر چھوڑ دیئے جائیں۔

چنانچہ اسی طریقہ کار پر عمل کرنے لگے جس کی نشاندہی دلاور جان نے کی تھی' باہر سے آنے والے گھی کے ٹرک جس طرح پائپ لائنوں میں گھی منتقل کرتے تھے ہم نے اسی کے طرز عمل پر کام شروع کیا۔ پٹرول ٹینکر سے لمبے لمبے پائپ اتار کر انہیں جوڑا اور بڑی محنت سے انہیں اس جگہ تک لے آئے جہاں پائپ لائنیں تھیں اور جہاں سے گھی کے ذخائر سائنسی طریقے سے دشمن ملک میں منتقل ہو جاتے تھے۔ میں نے بالآخر ٹینکروں سے پٹرول ان پائپ لائنوں میں منتقل کرنا شروع کردیا' پٹرول

کی موٹی دھار پائپ لائن سے گزرتی رہی۔ اس وقت چونکہ پائپ لائن کا ہیٹر سسٹم عمل پذیر نہیں تھا اس لیے پٹرول کے آگ پکڑ لینے کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا اس کے باوجود جو کچھ ہونا ہے چاہے ہو جائے۔ مجھے یا ڈیز گروپ کو اس کی پروا نہیں تھی، ہم تو دیوانہ وار اپنے منصوبے پر عمل کر رہے تھے۔ پٹرول کا سارا ذخیرہ ان پائپ لائنوں سے گزر کر ایک طویل فاصلہ طے کر کے ان ٹینکوں میں پہنچ گیا جن میں ہو سکتا ہے گھی کی بڑی مقدار موجود ہو یا ہو سکتا ہے وہ خالی ہوں۔ ظاہر ہے وہاں کے علاوہ یہ پٹرول اور کہاں جا سکتا تھا اس سارے کام سے فارغ ہونے میں خاصا وقت لگ گیا۔ کہیں سے پٹرول لیک نہیں ہوا تھا اور اس کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ دلاور جان کو پتا بھی نہیں تھا کہ ہم لوگ کیا کر چکے ہیں۔ آہ! کاش یہ منصوبہ اسی طرح عمل پذیر ہو جائے جس طرح ہم نے سوچا تھا۔

اس کام سے فراغت حاصل کر کے منصوبے کے مطابق ڈیز گروپ اسلحہ خانے سے کئی ریموٹ کنٹرول بم لائے اور بڑی مہارت سے انہیں اپنے علم کے مطابق تیار کرنے لگے۔ بموں کو خصوصی طور پر اس طرح پیک کیا گیا تھا کہ اپنا سفر طے کرتے ہوئے وہ راستے میں ہی پھٹ نہ جائیں، ڈیز یعنی ڈی فائیو اس سلسلے میں بھی بہترین معاون ثابت ہوئے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی تو لحہ لحہ نمایاں ہوتی رہی تھی اور میں نے انہیں ہر کام میں اس قدر مستعد پایا تھا کہ بعض اوقات مجھے خود بھی حیرت ہونے لگی تھی۔ نہایت طاقتور ریموٹ کنٹرول بموں کو بالآخر ہمت کر کے ان پائپ لائنوں میں ڈال دیا گیا جن سے تھوڑی دیر قبل پٹرول ٹینکوں تک پہنچایا گیا تھا۔ اس کام سے ہم نے فراغت حاصل کر لی، دل خوشی سے اُچھل رہا تھا۔ کامیابی اس طرح ہمارے قدم چومے گی، یہ تو ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، اگر رات نہ ہوتی تو دن کا وقت ہوتا تو ہمیں اپنے اس کام میں اس قدر آسانیاں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ آنے جانے والے تو رات میں بھی آتے تھے اور اب ہم اپنے کام کے لیے تیار تھے۔ پھر جب یہ سارا مکمل ہو گیا تو پر اطمینان انداز میں ہم لوگ ایک بار پھر دلاور جان کے پاس پہنچ گئے۔ وہ فرش پر نیم دراز تھا اور اس کے چہرے پر تفکر کے سائے رقصاں تھے۔

''اٹھو دلاور جان۔ آؤ یہ رات تمہارے لیے بے حد مصروف اور قیمتی ہے۔ اس رات کی بہت سی کہانیاں تم اپنے سینے میں محفوظ کر کے اس جہان سے رخصت ہو گے۔''

''باز آجاؤ۔ مان جاؤ، دنیا کو سمجھو، جوش کے بجائے ہوش سے کام لو۔ تم جو کچھ کر رہے ہو مانتا ہوں وہ ایک نیک کام ہے لیکن آج نہیں تو کل یاد رکھنا کہ تمہیں یہ سب کچھ کرنے پر افسوس ہوگا جبکہ تمہیں ان جذبوں کا وہ جواب نہیں ملے گا جو ملنا چاہیے۔''

''آؤ دلاور جان۔ اتنی نصیحتیں سن لی ہیں تمہاری کہ اب مزید کچھ سننے کو جی نہیں چاہ رہا۔'' میں نے کہا۔

ہم لوگ دلاور جان کو سہارا دے کر ایک بار پھر اسی کنٹرول روم میں لائے، یہاں کا نظام ڈیز نے سمجھ لیا تھا۔ دلاور جان کو کچھ فاصلے پر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ ڈی نے وہ کرسی سنبھال لی جس سے وہ آٹومیٹک نظام کنٹرول ہوتا تھا جسے دلاور جان نے واقعی بڑی محنت سے تیار کرایا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس نظام کو کنٹرول کرے۔ جب کرسیاں متحرک ہوئیں جب دیواروں نے جگہ چھوڑنا شروع کی، جب ماحول نے

اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کیں' تو دلاور جان شدتِ حیرت سے کانپ اٹھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈیز کو دیکھنے لگا اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"یہ...... یہ ان تمام باتوں کے بارے میں کیسے جانتا ہے؟"

"تعجب ہے، تم اب بھی یہ سوال کر سکتے ہو جب ہم تم جیسے شاطر آدمی کو اپنے قابو میں کر سکتے ہیں' تو اس قسم کے تماشے کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔"

"یہ گھٹیا تماشا نہیں ہے اور ایسا کوئی جملہ نہ کہو اس کے بارے میں۔ یہ میری پوری زندگی کی محنت ہے مگر تم کر کیا رہے ہو۔ یہاں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"دیکھ لو...... یہ ہے تمہارا وہ نظام جس پر تمہیں ناز تھا۔ اگر غور کرتے تو تمہیں خود ہی اندازہ ہو جاتا' اب تم اس کا خمیازہ بھگتو گے۔ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے' اب یہ دیکھو کہ تمہارا یہ نظام کس خوبصورتی سے ختم کیا جا رہا ہے' تم اس کا جائزہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" میں نے کہا اور دھڑکتے دل سے ایک ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا اسکرین پر اب وہ ٹینک نمایاں تھے جو دشمن ملک کے علاقے میں تصور کیے جا سکتے تھے۔

ایک ہولناک دھماکا ہوا اور اسکرین شعلوں میں نہا گیا۔ دلاور جان ایک بار پھر اچھل پڑا تھا اس کے منہ سے کوشش کے باوجود آواز نہ نکل سکی لیکن اب انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈی نے دوسرا ریموٹ کنٹرول استعمال کیا اور ایک بار پھر خوفناک دھماکے کے ساتھ شعلوں کے بادل بلند ہونے لگے۔ یکے بعد دیگرے جتنے بھی ریموٹ کنٹرول بم اس پائپ لائن کے ذریعے ان ٹینکروں تک پہنچائے گئے تھے اپنا کام مکمل کرنے لگے۔

دلاور جان نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسکرین پر شعلے اور دھوئیں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بمشکل تمام دلاور جان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آہ یہ تو......"

میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں دلاور جان' تمہارے آقاؤں کے علاقے میں ان کے گھی کی ذخیرہ گاہیں تباہ ہو رہی ہیں۔ ابھی تو بہت کچھ تباہ ہونے کے لیے باقی ہے' آنکھیں کھلی اور دل مضبوط رکھو تاکہ خود اپنی تباہی کا نظارہ کر سکو۔ برے کام کا ہمیشہ برا انجام ہوتا ہے' دلاور جان' تو نے نجانے کتنے افراد کو نقصان پہنچایا ہو گا۔ تیرے یہ ساتھی' جن کی کچھ لاشیں یہاں پڑی ہوئی ہیں اور جن کی بقیہ لاشیں کچھ دیر کے بعد تاربین کے جنگلات میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہوں گی۔ یہ بدترین لوگ تھے' انتہائی قابلِ نفرت۔ وطن دشمن تھے' میں نے سوچا ہے کہ وطن دشمنوں کو زندہ ہی نہ چھوڑا جائے تاکہ وطن عزیز کو خطرات لاحق نہ رہیں۔ دلاور جان اب اس سے زیادہ میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے' جس طرح وہ ٹینکر تیرے ہی اسلحہ خانے میں موجود ریموٹ کنٹرول بموں سے اڑائے گئے ہیں اسی طرح تھوڑی دیر کے بعد یہ پوری عمارت فضا میں پرواز کر رہی ہو گی اور یہاں جو اسلحہ موجود ہے وہ تاربین کے جنگلات کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ بہت بڑا کام ہونے والا ہے اب یہاں۔ یہ ریموٹ کنٹرول ہمارے پاس آ چکے ہیں چنانچہ اب چلتے ہیں۔"

دلاور جان دہشت بھرے انداز میں چیخنے لگا لیکن ہمیں اس کا اندازہ تھا کہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں اس قابل نہیں ہیں کہ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر سکے۔ چنانچہ ہم برق رفتاری سے وہاں سے نکل آئے' تاربین کے جنگلات میں دوڑتے اور آہنی شکنجہ سے بچتے ہوئے کافی فاصلے پر نکل آئے اور ریموٹ کا

بٹن دبا کر بم بلاسٹ کر دیئے۔ اس قدر تیز دھماکے تھے کہ آس پاس کے علاقے ہل کر رہ گئے۔ ایک نہ ختم ہونے والا دھماکوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم دوڑتے ہوئے اس مقام تک آ گئے جہاں عامل شاہ ہمارا منتظر تھا' قیامت مچی ہوئی تھی پوری آبادی ان دھماکوں کو سن رہی تھی۔ عامل شاہ نے ہمارا استقبال کیا' وہ بری طرح کپکپا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور زور سے مجھے بھینچ لیا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ ویسے بھی آوازیں سننے کا وقت نہیں تھا۔ ہماری یہ جائے پناہ غیر محفوظ بھی ہو سکتی تھی۔ اگر یہ پہاڑی مقام نہ ہوتا' اسلحے کی رینج بہت زیادہ تھی' غالباً شہری آبادی پر بھی اس کے نقصان دہ اثرات مرتب ہوئے تھے لیکن ان سب کو بھی یہ برداشت کرنا تھا۔ تاربین کے جنگلات میں رات بھر دھماکے ہوتے رہے اور ہم ان دھماکوں کو سنتے رہے۔ عامل آہستہ آہستہ اعتدال پر آتا چلا گیا اس نے بمشکل تمام کپکپاتی آواز میں پوچھا تھا۔

''کیا وہاں دلاور جان موجود تھا؟''

''ہاں دلاور جان کی کہانی اب زمین میں جاسوئی ہے۔ اب اس کا وجود باقی نہیں رہا ہے اور اس دشمن کو بھی بہت نقصان پہنچا ہے۔ جس سے دلاور جان کا رابطہ تھا اور جس کی وجہ سے ہماری ملکی معیشت کو ایک عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔''

''صرف پانچ افراد نے تمہارے ساتھ مل کر یہ حیرت ناک کارنامہ سرانجام دے دیا جو......'' عامل شاہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد ذرا محتاط طریقہ کار اختیار کر لیا گیا تھا رات کی تاریکیوں میں چاروں طرف سے گاڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقینی طور پر یہ انتظامیہ تھی جو تاربین کے جنگلات کی صورت حال معلوم کرنے جا رہی تھی۔ تاربین کے پورے جنگل میں آگ لگ گئی تھی اور ایک عجیب ہنگامی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

دوسری صبح بڑی دھواں دھار تھی۔ پورے شہر میں دھویں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سارے کاروبار بند تھے' ہر شخص تجسس میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ رمضان خان اور احمد بیگ ہمارے پاس آ گئے تھے۔ انہیں کم از کم اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے تھے وہ کر چکے ہیں۔

احمد بیگ نے کہا۔

''یہ جگہ کافی خطرناک ہے۔ انتظامیہ کے افراد یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو یہاں سے نکل چلو۔''

عامل شاہ نے اس کی مخالفت کی اور بولا۔

''نہیں یہ جگہ انتہائی محفوظ ہے اور یہاں تمہارے ہر قسم کے تحفظ کی ذمہ داری میں لے سکتا ہوں۔ اطمینان سے یہاں رہو۔ ہاں ذرا جنگلات کی تپش اور دھواں برداشت کرنا پڑے گا۔''

پورا انتظامی عملہ تاربین کے جنگلات پر فروکش ہو گیا تھا۔ ہر قسم کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ رات بھر میں اسلحہ جل کر خاک ہو گیا تھا' وہ جگہ جہاں عمارت تھی زمین کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی وہ پائپ لائنیں جو زیر زمین دشمن ملک تک پہنچائی گئی تھیں' زمین سے اوپر آ گئی تھیں اور انتظامیہ کے افراد اس بات پر شدید حیران تھے۔ یہ صورت براہ راست فوجی مداخلت کو دعوت دیتی تھی۔ چنانچہ دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے لاتعداد فوجی گاڑیاں تاربین کے جنگلات کی جانب چل پڑیں اور پھر نجانے کہاں تک کے علاقے کو کنٹرول میں لے لیا گیا۔ شہری آبادی کو وہاں سے دور کر دیا گیا تھا۔ اس طرح میرا وہ پہلا عمل تکمیل تک

پہنچ گیا جس کے لیے شدید جدوجہد کی تھی۔ اب صفدر شاہ رہ گیا تھا جس سے نمٹنا تھا اس کے لیے دو دن تک مکمل خاموشی اختیار کی گئی۔ صفدر شاہ کی کیا کیفیت تھی اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا۔ رمضان خان اور احمد بیگ بھی نہیں بتا سکتے تھے۔ غرضیکہ وقت گزرتا رہا' تاربین کے جنگلات کی آگ بجھا دی گئی تھی اور وہ دور ہی سے دیکھنے پر ایک بھیانک منظر پیش کرتا تھا' جب بھی ہم پہاڑ کی بلندیوں سے ادھر کا جائزہ لیتے نہ جانے کیا احساسات ذہن میں جاگ اٹھتے تھے۔ ڈیز کے لیے گویا جیسے یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ تیسرے دن عامل شاہ سے مشورے کے بعد میں نے صفدر شاہ سے رابطہ قائم کیا۔ انسٹافون پر اس سے رابطہ قائم کر کے میں نے اسے مخاطب کیا۔ صفدر شاہ کی نحیف سی آواز سنائی دی۔

''کون ہو بھائی' کہاں سے بول رہے ہو؟''

''تمہارا دوست' تم سے تعزیت کرنا چاہتا ہوں تمہارے دوست دلاور جان کی لیکن وہ میری لسٹ پر تھا۔ تم لوگوں سے اپنے وطن عزیز کو پاک کرنا میری زندگی کا اولین مقصد ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ایک ناپاک ستون اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا ہوں میں اور اب تمہاری باری ہے۔''

''ارے میں تو پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہوں۔ میرے بچے کی کیا حالت ہے۔ اس کی آواز سنا دو مجھے میں بیمار ہوں بستر پر پڑا ہوں۔ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہوں۔ مجھے اس کی آواز سنا دو۔ آہ مجھے اس کی آواز سنوا دو۔ تم نے اسے تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

''نہیں صفدر شاہ تم سے سودا کیے بغیر بھلا اسے کوئی نقصان پہنچایا جا سکتا تھا؟''

''تو پھر مجھے اس کی آواز سنوا دو۔ بعد میں ساری باتیں کر لوں گا۔''

میں نے عامل شاہ کو دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر جذبات کے سائے لرزاں تھے میں نے آہستہ سے اس سے کہا۔

''بات کر لو کوئی حرج نہیں ہے۔''

عامل شاہ نے ایک جھٹکے سے فون میرے ہاتھ سے لے کر خود کو سنبھال کر بولا۔

''میں عامل شاہ بول رہا ہوں۔'' جواب میں صفدر شاہ کی چیخیں سنائی دیں۔ بہت محبت کرتا تھا وہ اپنے بیٹے سے۔ اس نے کہا۔

''تو ان لوگوں سے وعدہ کر لے یہ جو کچھ چاہیں گے میں کروں گا۔ میں اپنی ساری دولت انہیں دینے کے لیے تیار ہوں جو سودا تو ان سے کرے گا میں اس کی تکمیل کروں گا۔ اگر تم میری بات سن سکتے ہو تو سنو۔ اپنا مقصد' اپنی ساری باتیں اسے بتا دو اور اسے میرے پاس بھیج دو اگر میں اس سے انحراف کروں تو تم اسے قتل کر دینا۔ میرے خاندان کو اور مجھے اس اسی طرح تباہ کر دینا جس طرح تم نے دلاور جان کو ختم کر دیا ہے۔ میری بات مان لو' میری بات مان لو۔''

''ٹھیک ہے صفدر شاہ' بہت جلد تمہیں اس سلسلے میں ہم اپنے آخری فیصلے سے آگاہ کریں گے۔'' میں نے کہا اور عامل شاہ کو اشارہ کیا۔ اس نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''معاف کر دینا عامل شاہ یقیناً تمہیں اپنے باپ کی اس حالت سے صدمہ پہنچا ہو گا۔ اس کے لیے میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

عامل شاہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ایسی باتیں مت کرو دوست۔ وہ کام کیا ہے تم نے' جو میں نے خوابوں میں دیکھا تھا۔ کاش تم میری

کیفیت سمجھتے۔''

''صفدر شاہ تمہارے عوض اپنی ساری دولت خرچ کرنے کو تیار ہیں۔''

''ہاں اب مجھے امید ہے کہ وہ ایسا کرے گا۔''

''مجھے اس دولت میں سے ایک پیسہ درکار نہیں ہے ہاں نقدی دولت کا مصرف میرے ذہن میں ہے۔''

''رمضان خان مجھے ایک بستی میں لے گیا تھا وہاں خوبصورت باغ بکھرے ہوئے تھے اور ان میں موجود درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ پھلوں کے گلے سڑے ڈھیر پر بچے ٹوٹے پڑے تھے کہ ان کا گزارہ انہی پھلوں پر ہوتا ہے غربت و افلاس سے سسکتے ہوئے لوگ زندگی کی ہر ضرورت سے محروم ہیں۔ میں چاہتا ہوں ان کو انسانی زندگی مل جائے اپنے باپ کی دولت سے تم ان کی بستی پکی بنوا دو۔ وہاں چھوٹی صنعتوں کے جال بچھا دو۔ بجلی' پانی زندگی کی عام سہولتیں فراہم کر دو انہیں۔ بس میں صرف اتنا چاہتا ہوں۔''

''بس۔'' عامل شاہ حیرت سے بولا۔

''ہاں اس سے زیادہ میری اور کوئی خواہش نہیں ہے۔''

''تم آخر کون ہو...... مجھ سے اپنا تعارف نہیں کراؤ گے۔ یہ سب کون ہیں تمہارے جن کے لیے تم نے یہ محنت کی ہے؟''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ سب میرے ہم وطن ہیں' میرے دیس کے رہنے والے' ہر شخص کچھ نہ کچھ کرتا ہے' اپنا فرض ادا کرتا ہے وہ۔ مختلف فرائض مختلف لوگوں نے اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں میں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہی بنا لیا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے اس نصب العین کی تکمیل میرے ہم وطنوں کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ مجھے ہر قیمت پر اپنا یہ فرض سر انجام دینا ہے۔''

عامل شاہ نے مدہم لہجے میں کہا۔

''ہر شخص کی کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں لیکن قابلِ عزت ہوتے ہیں وہ لوگ بلکہ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ جنہیں اپنی زندگی میں کچھ کرنے کا موقع مل جائے۔ میں تم سے بہت متاثر ہوں میرے دوست' کاش میں خود بھی تمہارے کام آ سکتا۔''

''کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو تم نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے' میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اپنی آرزو میں تمہیں بتا چکا ہوں' کاش اس کی تکمیل میری خواہش کے مطابق ہو جائے۔''

عامل شاہ نے گہری سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

''میں صرف اس کے لیے دُعا کر سکتا ہوں کہ تم جیسے انسان کی نگاہ میں سرخرو ہوں۔''

☆☆☆

کچھ عجیب سی بات ہے۔ شاید میری ذات میں انفرادیت ہے' شاید میری محرومی' میرا فن نئی جہت اختیار کر گیا تھا عام طور سے میرے جیسے لوگ حالات کے باغی بن کر مجرمانہ ذہنیت کے حامل ہو جاتے ہیں جرائم پیشہ' اسمگلر' منشیات فروش بن جاتے ہیں لیکن میرے جنون نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی یا پھر' جو اپنی غربت سے تنگ آ کر مجھے چھوڑ گئے تھے اس قدر شریف تھے کہ قدرت نے ان کے خون کو خراب نہیں ہونے دیا تھا۔

یعنی میرے ماں باپ۔

میرے دل میں اپنا پیارا وطن بس گیا تھا۔ میرا پاک وطن' میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو بن گئی تھی کہ میرے وطن کی ایک ایک انچ زمین پھولوں سے سج جائے یہاں خوشحالی ہو' ہر طرف مسکراہٹیں نظر آئیں'

کسی کے چہرے پر پریشانی کی شکن نہ ہو۔ بس دل چاہتا تھا کہ وطن کو اتنا آگے لے جاؤں کہ لوگ اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھیں۔

خواہشیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کا دوسرا کنارہ نہیں نظر آتا لیکن عمر محدود ہوتی ہے' وسائل درختوں پر نہیں اُگتے البتہ اگر لگن سچی ہوتی ہے تو راستے ضرور بنتے ہیں۔ میں دوسرے سے کہتا ہوں کہ انسان کبھی بدلے نہیں ہوتے اس وقت کا اپنا مزاج ہوتا ہے' مجھے سارے اچھے لوگ مل رہے تھے اجمل خان اور دوسرے' خاص طور سے ڈیز تو روبوٹ تھے جو مشینوں کی طرح کام کرتے تھے' کوئی بات کرو یقین ہوتا تھا کہ وہ کر ڈالیں گے۔

اسی طرح مجھے آصف جوگی مل گیا۔ شاید اسے میرے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ وہ انسان نہیں کسی سیارے کی مخلوق تھا۔ اتنا ذہین اتنا باعمل کہ حیرت ہوتی تھی' اب میرے بہت سے کام اس نے سنبھال لیے تھے باہم مشورے سے ہم نے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی تھی جسے "محب وطن" کا نام دیا گیا تھا۔

اس تنظیم کے مقاصد قطعی سیاسی نہیں تھے' ہمارا منشور تھا کہ ہم کبھی سیاست نہیں کریں گے ہاں کسی بھی سیاستدان کو ملک کے خلاف کام نہیں کرنے دیں گے اور ان پر بھرپور نگاہ رکھی جائے گی۔ بس اس کے بعد ہم نے کام شروع کر دیا تھا۔

عامل شاہ کے ذریعہ صفدر شاہ کو جس کام کے لیے مجبور کیا گیا تھا وہ ہو گیا تھا اور ایک چھوٹی سی لیکن خوشحال بستی وجود میں آ گئی تھی جسے دیکھ کر زندگی سے پیار ہونے لگتا تھا اور ہمیں اب نئے جہانوں کی تلاش تھی۔

پیر امیر شاہ اپنی قید میں تھا۔ یہ قید خانہ اس نے نہ جانے کس مقصد کے لیے بنایا ہو گا لیکن اب وہ خود اس کا قیدی تھا' نیلم شاہ اس کے ساتھ تھی' میں نے انسانیت کے نام پر ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا۔ ہر کام میں نے بڑے غور و خوض کر کے کیا تھا۔

آصف جوگی کی مدد سے ایک بہت بڑی تقریب منعقد کی گئی جس میں پیر امیر شاہ کی دستار بندی کی گئی اور مجھے ان کا جانشین بنا دیا گیا' پیر صاحب کے بارے میں انکشاف کیا گیا کہ وہ مقامات مقدسہ کی زیارت کو نکل گئے ہیں' اب ان کے تمام معاملات کا نگران میں ہوں' طاقت ہر بات منوا دیتی ہے اور یہ بات بھی منوالی گئی تھی چنانچہ میری دوسری شخصیت کا آغاز ہو گیا تھا' ایک طرف میں پیر جہانزیب شاہ کی حیثیت سے اک روحانی مقام رکھتا تھا تو دوسری طرف شاہ جی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور میرے غیر ملکی شناسا بھی مسٹر شاہ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

حیدر شاہ اور ان کے اہل خاندان کو میرے بارے میں معلوم ہو چکا تھا لیکن اب ان کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ میرے مقابل آتے' چنانچہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے اور میں ان کا کام بخیر و خوبی سرانجام دے رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن میری ذات کی تشنگی اپنی جگہ پر مقرر تھی۔ دل چاہتا تھا کچھ کروں' ایک دفعہ آصف جوگی نے ایک اخبار نکالنے کی تجویز پیش کی جو مجھے پسند آئی۔

"ہاں۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہو گا۔" اس نے کارکردگی ظاہر کر دی۔

"تو تیاریاں کروں۔" آصف جوگی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے منظوری دے دی اور اُس نے چراغ کے جن کی طرح کام شروع کر دیا' دفتر کے لیے عمارت ضروری ہو گئی تھی اخبار کا ڈیکلریشن فائل کر دیا گیا۔ میرا نام آئے اور کسی کام میں تاخیر ہو یہ ممکن نہیں تھا۔ سرکاری حلقوں میں میری بہت بڑی حیثیت ہو گئی تھی اور میں نے جینا سیکھ لیا تھا۔

آصف جوگی نے میرے لیے شاندار دفتر بنایا تھا اور اب اخبار کے لیے اسٹاف رکھا جا رہا تھا۔ پھر دوسرے اخبارات میں میرے اس اخبار کے بارے میں تفصیلات آنے لگیں اور ادھر اور بھی لوگوں نے مجھ سے معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ کلب پہنچا تو سب سے پہلے مسز نوید الٰہی کئی دوسرے افراد کے ساتھ مجھ سے ملیں اور انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہیے جہانزیب صاحب! اب تو آپ کا نام بڑے زبردست انداز میں اخبارات میں چھپ رہا ہے اور خصوصاً اخبارات انکشاف کر رہے ہیں کہ آپ خود بھی ایک اخبار کے مالک بننے والے ہیں، پروگرام کیا ہے؟''

''اخبار نکالوں گا۔''

''آپ کو اخبار نکالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' مسز نوید الٰہی نے سوال کیا۔

''یوں سمجھ لیجیے یہ میرا شوق ہے۔''

''اس شوق کے ذریعے آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''شوق کی تکمیل۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جواب واقعی معقول ہے لیکن کوئی نظریہ تو ہوتا ہے۔''

''اخبار سامنے آئے گا تو میرا نظریہ بھی آپ کے علم میں آ جائے گا۔''

''کاروباری دنیا کے ایک پُراسرار شخص کی یہ کارروائی بہت سوں کے لیے باعث تشویش بھی ہے اور باعثِ حیرت بھی۔ بہرحال دیکھیے بلی تھیلے سے باہر آئے گی تو سب کو پتا چلے گا۔''

''یقیناً! مسز نوید الٰہی!''

''کیا یہ اخبار صرف کاروباری نوعیت کا ہوگا؟'' ایم اے ساجد صاحب نے سوال کیا۔

''نہیں۔ ساجد صاحب صرف کاروباری نوعیت کا نہیں ہوگا میں کوشش کروں گا کہ اس سے عوامی مسائل بھی اُبھر کر سامنے آئیں۔''

''بہت اچھا منصوبہ ہے۔ بہرطور ہمیں ذہن میں رکھیے گا۔''

''مطلب' میں سمجھا نہیں؟'' میں نے ساجد صاحب سے کہا۔

''میرا مطلب ہے ہمارا بھی اس اخبار میں تھوڑا بہت حصہ ہونا چاہیے۔''

''سارا اخبار آپ کا ہوگا ساجد صاحب۔ تھوڑے بہت حصے کی کیوں بات کرتے ہیں آپ' آپ کے حکم کے مطابق کام ہوگا۔''

اس کے بعد اخباری مسئلے میں ہنگامہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ میرے پاس لوگ پہنچنے لگے۔ ایک دن اخبار کے دفتر میں ایسے صاحب پہنچے جن کا تذکرہ بے حد ضروری ہے' وہ بغل میں بیساکھی ٹیکتے ہوئے آئے تھے۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی' شکل وصورت بہت اچھی تھی لیکن ایک آنکھ سے محروم تھے۔ دایاں ہاتھ کلائی کے پاس سے کٹا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس پہنچے۔ بغل میں بریف کیس دبا ہوا تھا۔ میں نے انہیں اپنے کیبن سے دیکھا اور طلب کر لیا' وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

''مابدولت کو عازم فریدی کہتے ہیں۔ اگر آپ کو اُردو اخبار سے دلچسپی رہی ہے تو آپ نے میرے چھوٹے موٹے آرٹیکل اخبارات میں پڑھے ہوں گے۔ بہت کم اخبارات ہیں جو یہ آرٹیکل چھاپ دیا کرتے ہیں۔''

''بدقسمتی سے آپ سے ناواقف ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں میں خود اپنا تعارف کرانے آ گیا ہوں۔ نوکری درکار ہے آپ کے اخبار میں......؟''

”کیا کرنا پسند کریں گے آپ؟“
”صحافی ہوں، لکھتا رہا ہوں اور عمر کا ایک بڑا حصہ اسی چکر میں گزارا ہے۔“
”خوب تو میرا اخبار حاضر ہے آپ کے لیے جیسا کام کرنا چاہیں پسند کریں۔“
”بس چھوٹے موٹے آرٹیکل لکھا کروں گا لیکن آپ کو تحفظ مہیا کرنا ہوگا۔“
”تحفظ۔“
”جی ہاں۔ آپ خود تو سنبھل جائیں گے چونکہ بڑے آدمی ہیں لیکن مجھے لوگ مار مار کر باقی بھی ختم کر دیں گے۔“
”باقی۔“ میں نے سوال کیا۔
”جی ہاں۔ پہلے یہ میرا پاؤں بھی موجود تھا یہ ہاتھ بھی تھا اور یہ آنکھ بھی۔ جسم پر اور بھی بہت سے زخم ہیں جو پہلے نہیں تھے۔ صحافت کی دنیا میں آ کر یہ تحائف میں نے مختلف لوگوں سے وصول کیے ہیں۔“ میں چونک پڑا اور ان سے کہا۔
”میں سمجھا نہیں۔“
”بس لکھ دیا تھا کچھ سچ۔ ایک صاحب کے خلاف لکھا تو انہوں نے ٹانگ تڑوا دی۔ دوسرے کے خلاف لکھا تو انہوں نے آنکھ نکلوا دی۔ تیسرے کے خلاف لکھا تو انہوں نے یہ ہاتھ کٹوا دیا جسم پر اور بھی بہت چوٹوں کے نشانات ہیں جو مختلف مضامین کا نتیجہ ہیں، اب آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں نوکری کرنا چاہتے ہیں کیونکہ کوئی بھی اخبار نوکری دینے کے لیے تیار نہیں۔“ میں نے تاسف بھری نگاہوں سے عازم فریدی صاحب کو دیکھا اور کہا۔
”تو پھر آپ یوں سمجھے فریدی صاحب کہ یہ اخبار آپ کے لیے ہی ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ بلاوجہ کسی کے خلاف لکھ دیں، کوئی ایسی حقیقت ہو جس سے ملکی تعمیر کا پہلو نکلتا ہو تو آپ ضرور لکھیں لیکن بے مقصد کسی پر کیچڑ اچھالنا اچھی بات نہیں ہے۔“
”عزیزی اگر بے مقصد کیچڑ کسی پر اچھال دی جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ دو چار تھپڑ یا گھونسے لاتیں مار لیا کرتا ہے۔ یہ ہاتھ پاؤں کا مسئلہ تو درحقیقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب کسی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا جائے اور وہ کہا جائے جسے وہ کسی بھی قیمت پر منظر عام میں نہ لانا چاہتا ہو۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ بلاوجہ ہم کسی پر کیچڑ نہیں اچھالتے۔“
”ٹھیک ہے تو آپ سمجھ لیجئے عازم فریدی صاحب کہ آپ ہمارے یہاں ملازم ہو گئے۔“
”ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوانس مل جاتی تو اچھا تھا چونکہ پچھلے کافی دنوں سے کوئی آرٹیکل نہیں چھپا۔“
میں نے ہنستے ہوئے گردن ہلا دی اور ان سے کہا کہ انہیں ضرورت کے مطابق پیسے مل جائیں گے۔ بڑا عجیب تاثر چھوڑ کر گئے تھے عازم فریدی میرے پاس۔ بہر طور میں ذہنی طور پر ایسے لوگوں کو بے حد پسند کرتا تھا جو سچ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں چاہے انہیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس طرح اخبار کا سٹاف مکمل ہوتا جا رہا تھا اور میری زندگی میں بے شمار دلچسپیاں بکھر گئی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ مجھے ان تمام کاموں کو پہلے ہی شروع کر لینا چاہیے تھا۔ بلاوجہ ہی اتنے عرصے میں بھٹکتا رہا۔ گویا اب یہ سب کچھ مکمل ہوتا جا رہا تھا۔
اخبار کا دفتر قائم ہوا اور اس کے بعد اس کا افتتاح ہوا لیکن یہ افتتاح میں نے بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کر کے نہیں کرایا تھا بلکہ چند افراد کو ہی مدعو کیا تھا جن کا تعلق اخبار سے ہی تھا۔ ابھی تک میں نے عہدوں کا تعین نہیں کیا تھا۔ ڈیکلریشن وغیرہ کے سلسلے میں کارروائیاں ہوئی تھیں۔ آصف جوگی نے ہدایت

کے مطابق انہیں خفیہ رکھا تھا۔ عازم فریدی بھی موجود تھے' انہیں تنخواہ وغیرہ دے دی گئی تھی اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے افراد منتخب کر لیے گئے تھے جن میں کئی نام قابلِ ذکر ہیں اور رفتہ رفتہ انہیں سامنے لایا جاتا رہے گا۔

خصوصی طور پر ایک خوبصورت پرعزم لڑکی ثریا پروین قابلِ ذکر ہے جو اپنے افکاروخیالات سے بہت بہتر نظر آئی تھی۔ عازم فریدی سے بھی کئی بار گفتگو ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب میں نے اس کا نام چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے لیا تو وہ حیرت سے اچھل گیا اور وہاں موجود ہر شخص نے میرے اس فیصلے کو سراہا تھا چنانچہ باقی لوگوں کی ذمہ داری میں نے عازم فریدی پر چھوڑ کر تقریب کے خاتمہ کا اعلان کر دیا لیکن اس سے پہلے میں نے اخبار کی پالیسی ہر شخص پر واضح کر دی تھی۔

اس کے بعد یہ تقریب ختم ہوگئی۔ البتہ عازم فریدی اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا اس وقت جب میں واپس جا رہا تھا میری گاڑی میں آ گیا میں نے مسکراتی نگاہ سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

''میں کچھ وقت الگ سے لوں گا جناب عالی۔''

''ضرور فریدی صاحب۔ آیئے آپ میرے ساتھ چائے پیجیئے۔'' میں اسے کوٹھی لے آیا' عازم فریدی اپنی اُلجھنوں کا شکار تھا۔

''دراصل میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آپ مجھے اتنا بڑا عہدہ دے دیں گے۔ کیا میں آپ کے اس فیصلے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''

''وجہ صرف یہ ہے عازم فریدی صاحب کہ آپ سچ لکھنا چاہتے ہیں اور میں سچ چھاپنا چاہتا ہوں۔''

''آپ تو بڑے آدمی ہیں جہانزیب صاحب! لیکن میرا مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ اگر مجھے واقعی سچ لکھنے کی آزادی مل گئی تو اتنا سچ لکھوں گا کہ بہت سے چہرے کالے ہو جائیں گے۔''

''آپ تجربہ کار آدمی ہیں' وہ سب کچھ لکھیں جو ملک کی بھلائی کے لیے ہو' مگر ہمیں کسی پر کیچڑ نہیں اُچھالنی۔ ہمارا کسی سے ذاتی اختلاف نہیں ہے لیکن جو ہمارے ملک کا دشمن ہے ہم اس کے بدترین دشمن ہیں۔ ہم اس کی اس ملک دشمنی کے بارے میں لکھیں گے ہم اُن لوگوں کے بارے میں لکھیں گے جو ناقص دوائیں بازار میں لا کر انسانیت کو دردوکرب میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے خلاف لکھیں گے جو ہمارے ملک کا نادر ذخیرہ اسمگل کر کے ملک میں اس کی قلت پیدا کر رہے ہیں اور اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں اور عوام کی زبانیں دہشت سے دانتوں تلے دبی ہوئی ہیں کیا کریں' کیا کیا جائے۔ ہر چیز کے بارے میں یہ پتا چل جاتا ہے کہ آئندہ ماہ اس کی قیمت بڑھائی جارہی ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ جن لوگوں پر اس کا بوجھ پڑے گا ان کی زندگی کتنی دشوار ہو جائے گی۔ آخر ان تمام چیزوں کا کوئی تو حساب ہونا چاہیے' کوئی تو یہ بتائے کہ بھائیو ذخیرہ اندوزوں نے کھانے کا تیل کروڑوں ٹن جمع کر لیا ہے' اس کی قیمتیں بڑھائی جارہی ہیں' آپ لوگ تیار رہیں' ہم تیار نہیں ہوتے اور یہ بوجھ ہم پر لاد دیئے جاتے ہیں۔ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں کہ کس سے اس کی شکایت کریں۔ اخباری خبروں میں تلاش کرتے ہیں کہ کیا اس کی کوئی وجہ ہمیں معلوم ہو سکے گی۔ لیکن کوئی وجہ کسی کو نہیں بتائی جاتی اور اس کے بعد ہم بجٹ کے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ ہر ماہ قیمتوں میں ہونے والا اضافہ اپنی جگہ اور اس کے بعد سرکاری بجٹ پیش کیا جائے گا جس میں ان قیمتوں کو ازسرنو متعین کیا جائے گا اور اس کے بعد سال بھر پڑا ہوتا ہے۔ ہم ان تمام چیزوں کے بارے میں لکھیں گے نشاندہی کریں گے' ہم یہ کہیں

گے حکومت سے کہ عوام کو اعتماد میں لیا جائے ان سے صرف ووٹ نہ لیا جائے حکومتیں منتخب نہ کرائی جائیں، بلکہ ان کی اپنی بقاء کے لیے کچھ سوچا جائے۔ عازم فریدی صاحب یہ تمام چیزیں ہمیں اپنے اخبار میں لکھنا ہوں گی۔"

"خوب بہت خوب یہی میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ لکھا جانا ہے نا؟"

"ہاں۔اخبار کا اجراء اسی لیے ہوا ہے۔"

"تو پھر چند اشیاء کی ضرورت پیش آئے گی جو آپ ہمارے اور ہمارے اسٹاف کے لوگوں کے لیے مہیا فرمادیں۔"

"جی، جی۔بالکل، آپ بتائیں۔"

"چند بکتر بند گاڑیاں، کچھ ایسے تہہ خانے جہاں اس اخبار کے لوگ اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکیں کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کے لیے ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔" مجھے ہنسی آ گئی میں نے کہا۔

"یقیناً آپ کو تحفظ کی ضرورت بھی ہوگی۔ عازم فریدی صاحب آپ اطمینان رکھیے اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"بھئی ہمارا مسئلہ تو کوئی نہیں ہے تھوڑے سے لوگ باقی رہ گئے ہیں لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ اور بھی کچھ لوگ تھوڑے سے کم ہو جائیں۔ کم از کم انہیں تو مکمل رہنا چاہیے۔"

"آپ مطمئن رہیں اور کام کی تیاریاں کریں اور اس کے بعد جو بھی مناسب دن ہو اس دن اخبار منظر عام پر لے آئیں۔"

عازم فریدی نے کام شروع کر دیا اور "وطن" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ گیا۔ بہت سے شاندار کالم لکھے گئے تھے۔ عازم فریدی کا اداریہ لنگڑے لولے کے قلم سے تھا اور اس میں میرے افکار و خیالات کی بھرپور ترجمانی کی گئی تھی۔ ثریا پروین نے "اے وطن میرے وطن" کے نام سے کالم لکھا تھا اور یہ کالم آنکھیں بھگو دینے والا تھا۔ بڑے اچھے لوگ مل گئے تھے مجھے، اخبار کا افتتاح بڑی سادگی سے کر دیا گیا تھا جس پر لوگوں کو حیرت ہوئی تھی۔ بہر طور میرے ایک کام کی تکمیل ہو گئی تھی اخبار کے سلسلے میں مجھے دن رات ٹیلیفون موصول ہوتے رہتے تھے۔ جن میں مبارکباد کے پیغامات تھے مگر چند ہی روز کے بعد کچھ اور ٹیلیفون بھی مجھے موصول ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پہلے عازم فریدی نے ہی اس بارے میں مجھے اطلاع دی تھی۔

"آغاز ہو گیا جہانزیب صاحب۔"

"کیا مسٹر فریدی......؟"

"تین ٹیلیفون موصول ہوئے ہیں ہمارے خصوصی کالموں پر تنقید کی گئی ہے۔ مثلاً ہمارا ایک کالم جس کا عنوان کچا چھٹا ہے اس میں ہم نے ان سرمایہ داروں کو تنبیہ کی تھی جو من مانی کر رہے ہیں اور ہم نے کہا تھا کہ ہم بساط بھر کوششیں کریں گے۔ ان کے کرتوت منظر عام پر لائے جائیں گے۔ اس سے پہلے ہم اس کے لیے مجبور ہو جائیں وہ سدھر جائیں۔ جواباً ہمیں کہا گیا ہے کہ زبان درست کر لی جائے ورنہ ایسے کاموں کا انجام بہتر نہیں ہوتا حالانکہ ذاتی طور پر میں نے ان لوگوں سے معذرت کر لی ہے اور ساری تفصیل ان کو بتا دی ہے لیکن انہوں نے میری ان باتوں کو مذاق سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور مجھے ہدایت کی ہے کہ یہ کالم فوراً بند کر دیا جائے اور ذرا ہوشیار رہا جائے۔ میں نے فریدی کو تسلیاں دیں اور ان سے کہا کہ ان کے لیے معقول بندوبست کر دیا جائے گا اور یہ بندوبست آصف جوگی کے سپرد کر بھی دیا گیا۔

آصف جوگی اس وقت ایک مشین چکا تھا اور اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ بعض اوقات مجھے شرمندگی ہوتی

تھی۔ وہ ایک طرح سے میری ڈھال بنا ہوا تھا اور کارکردگی کا انداز ایسا تھا کہ جس طرف میرا اشارہ ہو جائے وہاں صفائی ہی صفائی ہو جائے اور کوئی ایسی رکاوٹ میرے راستے میں نہ رہے، درحقیقت اگر آصف جوگی جیسے شخص کا اتنا بڑا اسہارا مجھے حاصل نہ ہوتا تو شاید میرے لیے اس برق رفتاری سے کام کرنا ممکن نہ ہوتا۔ چنانچہ آصف جوگی نے اطمینان دلایا کہ فریدی کی دن رات نگرانی کی جائے گی اور انہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ایسے ہی ٹیلیفون پھر براہِ راست مجھے موصول ہونے لگے جن میں مجھ سے کہا گیا کہ یہ بلیک میلنگ بند کردی جائے کیونکہ یہ میرے حق میں بہتر نہیں رہے گی۔ میں نے ان لوگوں سے اپنی رہنمائی چاہی اور گالیاں دیتے ہوئے بند کر دیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس سلسلے میں مجھے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور اب ان مشکلات کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو میں صنعتیں لگا رہا تھا اور اپنے ان مقاصد کی تکمیل کر رہا تھا جو میرے ذہن میں تھے لیکن بہرحال میرے وسائل اتنے بھی نہیں تھے کہ سارے کام میں انتظار کیے بغیر کر ڈالتا۔ جوں جوں میرے کاروبار میں ترقی ہوتی، اسی طرح میں اپنے کام کا دائرہ کار بڑھا سکتا تھا۔ بے شک آصف جوگی نے اپنے دوسرے ذرائع بھی استعمال کیے تھے اور اچھے خاصے فنڈ اکٹھے کر رہا تھا لیکن یہ اتنے محدود تھے کہ ہم ایک دو شعبوں کو آگے بڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ایک دلچسپ کارروائی کا آغاز ہوا اور اس کا تذکرہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔

اخبار کی وساطت سے میری ملاقات مس ایلن پارکر اور مسٹر کول مین سے ہوئی، یہ دونوں سویڈن کے ایک بڑے اخبار سے متعلق تھے جو کاروباری نوعیت کا اخبار تھا۔ عازم فریدی نے ٹیلیفون پر مجھے ان دونوں کے بارے میں بتایا تھا اور اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے ہاں مدعو کرایا، عازم فریدی، ثریا پروین اور دوسرے چند افراد کو بھی بلا لیا تھا۔ ایلن پارکر اور کول مین نوجوان تھے اور خصوصاً ایلن تو بہت ہی دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ کول مین البتہ ایک خشک اور کھردرے چہرے والا لمبا سا نوجوان تھا لیکن گفتگو کے لحاظ سے نہایت ذہین اور سمجھدار نظر آتا تھا۔ دونوں نے مجھ سے میرے اقدامات پر سیر حاصل گفتگو کی اور انہیں خاصا سراہا بھی تھا، خصوصاً ایلن تو خاصی متجسس تھی۔ اپنے طور پر وہ مجھے کوئی ساٹھ ستر سال کا بوڑھا سمجھے ہوئے تھی مگر مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اور اس بات کا وہ اظہار کیے بنا بھی نہ رہ سکی۔

اگلے چند دن وہ ”وطن“ کے مہمان رہے۔ اس دوران انہوں نے ”وطن“ میں چند مضامین وغیرہ بھی لکھے، پھر جس روز انہیں روانہ ہونا تھا۔ میں بھی انہیں الوداع کہنے کے لیے ائرپورٹ پہنچ گیا۔ میرے اس اقدام کو میرے سٹاف نے حیرت ہی سے دیکھا تھا۔ البتہ میں نے کول مین کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک اور انداز میں بے چینی محسوس کی تھی جیسے وہ مجھ سے کوئی بات کہنا چاہتا ہو۔ پھر موقع ملتے ہی اس نے ایک لفافہ جیب میں ڈال دیا۔ اس نے یہ حرکت اتنی تیزی اور اچانک کی تھی کہ اسے کوئی بھی محسوس نہ کر سکا۔ میں نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مسٹر شاہ یہ لفافہ آپ کے لیے کسی کی امانت ہے۔ میرا مطلب ہے کسی نے یہ آپ کے لیے دیا ہے اور اسے ہمیں آپ تک پہنچانا تھا۔“

”کس نے؟“ میں نے حیرانی سے لفافے کو ٹٹولتے ہوئے کہا جس میں ایک موٹے کاغذ کا

احساس ہوتا تھا۔

"یہ تو آپ کو لفافے کے اندر رکھا ہوا پرچہ کھول کر ہی پتہ چلے گا۔ ویسے اس لفافے میں جو مضمون ہے اس سے متعلق ایک دوسرا پینل یہاں پہنچنے والا ہے جو آپ سے فوری طور پر رابطہ قائم کر کے آپ کے فیصلے کے بارے میں معلوم کرے گا۔ یہ پینل منظر عام پر نہیں ہوگا بلکہ ٹیلیفون پر ہی آپ سے رابطہ قائم کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے تمام تفصیلات آپ کو اس لفافے میں رکھے ہوئے کاغذ سے مل جائیں گی۔"

گھر پہنچ کر میں نے لفافہ کھولا اور میں حیران رہ گیا یہ میرے لیے ہار پر مشن کی طرف سے تھا جس میں انہوں نے میرے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا تھا اور مجھے اپنے ہیڈ کوارٹر آنے کی دعوت دی تھی۔ مزید لکھا تھا کہ مشن کی طرف سے ایک نمائندہ پینل میرے پاس آ رہا ہے اور یہ کہ ہار پر مشن کے سربراہان تم پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ تم یہاں ان کی نمائندگی کرو۔ اس مشن میں شمولیت کے بعد کسی نقصان کا خطرہ نہیں رہتا بلکہ بہت سے ایسے مفادات حاصل ہو جاتے ہیں جو تصور میں نہ ہوں۔ انہیں اُمید ہے کہ تم اس پر غور کرو گے۔ طریقہ کار وہی ہوگا، یعنی تمہیں در پردہ سرمایہ داروں سے رابطے قائم کر کے انہیں ہار پر مشن کا ممبر بنانا ہوگا لیکن ایسے سرمایہ دار جن کی مالی حیثیت اور استحکام کی تفصیل تمہیں معلوم ہو گئی ہو اور یہ کام اتنا مشکل نہیں ہوگا، اس کے لیے تمہیں اعلیٰ ترین ورکرز بھی دیئے جائیں گے۔

میں ششدر رہ گیا تھا۔ ذہن کی دنیا اُلٹ پلٹ ہو گئی تھی۔ یہ اتنا بڑا چکر ہے مجھے اس کا شبہ بھی نہیں تھا۔ درحقیقت اس کارروائی نے مجھے حیران کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی سوچنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے جوگی کو بلوایا اور کافی دیر تک اس سے مشورہ کرتا رہا، پھر جوگی واپس چلا گیا۔

کئی روز گزر گئے کوئی خاص واقعہ نہ ہوا، پھر ایک روز جوگی میرے پاس آیا۔ آصف جوگی کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

"اس وقت تمہاری آمد کا کوئی خاص مقصد ہے......؟"

"نہیں چیف کوئی خاص نہیں۔ بس کافی دن ہوئے ملاقات نہیں ہوئی تھی، سوچا آپ کے پاس آ جاؤں۔"

"ہاں ادھر سے بھی کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔"

"یعنی ہار پر مشن کی طرف سے۔"

"ہاں اسی کی بات کر رہا تھا۔"

"ویسے چیف میرا خیال ہے وہ لوگ پہنچیں گے ضرور۔"

"یقیناً میرا بھی یہی اندازہ ہے جو کچھ انہوں نے کہا بے مقصد تو نہیں کہا ہوگا۔"

"اس دوران کچھ سوچنے کا موقع ملا؟"

"ہاں! میں نے اس دوران جو کچھ سوچا ہے، اس سے بہت سے ایسے نتائج نکالے ہیں جو تمہارے لیے غیر متوقع ہوں گے۔"

"بتانا پسند فرمائیں گے چیف؟" آصف جوگی نے کہا اور میں کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر میں نے اس سے کہا۔

"میں نے بہت غور کیا ہے۔ آصف جوگی بگڑے ہوئے معاشرے کو لمحوں میں نہیں سدھارا جا سکتا۔ یہاں ملک کی بنیادوں پر سوچ کا فقدان ہے اور سب سے پہلے اپنا مفاد مدنگاہ رکھا جاتا ہے، ہم اس ذہنیت کو لمحوں میں نہیں تبدیل کر سکتے بلکہ اس کے لیے تو صدیاں درکار ہوں گی اور ظاہر ہے میری یا

تمہاری عمر اتنا ساتھ نہیں دے سکتی۔ پھر وہی بات آجاتی ہے کہ جس حد تک بھی کچھ کیا جاسکے اس سے کیوں گریز کیا جائے۔ میں نے بہت غور کرنے کے بعد دل میں ایک فیصلہ کیا ہے اور تمہیں بھی اس سلسلے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"میں منتظر ہوں چیف۔" آصف جوگی نے کہا۔

"میرے خیال میں مجھے مشن کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔" آصف جوگی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ تاہم اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔

"جی چیف! ذرا تفصیلات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں اگر ہم ہارپر مشن کی مدد حاصل کر لیں تو ہمیں اپنے مقاصد میں کافی کامیابیاں حاصل ہوسکتی ہیں۔ ایک طرف سے تو ایسے بین الاقوامی ادارے کی مدد حاصل ہو جائے گی جو اس قسم کے معاملات میں دلچسپی ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کے لیے مکمل طور پر اپنے وسائل سے کام لے کر عمل کرتا ہے۔ دوسری طرف جب ہم یہاں ممبر سازی کریں گے تو ہمیں بہت سے سرمایہ داروں کا مکمل تعاون حاصل ہو جائے گا۔ ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد ہم اپنے طور پر جو کچھ بھی کریں گے وہ زیادہ موثر ہوسکتا ہے۔ یعنی اس طرح ان پر وہ فیصلے بھی مسلط کئے جاسکتے ہیں جو بظاہر مشن کے مفاد میں کئے جائیں گے لیکن ان میں ہمارا اپنا مقصد بھی پوشیدہ ہوگا۔ یوں ہم اپنے وطن کے رہنے والوں کے لیے مراعات حاصل کرسکیں گے۔ جب کہ یہ لوگ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی نہ ہوں۔"

"جی چیف آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"بس اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آصف اب مجھے اس پینل کا انتظار کرنا چاہیے اور اپنے خیالات کے برعکس اسے بہترین استقبالیہ دینا چاہیے۔" آصف جوگی نے ایک چھوٹی سی فائل نکالی اور اسے درمیان سے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"چیف اس دوران میں بھی اس بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا ہوں اور میں نے اپنی سوچوں کو کاغذ پر منتقل کرلیا ہے۔ ذرا اسے ملاحظہ فرمالیجئے۔"

میں نے فائل اپنے سامنے رکھی اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ آصف جوگی بھی اس دوران بہت کچھ کرتا رہا تھا۔ اس کی تفصیلات کاغذات میں موجود تھیں۔ اس نے بہت سے منصوبے بنائے تھے اور پھر خود ہی ان کی تردید بھی کی تھی اور اس کے لیے دلائل بھی مہیا کئے تھے لیکن اس کا آخری فیصلہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آخری فیصلہ میرے فیصلے سے بالکل مختلف نہیں تھا۔ یعنی اس نے بڑے پُرزور دلائل کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ اگر ہارپر مشن کی حمایت اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے حاصل کرلی جائے تو بُرا نہیں ہوگا۔ اس طرح ان سرمایہ داروں کو درست کرنے کا موقع مل سکے گا جو سرکشی کرسکتے ہیں اور راستے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ ہارپر مشن کا رکن بننے کے بعد وہ تمام احکامات کی تکمیل کے لیے مجبور ہوں گے جو مشن کے تحت دیئے جائیں اور اگر وہ اس سے انحراف کریں گے تو پھر انہیں بدترین نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔" میں مسکرانے لگا پھر میں نے کہا۔

"تو اس کا مقصد ہے کہ اب تم میرے فیصلے سے اتفاق کرو گے۔"

"مکمل طور پر چیف۔ مکمل طور پر۔ ان میں داخل ہونے کے بعد ہم زیادہ موثر طریقے سے کام کرسکتے ہیں۔"

آصف جوگی سے یہ مسئلہ طے ہوگیا اور یہ بھی ایک

دلچسپ بات تھی کہ مشن کے نمائندے جو ایک مخصوص پینل کی شکل میں آنے والے تھے انہی دنوں وہاں پہنچے تھے۔ ہمیں کسی بھی طور اس کا علم نہیں تھا۔ بس ایک دن ٹیلیفون پر رابطہ ہوا۔ فون کرنے والے نے اپنا نام رے وائزر بتا کر مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کیا میں ملاقات کی وجہ جان سکتا ہوں مسٹر رے وائزر؟"

"سر آپ سے کچھ دن پہلے کہا گیا تھا کہ ہم لوگ آنے والے ہیں۔ میں اسی پینل کا نمائندہ ہوں۔"

"آپ کے ساتھ کتنے افراد ہیں مسٹر رے وائزر؟"

"ہم چار افراد ہیں جناب۔ ایک خاتون اور تین مرد۔"

"آپ لوگ فوری طور پر مجھ سے ملاقات کریں۔"

"سر ہماری حیثیت۔"

"آپ کس حیثیت سے یہاں آئے ہیں؟"

"ہم ایک ڈیم کے سلسلے میں گفتگو کرنے آئے ہیں اور سویڈن کی اس فرم کو ایک ڈیم کے سلسلے میں دعوت دی گئی ہے اور ہم اسی کے سروے کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔"

"بہت خوب! میں کوشش کروں گا کہ ہماری ملاقات جلد ہو۔" پھر میں نے تھوڑی دیر گفتگو کے بعد فون بند کر دیا اور انہیں مدعو کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ انہوں نے کوشش کی تھی کہ ہماری ملاقات بظاہر سرکاری ہی نظر آئے۔

مسٹر رے وائزر اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ آئے تھے۔ اس ٹیم کی سربراہی وہی کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی بھی تھی جس نے اپنا نام شیلی پارک بتایا تھا۔ میں نے ان کے اعزاز میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ ویسے کسی اور کو دعوت نہیں دی تھی اور تنہا ہی انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ شیلی پارک، رے وائزر اور باقی دو افراد میرے ساتھ میرے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ شیلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر شاہ ہم نے بہت کچھ سنا ہے آپ کے بارے میں آپ نے جس خلوص سے ہمیں دعوت دی ہے اس کے لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں جبکہ ہمارا خیال تھا کہ شاید آپ ہماری آمد کو پسند نہ کریں اور اگر ہم آپ تک پہنچ بھی جائیں تو آپ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ کا سوچنا غلط نہیں تھا لیکن اس کے برعکس فیصلہ بھی تو ہو سکتا تھا۔"

"یعنی......"

"یعنی یہ کہ میں آپ لوگوں کو اپنے دوستوں کی حیثیت بھی دے سکتا تھا۔"

"اب آپ کا کیا خیال ہے آپ ہمیں اپنا دوست سمجھتے ہیں یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے دشمنوں سے اتنے خوشگوار انداز میں دنیا میں کہیں بھی نہیں ملا جاتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر اپنے اس دوست کو تھوڑی سی کارروائی کرنے کی اجازت دیں گے۔"

"مثلاً۔" میں نے سوال کیا۔

"آپ سوال نہ کریں سر بلکہ اجازت دے دیں۔" شیلی بولی۔

"ٹھیک ہے کیا کرنا چاہتی ہیں آپ۔" میں نے کہا اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے وزنی ہینڈ بیگ سے ایک آلہ نکالا اور اس کے بٹن آن کرنے لگی۔ ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ اس آلے میں گرین بلب اسپارک کرنے لگا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے پورے ڈرائنگ روم کا چکر لگایا

اور غالباً دیکھنے کی کوشش کرتی رہی کہ یہاں ان لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کرنے کا کوئی بندوبست تو نہیں ہے اس آلے میں سبز بلب جلتا رہا۔ اس کے بعد شیلی باہر نکل گئی اور اس نے غالباً ڈرائنگ روم کے اطراف میں بھی یہی کارروائی کی، پھر مطمئن ہو کر اندر آ بیٹھی۔

''اس تمام کارروائی کے لیے معذرت۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں نے سب کچھ کیوں کیا ہے۔''

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، بلکہ مجھے خوشی ہے کہ آپ لوگ ذہانت سے کام لیتے ہیں۔''

''جی سر! درحقیقت ہمارا مشن بہت سے ملکوں کے لیے ناپسندیدہ ہے اور اس کے علاوہ ہماری تنظیم اپنے ذاتی دشمن بھی رکھتی ہے۔ ہم یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ ہو سکتا ہے آپ سے بھی ہمارے کسی دشمن نے رابطہ کیا ہو۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب آپ مطمئن ہیں؟''

''جی سر۔ بالکل مطمئن۔''

''تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے آپ کا نظریہ معلوم کروں۔'' اس بار ریے وائزر نے کہا تھا۔

''ہاں مسٹر ریے وائزر آپ مجھ سے میرا نظریہ معلوم کر سکتے ہیں لیکن پہلے یہ ثابت کر دیجیے کہ آپ کا تعلق درحقیقت ہارپر مشن سے ہے۔''

''سو فیصد جناب، سو فیصد۔'' ریے وائزر نے کہا اور ساتھ لائے ہوئے بریف کیس کو کھول کر اس میں سے کچھ کاغذات نکالنے لگا۔ اس میں خط کی وہ کاپی موجود تھی جو پہلے مجھے دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مشن کے بارے میں کچھ اور ایسے تعارفی کارڈ تھے جو مجھے دکھائے گئے اور میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مسٹر ریے وائزر میں آپ سے مطمئن ہو چکا ہوں اور اب آپ کے ساتھ مکمل تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''ہم آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے مشن کے مقاصد کو سامنے رکھنے کے بعد اس میں شمولیت کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں خلوصِ دل سے مشن میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔'' ان سب کے چہرے کھل اُٹھے تھے۔ خاص طور سے شیلی بہت پُرجوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو اپنے ساتھ شامل کر کے دلی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے پہلے میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔'' ریے وائزر اور دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ کم از کم میں نے یہ اندازہ ضرور لگایا ان کے بارے میں کہ وہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس سے بہت زیادہ مخلص نظر آتے ہیں۔ ریے وائزر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''اور جب آپ مشن سے رابطہ قائم کرنے کے بعد اس کے کام کو دیکھیں گے تو آپ کو دلی مسرت ہو گی اور صحیح معنوں میں کہ یہ سوچیں گے کہ آپ نے ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔''

''میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد یہ کارروائی کی ہے۔''

''آپ کو مشن کے بارے میں تو تفصیلات معلوم ہو چکی ہوں گی۔''

''بہت زیادہ نہیں۔''

''تو بس مختصر الفاظ میں آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کو بہت بڑی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور ہر طرح کا کاروباری اور مالی مفاد حاصل کریں گے آپ۔''

''ایک سرمایہ دار اس سے زیادہ اور کیا چاہ سکتا ہے۔''

''لیکن مشن کی طرف سے آپ پر بہت سی ذمہ

داریاں بھی عائد کی جائیں گی اور آپ کو ان کی تکمیل کرنا ہوگی۔"

"کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"لیکن ابتداء میں آپ کو مشن کے اعتماد پر پورا اُترنا ہوگا۔ جوں جوں وقت گزرتا رہے گا آپ پر ہمارا اعتماد بڑھتا جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ آپ کو مشن کے لیے کچھ وقت صرف کرنا پڑے گا اور دوسرے تمام کاموں کو چھوڑ کر مشن سے رابطے رکھنا پڑیں گے۔ ہوسکتا ہے اس میں آپ کو ایک یا دو ماہ لگ جائیں۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تو کیا ممکن ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی سویڈن تک کا سفر کرنا پسند کریں۔"

"اگر مشن اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو میری پسند ناپسند کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میں اسے اس کے معیار کے مطابق اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہمیں آپ سے اس شاندار تعاون کی توقع نہیں تھی مسٹر شاہ۔ نجانے کیوں مشن میں یہ بات طے کرلی گئی تھی کہ آپ ٹیڑھی کھیر ثابت ہوں گے۔"

"اگر مشن مجھے پاگل سمجھتی ہے تو اسے میری طرف توجہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ ایک ہوشمند انسان کی حیثیت سے میں نے جو فیصلے کیے ہیں وہ میرے حق میں بہتر ہیں اور ظاہر ہے ان کی ادائیگی مشن کو بھی ہوگی۔"

"تو پھر ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جانا پسند کریں گے اور آپ جتنا بھی وقت ہم سے چاہیں ہم یہاں صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"میرا خیال ہے روانگی کے سلسلے میں مجھے زیادہ تیاریاں یا بہت زیادہ دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اگر آپ پسند کریں تو میرے ہاں ہی قیام کریں۔"

"نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا کیونکہ ہم کسی اور حیثیت سے یہاں آئے ہیں تاہم آپ جب بھی چاہیں ہم سے ملاقات کرسکتے ہیں۔"

وہ خاصا وقت میرے ساتھ گزار کر رخصت ہو گئے۔ میں مطمئن تھا اور اب مجھے ان کے ساتھ روانہ ہونے کی تیاریاں کرنی تھیں۔ آصف جوگی کو میں نے تمام تفصیلات بتادیں اور اس کے بعد تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ جو کچھ میں کرنے جارہا تھا اب اس سے بالکل مطمئن تھا اور اس کے سلسلے میں کسی قسم کا کوئی تردد میرے ذہن میں نہیں تھا۔ ویسے درحقیقت یہ فیصلہ بہترین تھا ان لوگوں کے سامنے سینہ تان کر آنے کے بجائے ان میں شامل ہوکر ان کے خلاف کام کرنا زیادہ بہتر ہوسکتا تھا۔ آصف جوگی سے بہت سے مشورے ہوئے۔

میں نے رے وائزر سے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔ وہ لوگ تیار بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ ایک مقررہ وقت پر ہم لوگ ائرپورٹ پہنچ گئے۔ شیلی پارک جہاز میں میرے بالکل نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں اپنی اس کامیابی پر بے حد فخر محسوس کرتی ہوں، مسٹر شاہ جس کے لیے ہمیں تیار کیا گیا تھا اور جس کے لیے سوچتے ہوئے کافی حد تک پریشان نظر آتے تھے۔"

"یہ بات میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا مس شیلی کہ آپ لوگ پریشان کیوں تھے؟"

"بس آپ میری باتوں کا برا نہ مانئے۔ ہمارے سربراہوں کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ آپ اس قدر

ذہانت کا ثبوت دیں گے۔ بہت بڑا مسئلہ ہے جس کی تفصیلات تو آپ کو اسٹاک ہوم پہنچ کر ہی معلوم ہوں گی۔ ہار پر مشن مکمل طور پر اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ ایشیا کے لیے ایک جامع پالیسی بنائی جائے۔ جیسا میں نے کہا اس کی تفصیلات تو آپ کو اسٹاک ہوم چل کر ہی معلوم ہوں گی۔ مختصراً یہ کہ ہمیں اس کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ ویسے مسٹر شاہ وہاں مشن کے سلسلے میں آپ کی مصروفیات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ ذاتی طور پر کچھ وقت ضرور دیں۔ مجھے آپ کا میزبان بنتے ہوئے خوشی ہو گی۔"

"میں آپ کا مہمان ہوں اور آپ میری میزبان۔" آپ جو چاہیں گی میں اس سے کیسے انحراف کر سکتا ہوں۔"

"نہیں یہ بات میں مشن کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ذاتی طور پر کہہ رہی ہوں۔"

"تب میں ذاتی طور پر آپ کا مہمان بننا پسند کروں گا۔"

"شکریہ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اسٹاک ہوم تک کا سفر خاصا دلچسپی کا حامل رہا تھا۔ شیلی بہترین ہم سفر ثابت ہوئی تھی۔ اس کے گفتگو کرنے کے انداز میں بڑی خوبصورتی تھی، میں نے بھی اپنے ذہن کو ان تمام خدشات سے پاک کر لیا تھا جو پیدا ہو سکتے تھے اور اب میں ایک بالکل ہی سادہ ذہن انسان کی حیثیت سے آئندہ اقدامات پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اپنی شخصیت میں، میں خود بخود ایک نیا پن محسوس کرنے لگا تھا۔ بالآخر ہم اسٹاک ہوم پہنچ گئے۔ میری رہائش کے لیے وہاں ایک شاندار ہوٹل کا انتخاب کیا گیا لیکن مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ شیلی میرے برابر والے کمرے میں مقیم ہے۔ مجھے اس لڑکی سے اتنی تیزی کی اُمید نہ تھی۔ بعدازاں مجھے پتہ چلا کہ وہ بحیثیت گائیڈ میرے ہمراہ رہے گی۔

☆☆☆

وہ جرمن نژاد تھی۔ اس کا خاندان اب بھی جرمنی ہی میں مقیم تھا۔ البتہ وہ گزشتہ آٹھ سال سے مشن سے منسلک ہونے کے باعث سویڈن ہی میں رہتی تھی۔ آزاد معاشرے کی فرد ہونے کے ناتے وہ مجھ سے خاصی بے تکلفی کا اظہار کر رہی تھی۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ البتہ میں اس کی ان دراز دستیوں سے بچنا چاہتا تھا جو اس کی فطرت کا حصہ نظر آتی تھیں اور اس کے لیے مجھے کوئی خاصی دقت نہ پیش آئی۔ میں نے خود کو ریزرو رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ قدرے سنبھل گئی تھی۔

اسٹاک ہوم میں میرے قیام کو تیسرا دن تھا۔ اس دوران مختلف افراد نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ گفتگو کی نوعیت کاروباری ہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شیلی مجھے شہر بھی دکھا رہی تھی۔ اس نے شمالی یورپ کے اس ملک کے بارے میں تفصیلات بتائیں اور ایک ایک چیز سے روشناس کرانے لگی۔ میں بھی خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ سویڈن کی عام صنعتی پیداوار مشینری، آلات، آٹو موبائل اور بہت سی ایسی مصنوعات تھیں جنہیں انتہائی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں جنگلات کا بھی ایک بڑا وسیع حصہ تھا اور بہت سی ایسی چیزیں پیدا ہوتی تھیں جنہیں دنیا کے دوسرے ممالک بڑی دلچسپی سے برآمد کرنا پسند کرتے تھے۔ ناروے، جرمنی، فن لینڈ، ڈنمارک، امریکا اور برطانیہ سے اس کی تجارتی شراکت تھی۔ تفریحی مقامات بھی بے شمار تھے۔ بہر طور ان تمام چیزوں میں تقریباً ایک ہفتہ صرف ہو گیا۔ وہ لوگ بے دردی سے میرا وقت خرچ کر رہے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد پانچ افراد کے ایک گروہ نے مجھ سے ملاقات کی۔

''کیا آپ اب تک کی گفتگو سے خود کو مطمئن پاتے ہیں۔'' گروپ لیڈر نے مسکرا کر کہا۔
''میں تو روزِ اول سے ہی بالکل مطمئن تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ لوگوں کو کب وقت ملتا ہے کہ آپ مجھ سے وہ گفتگو کریں گے جو اس سلسلے میں ضروری ہے۔''
''ہم چاہتے تھے کہ آپ ذہنی طور پر مطمئن ہو جائیں اس کے بعد آپ سے گفتگو کی جائے۔''
''میں بالکل مطمئن ہوں۔''
''تو پھر آپ کو ہمارے ساتھ ایک مختصر سا سفر طے کرنا پڑے گا۔''
''میں تیار ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
مجھے ان کے طریقہ کار پر حیرت سی ہو رہی تھی۔ بہر حال ہماری اگلی منزل مالمو تھی جہاں ایک عمارت میں آٹھ افراد نے میرا استقبال کیا اور مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ سب کے سب مختلف ممالک کے باشندے تھے۔ پہلے دن ہی مجھے خصوصی طور پر رات کو ڈنر کے بعد ایک میٹنگ میں مدعو کیا گیا اور یہاں صرف پانچ افراد تھے جو غالباً مشن میں انتہائی اہم نوعیت کے حامل تھے۔ ان میں بھی ایک دراز قامت متناسب جسم کی خاتون شامل تھی۔ آنکھوں پر لگا ہوا سونے کے فریم کا چشمہ اس کی شخصیت میں دلکشی پیدا کر رہا تھا۔ مجھے معزز مہمان کی حیثیت سے خوش آمدید کہا گیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔
''ہار پر مشن کے تمام مقاصد اس کی نوعیت اور حیثیت سے آپ واقف ہو چکے ہوں گے مسٹر شاہ۔ اس وقت دنیا خصوصی طور پر کاروباری سلسلے میں مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کی تفصیلات میں جانا بیکار ہے۔ ایک کاروباری آدمی ہونے کی حیثیت سے آپ کو بھی اس کا علم ہوگا۔ ہر شخص اپنی اجارہ داری چاہتا ہے، ہم بھی اسی پیمانے پر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہمارے پاس جو منصوبے ہیں ان کی مکمل تفصیل آپ کو فراہم کر دی جائے گی۔ درحقیقت ہماری خواہش ہے مسٹر جہانزیب کہ ایشیا کے لیے ہم ایک نمائندہ مقرر کریں اور اسے اتنے اختیارات دیں کہ وہ علاقے کے تمام ممالک کو کنٹرول کر سکے اور اس کے لیے ضروری ہے مسٹر شاہ کہ ہمیں اتنا ہی مضبوط اور ذہنی طور پر طاقتور انسان چاہیے ہے، جسے ہم ایشیائی مرکز کا سربراہ بنا سکیں۔ ہم آپ کی طرف سے مطمئن ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کو رضاکارانہ طور پر ہمارے کچھ مقاصد کے لیے کام کرنا ہوگا۔''
''مثلاً؟'' میں نے سوال کیا اور ان میں سے ایک شخص نے سامنے رکھی سیاہ رنگ کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ یقیناً کسی کو طلب کیا گیا تھا اور اس کے بعد دروازہ کھول کر ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ میرے ذہن کو شدید سنسنی کا احساس ہوا تھا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ یہ میں ہی تھا، میرا ہی قد و قامت، میرے ہی جیسا جسم، میری ہی شکل بالکل میری تصویر بنا دی گئی تھی۔ وہ پُراسرار انداز میں مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ مسکراہٹ کا یہ انداز بھی بالکل میرا ہی تھا۔ وہ میری ہی مانند چل رہا تھا۔ وہ شخص ہمارے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھے سلام کرنے کے لیے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا اور میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔
''تشریف رکھیے۔'' عورت نے اس شخص سے کہا اور وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ سب دلچسپ اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہے

تھے۔ میں بھی مسکرادیا۔

”بہت خوب زبردست۔ مگر میں کچھ سمجھا نہیں۔“ میں نے فراخدلی سے کہا۔

”ان کا تعارف بھی اگر آپ سے شاہ کہہ کر کرایا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ درحقیقت آپ کے اتنے دن قیام کے دوران ہم یہی کارروائی کرتے رہے ہیں۔ ہماری تنظیم تمام پہلوؤں سے مکمل طور پر اطمینان کرنے کے بعد اپنے کام کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ آپ یہاں شمالی یورپ میں ہمارے معزز مہمان ہیں اور آپ کو اطراف کے بہت سے ممالک کی سیر کرائی جائے گی۔ ان سے آپ کو روشناس کرایا جائے گا لیکن درحقیقت وہ آپ نہیں ہوں گے بلکہ یہ ہوں گے۔ آپ کے ہم شکل آپ کی حیثیت رکھنے والے جو شاہ کی حیثیت سے ان تمام ممالک کی سیر کریں گے اور مسٹر شاہ آپ کو ہماری ایک لیبارٹری میں جانا ہوگا۔ جہاں آپ کو خصوصی طور پر تربیت دی جائے گی اور اس کے بعد جب آپ منظرعام پر آئیں گے تو ایک ناقابلِ تسخیر انسان بن چکے ہوں گے۔“

میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ عجیب منصوبہ تھا۔ انتہائی سنسنی خیز اور میری توقع کے بالکل خلاف۔ ایک لمحے کے وقفے میں مَیں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے جواب میں اب مجھے کیا کرنا ہے۔ چند اہم باتیں میرے ذہن سے گزر گئیں۔ اگر میں فوراً ہی ان کے منصوبے سے اتفاق کا اظہار کر دیتا ہوں تو وہ لوگ شبہ کا شکار بھی ہو سکتے ہیں کہ میں ذہنی طور پر اس کے لیے کیسے فوراً تیار ہوگیا۔ اس کے علاوہ میری اپنی شخصیت بھی تھی جو بہرطور کسی کی محکوم نہیں بن سکتی تھی کیونکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا‘ خوبصورت اور پُروقار عورت اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تمام افراد میرے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ شخص جسے میرا اہم شکل بنایا گیا تھا بالکل خاموش بیٹھا ایک دیوار کو گھور رہا تھا۔ عورت جس نے اپنا تعارف جولیا ایکسل کہہ کر کرایا تھا کچھ لمحات کے بعد بولی۔

”آپ کی خاموشی غیر معمولی ہے مسٹر شاہ۔“ میں نے پہلو بدلا اور کسی قدر سرد لہجے میں بولا۔

”کچھ باتوں پر مجھے سخت اعتراض ہے میڈم۔“

”آپ کو اپنی بات کہنے کی مکمل آزادی ہے۔ جو آپ کے ذہن میں آئے بے دھڑک کہہ ڈالیں۔ آپ ہمارے انتہائی معزز مہمان ہیں اور مستقبل میں ہم نے آپ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ ایک اچھا ماحول پیدا کرنے کے لیے اور بہتر تعاون حاصل کرنے کے لیے ہم آپ کے وہ تمام اعتراضات سنیں گے جو آپ کے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کیا تصور پیدا ہوا ہے آپ کے ذہن میں۔“

”آپ کو علم ہے میڈم جولیا ایکسل کہ اپنے وطن میں‘ میں بالکل غیر مطمئن نہیں تھا۔ جو طریقہ کار میں نے اختیار کیا تھا وہ میری توقعات کے مطابق تھا اور میں اپنے منصوبے کے مطابق بڑے پُرسکون طریقے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات میرے ذہن میں موجود تھی کہ میں ترقی یافتہ دنیا سے رابطے قائم کروں اور ان سے اپنے مقاصد میں امداد بھی حاصل کروں لیکن یہ طریقہ کار میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ کوئی مجبوری مجھے یہاں تک لائی ہے تو پہلے میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے میں اپنے کاروباری مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی ایک فرد کو وہ حیثیت نہیں دے سکتا کہ میری تمام مشینری مفلوج ہو جائے۔ پھر آپ نے مجھے طلب کر کے اپنے آپ یہ فیصلہ کیسے کرلیا کہ جو آپ سوچیں گی میں

آپ کے لیے اپنے آپ کو پیش کردوں گا۔'' جولیا کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے عجیب سے تاثر نظر آئے' اس نے اپنے قریب بیٹھے تمام لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر پاٹ دار لہجے میں بولی۔

''آپ کا یہ اعتراض بجا ہے اور یقین جانیں ہم اس کی توقع رکھتے تھے۔ بے شک آپ ایک معزز شخصیت ہیں اور کسی طرح ہمارے محتاج نہیں ہیں۔ درحقیقت ہمارا نکتہ نظر یہ ہے کہ ہم ایشیا کے لیے جو تمام قوت کسی ایک فرد کو بخشنا چاہتے ہیں وہ اس قدر طاقتور ہو کہ ہر وہ قوت جو ہمارے خلاف عمل پیرا ہے اس کے مقابلے میں ناکام رہے۔ خصوصی طور پر ہمارا ٹکراؤ فورویل سے ہے' جو ہماری نوعیت کا ہی ایک ادارہ ہے اور کسی حد تک ہم سے زیادہ طاقتور۔ ہم اس سے مقابلہ کررہے ہیں اور دنیا کے بیشتر ممالک میں اس کے سامنے دیواریں کھڑی کی جارہی ہیں اور ہم اپنے مفادات حاصل کررہے ہیں۔ ہم یہ بالکل دعویٰ نہیں کریں گے کہ ہم نے فورویل کو کوئی نقصان پہنچایا ہے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم نے اس کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے ہیں اور وہ ان شگاف کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ آپ خود سوچئے مسٹر جہانزیب یہ تمام کام کرنے کے لیے ہمیں کیسی طاقتیں درکار ہیں۔ ہم چاہتے تو ایشیا کے ہر ملک میں اپنا ایک نمائندہ چھوڑ سکتے تھے لیکن پھر یہی ہوتا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرجاتا اور اس غلطی کی سزا پورے ادارے کو بھگتنا پڑتی۔ مشن فورویل سے بالکل مختلف انداز میں کام کرکے فورویل کو چکر میں ڈالنا چاہتی ہے۔ سارے ایشیا کے لیے ایک آدمی کا انتخاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آپ کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ آپ ہماری پیشکش نامنظور کردیں' ہم ناراض نہیں ہوں گے۔ آپ کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی اور اس پر بھی اگر آپ تیار نہ ہوئے تو آپ سے پھر صرف یہ درخواست کی جائے گی کہ ہمارا راز اپنے سینے میں رکھیں اور اگر آپ کو ہماری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ہمیں بھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ میرے خیال میں یہ ایک جائز اور دوستانہ پیشکش ہے۔''

''آپ میرے اس اعتراض کو درست سمجھتی ہیں میڈم۔''

''قطعی درست۔ بلکہ میرا ہی نہیں' میرے ساتھیوں کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ آپ کا یہ اعتراض آپ کی سچائی کی دلیل ہے اور اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ آپ جو کچھ کرنے جارہے ہیں خلوص دل سے کرنے جارہے ہیں۔ بس مسئلہ اتنا سا ہے کہ ہم آپ کو قائل کرلیں۔''

فیصلہ ہوچکا تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ سختی کا مظاہرہ کرتے تو مجھے مزید اقدامات کرنا ہوتے لیکن چونکہ انہوں نے اپنا موقف نہایت شرافت سے پیش کیا تھا' جواباً مجھے بھی شرافت کا مظاہرہ کرنا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

دیسی اور مغربی ادب سے انتخاب، کھٹی میٹھی تحریریں مختصر مگر
اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی کہانیاں، باذوق قارئین کیلئے بطور خاص

واپسی

جاوید احمد صدیقی

زندگی نام ہے جذبوں کا' نت نئے خیالوں کا' ہر لمحہ بدلتے رنگوں کا۔ آج کے دور میں بہت ہی کم لوگ ایسے ملیں گے جو یہ کہہ سکیں کہ وہ زندگی سے مطمئن ہیں۔ ہر ایک کے دل میں کوئی نہ کوئی خلش کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتی ہے۔

حقیقت سے قریب ترین' بلکہ حقیقی زندگی کی عکاس تحریر۔

ہم دونوں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے' جیسے بھی گزر رہی تھی بہر حال گزار رہے تھے۔ غریب طبقے سے تعلق ہونے کے باوجود بیوی نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ اچھا ملا اور اگر سادہ ملا دونوں طرح گزارہ کرلیا۔ ہم لوگوں کے لیے فرمائشیں پوری کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں ہوتا' اپنی خواہشات کو پورا کرنا تو دور کی بات ہے' پیٹ کے جہنم کو ہی بھرلیں اور بچوں کے لیے حسب توفیق اللہ کی نعمتوں سے معمولی فائدہ اٹھانا ہی ہوتا ہے۔

اپنی دنیا میں مگن' غربت میں ہی اپنے چار بچوں اور بیوی کی کفالت کررہا تھا اور اچانک نوکری سے جواب مل گیا۔ ہم جیسے طبقوں میں بچت کہاں ہوا کرتی ہے۔ یہ دونوں دم بخود تھے کہ گھر کیسے چلے گا' پھول جیسے بچوں کی ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی' کافی تگ و دو کے بعد بھی اسے نوکری نہ ملی۔ انتہائی کوشش کرنے کے باوجود آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بن پارہا تھا' مکان بھی ان کا کرائے کا تھا۔ ایک دن اس کی بیوی بولی کہ اگر اجازت دو تو میں فیکٹری میں نوکری کرلوں' وہ کڑھائی سلائی میں خاصی ماہر تھی۔ اس کی اجازت کے بعد بیوی گارمنٹس فیکٹری میں ذرا سی جدوجہد کے بعد نوکری پر لگ گئی' حالات بھی ان کے ایسے تھے کہ اسے اجازت دینی ہی پڑی۔

کچھ عرصہ تو خاوند ہی بیوی کو فیکٹری چھوڑ آتا تھا اور واپسی بھی لے آتا تھا' اب قدرتی بات کہ وہ سوچتا کہ وہ کب تک بیوی کی کمائی پر بیٹھا رہوں گا اور بیوی پر دوہری ذمہ داری ڈالنی بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن مجبوری تھی کہ پیٹ کا جہنم بھی تو ساتھ لگا تھا پھر اپنے لیے تو بھوکے بھی رہ لیتے مگر ان جگر گوشوں کی بھوک اور بلکتی ہوئی زبانیں تو انتہائی بے چین کردیتیں۔ ماں باپ تو خون تک دے دیتے ہیں پھر ان ننھی کلیوں نے فرشتوں جیسے روپ دھار رکھے تھے۔ بیوی کا فیکٹری میں کام بھی' مجھے اس پر اعتماد تھا ورنہ فیکٹری کا ماحول بھی اسے پسند نہ تھا۔

اسے اپنی بیوی پر پورا اعتماد تھا' زندگی کی گاڑی چل رہی تھی کچھ عرصہ کے بعد جب کہ یہ سلسلہ چلا ہی تھا اللہ نے اسے بھی نوکری پر لگادیا۔ یہ اسی پروردگار کا ہی حکم تھا کہ روزی کے دروازے خاوند پر بھی کھول دیئے جائیں یہ کہ خاوند کی نیت ہرگز نہ تھی بیوی کو نوکری کرانے کی اور اللہ کریم نیت ہی تو دیکھتا ہے اور اسی تیزی اور رفتار سے اپنا فضل و کرم اور آسانیاں بندے پر مسلط کرتا چلا جاتا ہے۔

اب گھر میں دونوں کی آمدنی آنا شروع ہوئی تو گھر کے حالات بھی اچھے ہونے شروع ہوگئے۔ اسی نے ایک دن بیوی سے کہا۔

''تمہیں نوکری کی اب ضرورت نہیں' میں اوورٹائم لگا کر یہ کمی پوری کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ دگنی محنت کی کیا ضرورت ہے' میں فیکٹری کے کام سے مطمئن ہوں اور یہ بھی کہ بچوں کے اسکول جانے کے بعد میں تنہائی کا شکار ہوجایا کروں گی۔'' خاوید نے یہ بھی کہہ دیا کہ جب جی چاہے نوکری چھوڑ دینا مگر گھر میں ان کے پیسہ آنا شروع ہوا تو خوشحالی نے بھی ڈیرے ڈال لیے' بچوں کو سیر و تفریح کے لیے بھی یہ لوگ لے جانے لگے۔

اسی طرح کچھ عرصہ گزر گیا' اس کی بیوی چھٹی کے وقت کمپنی کی گاڑی میں گھر آیا کرتی تھی' ایک دن بس سے گھر آئی تو خاوند کے پوچھنے پر بولی کہ دیر ہوگئی تھی کمپنی کی گاڑی بھی نکل گئی۔

ہر دوسرے تیسرے روز یہی ہونے لگا' ایک دن بولی کہ کمپنی نے کرائے کا معاوضہ تنخواہ میں شامل کرنے کی تجویز مانگی ہے میں ذرا عادت بنا رہی ہوں تاکہ بعد میں وقت نہ ہو خیر یہ وقت گزرتا رہا۔

ادھر اس کی بیوی نگہت فیکٹری میں جس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھی وہاں کے ایک سپروائزر منیجر ٹائپ غیر محسوس طور پر نگہت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک دن چائے کے وقفے پر اس نے نگہت کو چائے پر مدعو کرلیا' نگہت نے سوچا چلو چائے ہی تو پینی ہے یہ ظفر کے ساتھ پی لیتے ہیں۔ چند روز میں نگہت نے محسوس کیا کہ ظفر تو خاصی دلچسپی لے رہا ہے' ایک دن چائے پر کہنے لگا کہ کام کے بعد چھٹی کے وقت مجھے باہر ملنا۔ چھٹی کے بعد نگہت کار پارک میں پہنچی تو ظفر اس کا منتظر تھا' دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک پارک میں جا بیٹھے۔ ظفر نے ہمت کی اور بولا۔

''دیکھو تم میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے مگر زندگی ضائع کررہی ہو۔ زندگی بہت چھوٹی ہے اسے بھرپور طریقے سے گزارنا چاہیے۔'' نگہت کو پوری بات سمجھ آرہی تھی کہ ظفر شادی شدہ ہوکر بھی ایسی باتیں کررہا ہے' بات آئی گئی ہوگئی۔

نگہت کے خاوند راشد نے اسے موبائل بھی لے دیا لیکن کچھ عرصہ سے محسوس کررہا تھا کہ نگہت میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی ہے۔ راشد تو اس کو کم عمری میں ہی بیاہ لایا تھا' شکی مزاج تھا نہیں' یہ معمولی تبدیلی کو بھی نظر انداز کرگیا۔ آخر چار بچوں کی ماں تھی اور راشد سے محبت کرنے والی بیوی۔ راشد پانچ برس بڑا تھا اس سے پھر شادی کے بعد کراچی آگئے اور اب اپنی نوکری اور بچوں کے ہونے سے مطمئن زندگی گزار رہے تھے' ہم دونوں اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔

جس جگہ راشد نوکری کرتا تھا وہ ایک بینک تھا اور راشد بینک کا اندرونی کام سنبھالتا تھا۔ بینک میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی ملازمت کرتی تھیں جس سیکشن میں راشد تھا وہاں عورتیں بھی کام کرتی تھیں مگر تعداد کم تھی۔ دو سال گزر چکے تھے' راشد بھی ایک خوبرو مرد تھا' اٹھنا بیٹھنا' بول چال اور دوسروں سے ڈیلنگ بھی بڑی نفاست سے کرتا تھا۔ بڑے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ والا تھا اور سب سے بڑی بات کہ اب اس کی محنت' لگن اور کام سے انتہائی دلچسپی کی وجہ سے پروموشن بھی ہونے والا تھا۔

کام روٹین کا تھا ایک دن چائے پیتے ہوئے اس کے ساتھ کی ساتھی ناز نے اس کے حالات پوچھ لیے' ناز کا خاوند بھی کسی فیکٹری میں نوکری کرتا تھا۔ راشد کو محسوس ہوا کہ ناز کچھ دنوں سے غائب دماغ ہوتی جارہی ہے اور چہرے سے پریشانی ٹپکتی ہے۔ راشد نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

''ناز صاحب! کیا پریشانی ہے؟'' ناز تو جیسے بھری بیٹھی تھی خاوند کے گلے شکوے...... کہنے لگی۔

''ہماری شادی کو تقریباً سات سال گزر چکے ہیں' دو بچے بھی ہیں ہم دونوں مطمئن زندگی گزار رہے تھے ویسے بھی شوہر صاحب دل جوئی میں انتہائی کنجوس ہیں اور بے پروا بھی۔ اکثر طعنے بھی دینے لگے ہیں کہ مزاج بھی ٹھیک رکھا کرو' خوش اخلاقی کیا بینک میں دکھانا منع ہے اور آج کل مجھے چڑ چڑ کرتے رہنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ راشد صاحب آخر کب تک یہ سلسلہ چلے گا' چند روز سے مجھے ایسے محسوس ہورہا ہے جیسے ان کی مجھ میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ گھر بھی اکثر لیٹ آتے ہیں۔ راشد صاحب آپ جیسا انسان کم ہی دیکھنے میں آتا ہے' کاش یہ بھی سنبھل جائیں۔''

راشد گھر آتا تو نگہت اکثر دیر سے آتی اور بہت حد تک بجھی بجھی سی' ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

''تم کیا چاہتی ہو؟ دیر سے آنا...... میں یہ بھی تحقیق کر بیٹھا ہوں کہ تم اوور ٹائم نہیں لگاتیں بلکہ کسی صاحب کی گاڑی میں واپسی آتی ہو یقیناً تم دونوں کہیں بیٹھ جاتے ہو گے اور ابھی چند دن پہلے فون پر رابطہ ہوا تو پیچھے سے خاصے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں یہ ریسٹورنٹ تھا۔ پھر ایک دفعہ

فون پر ہی بات کر رہی تھیں اور پیچھے سے جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں' پارک میں گئی تھیں۔ دیکھو نگہت! اب جبکہ ہمارے حالات سدھرے چار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں پھر بھی اگر تم علیحدہ ہونا چاہتی ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔ بچوں کا کیا کرو گی؟ ان معصوموں کی زندگی سے تو نہ کھیلو۔" نگہت خاموش ہی رہی۔

ایک دن ظفر سے چائے پر بات ہو رہی تھی اس نے پوچھ ہی لیا کہ آخر ظفر آپ کے ارادے کیا ہیں؟ ظفر نے اشارتاً اپنی بیوی کی کئی برائیاں کر ڈالیں اور نگہت کو اشارتاً اپنانے کا عندیہ بھی دے دیا' نگہت چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

ادھر راشد کا شک بھی بڑھ رہا تھا آخر کار ایک دن بینک سے اجازت لے کر سیدھا نگہت کی فیکٹری کے قریب جا رکا۔ فیکٹری بند ہونے کے بیس پچیس منٹ کے بعد یہ دونوں اکٹھے نکلے اور ظفر کی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں جا براجمان ہوئے۔ راشد ایک طرف سائیڈ میں کار میں بیٹھا ان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد دونوں نکلے' ظفر نے پہلے نگہت کو گھر کے قریب اتارا اور پھر اپنے گھر روانہ ہو گیا' اس کا گھر کا معلوم پڑا تو واپسی کر لی گھر آ کر بھی نگہت سے کوئی شبہ ظاہر نہ کیا۔

چند دن کے بعد ارشد نے کسی بہانہ سے ناز کو بھی بینک سے گھر چھوڑنے کی فرمائش کر ڈالی۔ ناز کے کہنے پر ارشد نے اس کے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا اور اب حیران ہونے کی راشد کی باری تھی کہ یہ تو وہی راستے ہیں جن پر ظفر جا رہا تھا اور حیرانگی تو انتہا کو پہنچ گئی جب ناز نے گھر سے تھوڑی دور اتارنے کا کہا اور ہاتھ سے مکان کی نشان دہی بھی کر دی۔ راشد تو ویسے ہی ان تمام اتفاقات پر بے صبر و حرکت بیٹھا تھا' واپسی پر سوچتا ہوا گھر آ گیا۔

اگلے دن راشد صبح صبح ہی ناز کے گھر سے ذرا دور آ کر رک گیا' پہلے ناز پھر ظفر نکلے اور روانہ ہو گئے۔ راشد نے بھی پیچھا کرتے ہوئے دیکھا کہ ناز کو بینک اتارا اور پھر آگے گاڑی بڑھائی اور راشد کو کل کی طرح ایک اور جھٹکا لگا کہ ظفر تو وہیں اترا جہاں فیکٹری میں نگہت کام کرتی ہے اور پھر راشد کے سامنے سے تمام پردے ہٹتے چلے گئے اور بینک آتے آتے اور یہاں کام کرتے کرتے ناز کو جانچتے جانچتے پورے دن میں خاصی پلاننگ کرتا چلا گیا اور کچھ دن سے راشد بینک کے بعد ریسٹورنٹ اور پارک بھی دیکھ لیتا تھا جہاں دونوں کچھ وقت اکٹھے گزارتے تھے۔ راشد پہلے بھی نگہت کو سمجھا چکا تھا کہ یہ بندہ وقت گزاری کے لیے کھیل کھیل رہا تھا۔ اس دن راشد گھر آیا تو نگہت پہلے سے موجود تھی' بولا۔

"نگہت کیا بات ہے آج جلدی آ گئی ہو' ویسے اب تمہارا اس گھر میں دل نہیں لگتا نا۔ ارے بچوں کا ہی خیال کر لو' وہ تو ٹھیک ہے کہ معاشی لحاظ سے وہ بندہ ہم سے خاصا مضبوط ہے مگر ایک بات یاد رکھنا خدانخواستہ تم نے اس کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا تو ہرگز موجودہ بیوی کو نہ چھوڑے گا اور تم کرائے کا ٹٹو بن کر رہ جاؤ گی۔ خیر اتنی آسانی سے تو میں بھی تمہیں تو نہیں چھوڑنے والا۔ تم صرف ڈگمگا گئی ہو' اس سے ذرا کھل کر بات کر دیکھنا بے تحاشہ ٹال مٹول کرے گا اور اپنانے کے بعد تو اور بھی بے حس ہو جائے گا۔" نگہت نے ذرا شاکی انداز سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے بچوں کے کام میں مصروف ہو گئی۔

چند روز ہی گزرے تھے کہ نگہت نے فیکٹری سے واپسی پر کہا کہ ویک اینڈ پر خاصی دیر ہو جائے گی اور بڑی مشکل سے اس نے ارشد کو جگہ (ریسٹورنٹ اوپن) بھی بتا دی۔ ٹائم وہی مغرب کے وقت کا تھا۔ ارشد نے بڑی عقل مندی سے سب کچھ اگلوا لیا اور نگہت تو سمجھتی رہی ارشد صرف معلومات حاصل کر رہا ہے وگرنہ میں تو جلدی ہی آ جاؤں گی اور پھر ارشد آفس آیا تو کھانے کے وقفہ پر ناز سے بولا۔

"چلو بھئی اس ہفتہ کو فلاں اوپن ریسٹورنٹ میں ڈنر کریں گے' امید ہے کہ تم نہ نہیں کرو گی۔" کھانے کے دوران ہی ناز نے مثبت جواب دے دیا۔ ارشد تو دل ہی دل میں تمام منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کی پلاننگ کرنے لگا۔

اس روز تو نگہت بھی بھرپور انداز میں تیار ہو کر فیکٹری چلی گئی اور پھر ارشد بھی بینک پہنچا' ناز آ چکی تھی۔ تمام دن کام

میں گزرا اتفاق کی بات کہ کچھ دیر ہوگئی اور ارشد نے ناز سے کہا۔

''ہم تو بھئی سیدھے ریسٹورنٹ یہاں سے چلے جائیں گے۔''

کام میں ان کو معلوم بھی ہوا کہ شام ہوگئی اور بعد شام دونوں بینک سے نکلے اور ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑے۔ ارشد نے جان بوجھ کر تھوڑی دیر کردی تھی' سورج بھی اپنی بادشاہی کو عروج پر لے جانے کے بعد اب آرام کی خاطر غروب ہو چلا تھا۔ سوچنے لگا کیا سورج واقعی آرام کرنے چلا جاتا ہے' خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو مسلسل اور بغیر وقفے کے اپنے اپنے کام پر اس طرح مقرر کردیا ہے کہ قیامت تک ان کی کارکردگی میں فرق نہ آئے گا۔ انسان کو ان سے سیکھنا ہے کہ ان تھک اور مسلسل کام کام اور محنت کا کیا مفہوم بنتا ہے۔ ارشد یکدم ہوش میں آیا اور پھر آدھ گھنٹے کے بعد مطلوبہ جگہ پر گاڑی کو پارک کردیا۔

ادھر ظفر اور نگہت دونوں آچکے تھے اور باہر لابی میں بالکل کونے والی جگہ ریزرو کروائی تھی۔ پرسکون اور شہر سے دور...... ناز اور ارشد چلتے ہوئے کاؤنٹر پر آ کر نگہت کا اور ناز نے ظفر کا نام لے کر ریزرویشن کا پوچھا' باہر لان والی جگہ معلوم ہونے کے بعد دونوں ادھر ہی چل پڑے اور ایک سائیڈ سے ہوتے ہوئے اچانک ان دونوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ناز تو خیر ہلکی سی حیرت میں ڈوبی چیخ نکال کر سیدھے ہی لان کی گھاس پر بیٹھتی چلی گئی اور ادھر نگہت کا رنگ بھی اڑ گیا اور ظفر بھی حیرت سے گنگ بیٹھا تھا کہ ''ناز کسی کے ساتھ آئی ہے'' خیر تھوڑی دیر کے بعد جب چاروں سنبھلے تو میز کے گرد ایسے چپ ہو کر بیٹھے تھے جیسے بُت ہوں اور بولنا بھی ختم کردیا گیا ہو۔ آخر کار ارشد نے ابتداء کی۔

''آپ سب لوگ پردہ اٹھ جانے کے بعد حقیقت تو جان چکے ہوں گے مگر میں ذرا وضاحت کردوں۔ نگہت کا معاملہ اتنا بڑھ جائے گا یہ تو میں سوچ بھی نہ سکتا تھا' ہاں ناز کے لیے یہ واقعی بے حد تکلیف دہ ہے کہ ظفر اس طرح کی بے وفائی کرسکتا ہے۔ ناز صاحبہ کا جھکاؤ بھی میری طرف تھا مگر ہم دونوں کبھی کبھار چائے وغیرہ اکٹھے پی لیتے تھے اور بس...... مگر ظفر صاحب تو آگے کی کئی منزلیں طے کرنے کو تلے ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت آج کی ملاقات میں نگہت کو مل بھی چکا ہے۔'' نگہت یکدم اٹھی اور ناز کو اٹھا کر گلے لگالیا اور بے حد معافی مانگنے لگی۔

ادھر ظفر بھی تمام حالات کو سمجھ چکا تھا وہ بھی اٹھ کر ارشد کے گلے لگ گیا اور کہنے لگا۔

''ارشد بھائی مجھے معاف کریں' اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ہم صرف آپ کے دوست ہیں اور نگہت میری بھابی ہے اور اسی طرح میں ناز کو بھی معاف کرتا ہوں اور اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی کا خواستگار ہوں۔'' اب ناز نے بھی ظفر سے اپنے کیے کی معافی مانگی اور کہا۔

''اب ارشد میرے لیے بھائیوں جیسا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔'' نگہت بھی روہانسی ہو کر سب کی پروا کیے بغیر ارشد سے گلے لگ گئی اور مجھے معاف کردو مجھے معاف کردو کی گردان کرنے لگی اور بولی۔

''ظفر بھی اب میرے لیے بھائی کا درجہ رکھتا ہے اور ناز میری بھابی' بہنوں کی طرح ہے۔''

چاروں کا غبار نکل گیا تو ارشد اور نگہت ایک سائیڈ پر اور ظفر و ناز دوسری سائیڈ پر بیٹھے تھے' ارشد بولا۔

''ہم سب کے لیے یہ دن کئی سالوں کے بعد حقیقی خوشی لے کر آیا ہے اور ہم ان شاء اللہ بچوں سمیت ہر دوسرا ویک اینڈ یہیں منایا کریں گے اور ہاں بھئی جب سب نے ہاں کہہ دی ہے تو ویٹر کو بلالیں تاکہ بھوک بھی تو ختم کرنی ہے کیوں کہ کئی ماہ کے بعد خوشی ملی ہے۔'' اور چاروں کا قہقہہ اس دکھ اور دل دکھانے والے واقعات کو بہا کر لے گیا۔ اتنے میں ویٹر بھی مینو لے کر حاضر ہوگیا اور چاروں مینو کو دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔

ٹوٹا ہوا تارا

ساحل ابڑو

آنکھوں میں امید کے جگنو بسائے لوگوں کا فسانہ

میری جلتی ہوئی بوجھل آنکھوں سے پھر ستارے ٹوٹ رہے ہیں' خدایا ستاروں کا یہ چکر کب ختم ہوگیا۔ آج ان کو سہی ہوئی روشنی میں ماضی کا ہر لمحہ میرے سامنے وحشیانہ رقص کر رہا ہے۔

میں نے بنگال کی قسمت پر چھائے ہوئے منحوس ستاروں کو نوچ پھینکنا چاہا۔ خلیج بنگال سے اٹھنے والے طوفان سے کہیں بھیانک طوفان میرے دل میں اٹھا' مغربی حصے کے لوگوں سے رشک اور حسد بڑھتا ہی رہا۔ میرے ہندو پروفیسروں اور لیڈروں نے میرے رگ وپے میں ایسا زہر بھر دیا کہ اس کی کڑواہٹ آج بھی اپنے حلق میں محسوس کر رہا ہوں لیکن آج ایسا کیوں ہے۔ ماضی میں تو میں اسے امرت سمجھ کر نوش کرتا رہا ہوں' اب یہ کیا ہوا شاید وجدان کے دھارے میں جو جمود اور تعطل پیدا ہو چکا تھا۔ آج پھر وہی چشمہ آب حیات جاری و ساری ہونے کے لیے بے قرار ہے' اب میں اسے کرمِ خداوندی سمجھوں جس نے مجھے ٹھوکر لگا کر راہ راست پر ڈال دیا ہے۔

''خدایا!'' پچھتاوے اب میرے ذہن سے چمٹے ہوئے ہیں' ماضی کی تلافی مجھ سے کیونکر ہو سکے گی۔

❁ .... ❁ .... ❁

میں نے اپنا اور سرزمین بنگال کا مستقبل سنوارنا چاہا لیکن یہ کیا...... میں تو اس کا ماضی اور حال بھی مسخ کر بیٹھا' میں اب تک سالوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں۔ سراب کا کھوج لگا تا رہا ہوں' کاش' اب بھی میری خواہشات اور آرزوئیں اتنی بے ضرر ہوتیں' اب میں کانچ کے ٹکڑوں سے خوش تو نہیں ہوتا۔ اب تو میں اسلحے کو آتش بازی سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے خون کی ہولی کھیلی' کیوں کس لیے...... میں نے اپنے گھر کو آگ لگا دی' مجھے اپنے ہم وطنوں پر رشک ہونے لگا ہے لیکن اس کا یہ مطلب یہ تو نہیں اگر بیوی یا بیٹی گھر سے فرار ہو تو طوائف بن جاتی ہے۔ میں بھی اسی طرح ہم وطنوں سے خفا ہو کر غدار بن گیا۔ میں جب وطن کو لوٹا' میں نے اپنی ماں کی بے حرمتی کی' ناموس برباد کر دی صرف

اس لیے کہ غیر ملکی شاطروں نے مجھے کانچ کے بے قیمت ٹکڑے کی طرح استعمال کیا۔ میں ان رنگوں سے اپنے آپ کو بہلاتا رہا اور کرچیاں میرے ساتھیوں کے دلوں میں چبھتی رہیں، ان کرچیوں نے میرے گھر کی زمین کو پُر خار بنادیا اس سے میری روح تک زخمی ہوگئی۔

۞......۞......۞

میرے معبود...... میرے بابا سچ کہتے تھے، ان کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے پر میں انہیں کیسے دیکھتا۔ اس وقت تو بنگال کا جادو میرے سر چڑھ کر بولتا تھا، بابا مجھے یوں دیکھتے...... یوں دیکھتے تھے جیسے مجھے باؤلے کتے نے کاٹ لیا ہو اور اس مہلک دیوانے پن سے صرف موت ہی مجھے نجات دلا سکتی ہے، زندگی کا کوئی ساتھی میرے پاس نہیں پھٹکے گا۔

"لیکن...... نہیں نہیں...... مجھے موت نہیں چاہیے، میں اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنوں گا۔ میں نے ایک عظیم تحریک چلائی تھی، میں عزمِ صمیم لے کر اٹھا تھا۔ میرا ہر قدم آگے بڑھنا چاہیے پر میں قدم کیسے آگے بڑھاؤں یہ مجھے کس چیز سے ٹھوکر لگی۔ ارے...... ارے میرے شہر کی گلیاں تو لاشوں سے اٹی پڑی ہیں۔ ان میں فرید ہے، عبد الہادی ہے، حسین عبدل...... سب ہیں میرے بھائی، میرے

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ "گفتگو" کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 'تاریخ تک مل جانے چاہیے۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

7 'فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

دست و بازو...... ان میں تو کنیز، شبنم اور صغریٰ کی لاشیں ہیں جو میری بہنیں تھیں ہم جولیاں تھیں، ان میں صفور رہی ہے جو میری طوفانی طبع کے لیے ٹھنڈک بن جاتی تھی۔ پھولوں پر برستی شبنم کی طرح، میں نے انہیں مرنے دیا...... کیوں...... آخر کیوں...... ہاں میرا ماضی بتاتا ہے کہ میں تحریک چلا رہا تھا۔ میں اپنی دانست میں ایک نوبل کیس کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور اسی کھینچا تانی میں میرا پیشہ رشتہ اپنے ساتھیوں سے، خود اپنے آپ سے کٹ گیا پھر دشمن میرے گھر میں گھس آیا، اس نے میرے ہمدرد کا روپ دھارا تھا پھر میرے گھر کی چھت میرے سر پر گر پڑی۔ میں پناہ لینے کہاں جاؤں، میں ان ہمسایوں پر تو بھروسہ نہیں کرسکتا، ان کے گھر سے تو بے بسوں کی آہٹیں اور چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔

❁......❁......❁
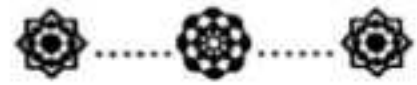
''خدایا! کیا ستاروں کا چکر ابھی پورا نہیں ہوا، میں پھر ماضی کو یاد کر کے آنسو بہا رہا ہوں۔ میں تو بہت بہادر تھا، میں تو صفورا، صغریٰ، شبنم، فرید اور ہادی کے لیے بھی نہیں رویا تھا۔ اب مجھے ندامت کے جھٹکے کیوں لگنے لگے، دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو ستاروں کی بوندیں کیوں مٹانے لگے۔ میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولنے لگا ہوں، میرے پاس حسرتوں کی ان گنت کہانیاں ہیں لیکن کیسے سناؤں۔ میں تو ان تین سو یتیم بچوں سے بھی زیادہ بے کسی کی حالت میں ہوں جو دشمن کی بمباری سے جاں بحق ہوئے۔

اب مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا ہے، اب مجھے انسانیت کے سامنے ''بنگال'' کی مٹی حقیر معلوم ہو رہی ہے۔ میں مسلمان ہوں، ساری دنیا کو میری قوت، جوہر کا احساس تھا۔ وہ ہم سے ہراساں تھے کہ مسلمان متحیر ہو رہے ہیں، ہمارے مقدر پر سیاہی چھا جائے گی لیکن وائے نادانی...... میں نے یہ سیاہی اپنے منہ پر مل لی ہے۔ میرا شہر غیروں نے گھیر لیا ہے، سقوط کے بعد میرے بھائیوں پر کیا کیا قیامتیں نہیں توڑی جا رہی ہیں لیکن اب میں ان پر افسوس کیوں کرتا ہوں وہ تو شہید ہو رہے ہیں۔ کل ظلم کی اسی چھری سے مجھے بھی ذبح کیا جائے گا۔ ہاں میں غدار ہوں...... میں نے ماں سے غداری کی ہے، ماں کی محبت تو غیر مشروط ہوتی ہے۔ میں طوفان میں بہہ کر ماں کا تقدس بھول بیٹھا تھا اب میری غداری کی جو بھی سزا ملے بجا...... پر نور الہدیٰ تم تو اس جدوجہد میں جان دینا چاہتے تھے۔ اب اجل سے آنکھیں کیوں چرا رہے ہو، اگر تم بچ رہے تو لادینی حکومت میں زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ تم نور نہ سہی ٹام،

جیل یا کامریڈ بن کر جی لینا۔ فیصلے اتنے جلدی نہ بولو' نہیں...... میں نورالہدیٰ ہوں اور نور تاریکیوں میں نہیں ڈوب سکتا۔ میں زندہ رہوں گا' اس نور کی حفاظت کروں گا جواب تک میرے دل میں امانت بن کر رہا ہے۔ میں اس لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں کہ پاکستانی فوج کی گولیوں نے میرے سینے کو چھیدنا تقدس کے منافی جانا۔ کسی بھارتی بم نے بھی شاید غدار سمجھ کر میرے پُرزے نہیں اڑائے۔ موت کی خواہش پھر سر ابھارنے لگی ہے' میری پلکوں سے ستارے جھڑنے لگے ہیں۔ میری ڈائری کے ورق بھیگ رہے ہیں' اب میں جی نہیں سکتا' مر بھی نہیں سکتا لیکن موت کو میرا استقبال کرنا پڑے گا۔

دنیا دیکھ لے گی' میں کیا کچھ کر جاؤں گا' میں ایک مومن کی موت مروں گا' جو دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے اور فنا بھی حق کی راہ میں ہونا چاہتا ہے۔

ایک دل ہلانے والا دھماکا ہوا' جیسے آگ' بھارتی اسلحہ خانے میں نہیں لگی ہر بنگالی کے دل سے شعلے بلند ہوئے جب زلزلے تھمے تو جیلانی کے ہاتھ میں نورالہدیٰ کی ڈائری اس کے دھڑکتے دل کی طرح کانپ رہی تھی پھر ایک ساتھ کئی آتش فشاں پھٹ پڑے' مشرقی پاکستان میں ہزاروں جیالے روشنی بکھیر گئے اور دوشیزہ بنگال کا حسن شاداب تر ہو گیا۔

❁......❁......❁

میں نے پوربی پاکستان سے آنے والے سپاہی سے اپنے وطن کی کہانی سن رہا تھا لیکن یہ کیا برسوں گزرنے کے بعد وہ کچھ نہیں بولتا۔ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہے' زبان گنگ ہے' موتی پھسل رہے ہیں اور میں دھندلائی نظروں سے ان آبگینوں میں جھانک رہا ہوں۔

بہادروں کی کہانی' باغیوں کی تلافی لیکن نہیں میں نورالہدیٰ کو باغی نہیں کہوں گا۔ وہ اب اس دنیا میں جو نہیں رہا ہے مگر وہ ایک ٹوٹا ہوا تارا تھا اور ایسے ٹوٹے ہوئے تارے اپنی پوری شدومد سے ٹکرائے جب ستارے ٹکرائیں تو قیامت ہی بپا ہوتی ہے۔ ایسی قیامت ہمارے دشمن پر ٹوٹی تھی مگر میرے لیے تو یہ تارے روشنی کی ایسی لکیر چھوڑ گئے جو ماہ کامل سے روشن تر ہے۔

❁

روبرو

نسیم سکینہ صدف

تنہائی کے مارے ایک شخص کا فسانہ' وقت نے اسے اپنی سوچوں کا اسیر بنا دیا تھا۔ اسے ہر آہٹ ہوا کی سرسراہٹ' آتی جاتی سانسیں تک اپنا دشمن محسوس ہوتی تھیں۔
ایک نفسیاتی کہانی روح کے اندر ابھرتے خیالات کا فسانہ۔

اپنے پہلے قتل کی ایک ایک بات مجھے یاد تھی کس طرح میں نے گردن کاٹی اور پھر کس طرح وہ کانپ اٹھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ سامنے والے کی گردن ڈھلک گئی تھی' آنکھوں کی پتلیاں پھر گئی ہیں۔ سانس میں نشیب ہے نافراز اور تمام حسیات کے تار تو اس طرح ٹوٹ گئے ہیں جیسے یکلخت شیشہ گرے اور چور چور ہو جائے اور پھر اپنی شکل میں کبھی نہ آئے۔

ایک ثانیہ میں یہ سب کچھ ہو گیا' ادھ کھلے منہ سے میرے پارٹنر کی زبان نکلی پڑ رہی تھی۔ اگر مرتے مرتے اس کے اندر تھوڑی سی بھی بولنے کی طاقت ہوتی تو وہ چیخ چیخ کر گندی گالیاں ضرور دیتا اور گالی کا ڈنگ کچھ اس طرح میرے اندر پیوست ہوتا کہ کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا لیکن شکر ہے ایسا نہیں ہوا' کافی کا گھونٹ لیتے ہی ختم ہو گیا۔

اتنی دوڑ دھوپ کے بعد اتنا تیز زہر ملا تھا' مرتے مرتے بھی وہ میری نظر میں دوست ہی بنا رہا۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے بہت سکون ملا پھر میرے خیال نے جست لگائی اور میں زندگی کی رنگین تصویر دیکھنے میں گم ہو گیا۔ تصویر کا یہ رخ مجھے لذتوں سے ہم کنار کرنے لگا۔ بزنس کا سارا پروفٹ اب میرے پاس آئے گا پارٹنر شپ ختم ہو گئی۔ پارٹنر موت کی نیند سو گیا لیکن ...... لیکن روپیہ دھیرے دھیرے میرے پاس بھی بہت ہو جاتا۔ آدھا پرافٹ بھی کم تو نہ تھا' خاموشی کی تہہ میں میرا مجرمانہ احساس ایک دم میری طرف جھپٹا' اس سے بچتے ہوئے میں زیر لب بڑبڑایا۔

''انتظار...... انتظار کے معنی ہیں وقت اور وقت ہے کہاں؟ کسی پل بھی زندگی ختم ہو جاتی ہے' سوتے میں یا جاگتے میں' چلتے میں یا بیٹھا رہنے میں۔ دھماکے' میزائل' ایٹمی تجربے' دنگے فساد' جلے ہوئے مکانات' جھلسے ہوئے گلی کوچے' کٹی پھٹی لاشیں اور پھر سموم ہوائیں' فضا بھی لا اعتبار ہو گئی ہے۔

اب نرم مٹی پر کھلتے ہوئے گلاب ایک دم سیاہ ہو جاتے ہیں اور پھر میں اکیلا تو نہیں۔ چاروں

سمت ہی ایسا ہو رہا ہے' انسان ایک دوسرے کو تہہ تیغ کرنے میں مصروف ہے' بھری پڑی سڑکوں پر خوب صورت چوراہوں پر گھروں کی دہلیز پر' سیاست کی کرسیوں پر' بزنس کی منڈیوں میں' ہر طرف یہ کھیل جاری ہے اور جو لوگ قتل نہیں کر پاتے وہ اپنے خیالوں ہی میں صبح وشام کتنوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ بغیر تھکے اور بغیر کسی آواز کے پھر میں اکیلا کیسے ہوا؟ یہ سوچتے ہی اطمینان کی ایک لہر میرے اندر دوڑنے لگی۔ میں نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی مسرت محسوس کی اب میرے پارٹنر میں اتنی بھی سکت نہیں ہے کہ وہ کوٹ کا بٹن جو کاج میں اٹک گیا ہے اسے کھول لے یا بند کر لے شاید وہ اسے کھولنا چاہتا ہو یا پھر بند کرنا چاہتا ہو۔ لیکن اب وہ اپنی مرضی کا مالک نہیں رہا' دوسروں کے کندھوں کا محتاج' اپنی آخر آرام گاہ تک جانے کے لیے میں زیر لب مسکراتا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بدبدانے لگا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور سب کام بخیر و بخوبی ہو گئے نہ گواہ نہ شہادت۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں کوئی نہ تھا۔ سکون اور طمانیت کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لینے لگا۔ خوشی کے دائرے میں چکر لگاتے ہوئے اچانک میرا دل زوروں سے دھڑکا کا میری دھڑکن نے میری خوشی پہ اس زور کا جھپٹا مارا کہ ایک بار بھی میرا سارا وجود جھنجنا اٹھا۔ میں نے سوچا کہیں کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑی ہو۔

خوف کا حصار چاروں طرف سے مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے بڑھا ہو سکتا ہے۔ کہیں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا ہو' کسی بھی نگاہ نے۔ آج جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا تو سیڑھیاں چڑھتے اور دروازہ کھولتے ہوئے کسی نے نہ دیکھ لیا ہو' جیسے ہی یہ خیال آیا حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔

میں اٹھا اور کمرے کا طواف کرنے لگا' فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا لیکن حلق کے کانٹوں میں کمی نہ آئی اپنے اندر سے اٹھنے والے مدوجزر سے بے چین ہو کر پھر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ ایک ایک کونا پر میری نگاہ پڑھنے لگی' آنکھیں اُبلنے لگیں لیکن میرے کمرے میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا یا پھر میرے پارٹنر کی سرد لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ اس کے خیال آتے ہی ایک بار پھر طمانیت کی لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ کہیں نے دریز میں سے کسی نے نہ دیکھ لیا ہو' اس سوچ نے چند لمحوں بعد پھر بے چین کر دیا۔

خوف زدہ آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں'

اوپر نیچے گردش کرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا میں کھڑکی تک گیا ایک ذرا کھول کر اس میں سے جھانکا خاموش رات دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک اونگھ رہی تھی، نہ موٹر گاڑیاں نہ لوگوں کا ہجوم، کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سڑکیں صدیوں سے یونہی ویران پڑی ہیں جیسے ان پر کوئی چلتا ہی نہ ہو، کوئی کسی کے تعاقب میں نظر نہیں آ رہا تھا اور پھر بڑے شہروں میں کون کسے پوچھتا ہے، اپنے آپ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

خواہشات کے چکر نے میرے اوسان خطا کر دیئے، اسی گلی سے کتوں کے لڑنے کی آواز آئی، میرے کان کھڑے ہو گئے لیکن وہ تو آپس میں لڑ رہے تھے بالکل انسانوں کی طرح، یوٹیلیٹی اسٹور پر، عمارتیں سکوت کی چادر میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھڑکیوں کے پٹ ادھ کھلے تھے اور زیرو پاور کے بلب جلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لوگ اپنے آپ سے راہ فرار اختیار کر کے نیند میں نہ جانے کن جہانوں کے سفر میں بھٹک رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا کسی کو کیا پڑی ہے کہ میرے دروازے پر گرائے لیکن رات کہیں خوابوں کے چکر میں ڈھلتی ہے تو کہیں خواب نہ دیکھنے کی ضد میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹتی ہے اگر کوئی سویا ہی نہ ہو جاگ رہا ہو یا سو کر بھی بیدار ہو۔ کچھ لوگ سو سکتے ہیں نہ جاگ سکتے ہیں۔ خوشی اور غم سے بے تعلق ہو کے اندھیرے اُجالے میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے شاید کوئی ایسا شخص کسی کے دیکھے جانے کے خوف سے، میں پھر سے کانپ اٹھا۔ کپکپی آ گئی، مجھے اندر لیتے ایک بار پر سانپ بن کر چاروں طرف پھنکارنے لگے۔ احساس کا الاؤ جو دہکا تو ہتھکڑی، جیل اور پھانسی کا پھندہ گلے میں کسنے لگا۔

میں خود اپنے خیالوں سے ٹکرانے لگا، اس ساعت میں اپنے آپ میں رہنا نہ چاہتا تھا، کہیں دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ماضی کی کوئی حسین یاد، کوئی پُر مسرت لمحہ، عورت کا قرب، لبوں کی پنکھڑیاں، کمر کا لوچ، بازوؤں کی چکناہٹ، کہیں نرم نرم جذبات حقیقت کی بھٹی میں بھاپ بن کر اڑنے لگے۔ موجودہ لمحہ نے مجھ کو اپنے میں گھسیٹ لیا۔ اپنے خوب صورت آرام دہ ڈرائنگ روم میں ہوتے ہوئے بھی مجھے یوں لگا جیسے میں چلچلاتی دھوپ میں آبلہ پا کھڑا ہوں اور نس نس سے خون بہہ رہا ہو۔ ہر لمحہ میرے احساس کو زدوکوب کرنے لگا۔

میں پھر اٹھا اور دروازے میں لگے تالے کو گھما کر دیکھا کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر ایک بار پھر

برابر کیے۔ کہیں کوئی روزن نہ رہ گیا ہو میں آہستہ آہستہ قدموں سے کھڑکی کے پاس گیا پٹ کھول کر باہر کی جانب دیکھا تھوڑا سا جھکا سرد ہوا کے جھونکے سے میرا جسم کپکپا اٹھا لیکن حال کے اندر کی تپش بڑھنے لگی۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اوپر نظر ڈالی آسمان پر تارے معدوم ہوتے جارہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی اور کچھ چہل پہل نظر آئی۔ دودھ سے بھری موٹریں سڑک سے گزریں، روشنی دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا، ہاں ہاں کسی نے نہیں دیکھا مجھے۔ میں نے چہرے سے پسینہ پونچھا، ہر کام بخیر و خوبی ہو گیا لیکن کھڑکی کے درز سے باہر دیکھتے دیکھتے جیسے ہی میری نگاہ پلٹی تو کمرے میں کوئی مجھے کھڑا نظر آیا، خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔

''کون......؟'' بڑی مشکل سے میرے نرخرے سے آواز نکلی۔ خشک گلے سے میں نے بمشکل آواز نکالی۔

''کون......؟'' لیکن پھر بھی کوئی آواز جواب میں نہیں ابھری۔ خوف کی لہر میرے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ دہشت سے میری آنکھیں پھٹنے لگیں پھر ان پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور پتھر کے مجسمہ کی طرح میں دم بخود رہ گیا۔

جب میں نے دیکھا کہ سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ میں خود تھا لیکن آج میں ہزاروں کی بھیڑ میں، بھرے پُرے بازار میں، جیتی جاگتی شاہراؤں پر کھلے آسمان کے نیچے، بارونق بستیوں کے بیچ جس کو جب چاہتا ہوں قتل کر دیتا ہوں اور کوئی مجھے نہیں دیکھتا۔ میں روشن دان کھول کر کھڑکیوں کے پٹ ہٹا کر پردے سرکا کر تلاش کرتا ہوں کہ کوئی تو ایسا مل جائے جس نے مجھے قتل کرتے ہوئے دیکھا ہو مگر کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر طرف سناٹا ہے اور میرے اطراف کے تمام لوگ مر چکے ہیں جب اپنے اطراف کے سارے کے سارے لوگ مر جائیں تو انسان کس قدر اکیلا ہو جاتا ہے۔

❖

جوابی حملہ

اسرار احمد

ناصر کاظمی نے کیا خوب کہا ہے کہ

دل تو اپنا اداس ہے ناصر

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اس کی اس وقت یہی کیفیت تھی مگر وہ اس حقیقت کو فراموش کر گیا تھا کہ فطرت کو اداسی پسند نہیں' یہ بس انسان کا اپنا احساس ہوتا ہے کہ اسے رنج کے وقت ساری دنیا رنجیدہ نظر آتی ہے جب اس کے سوا سب لوگ مسکرا رہے ہوتے ہیں۔

ایک ٹھکرائے جانے والے نوجوان کا فسانہ' وقت اس پر مسکرا رہا تھا۔

دن بہت اداس تھا سارا شہر جیسے سائیں سائیں کر رہا تھا ہر شے بے کیف اور پھیکی پھیکی محسوس ہو رہی تھی۔ دل کے بہلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جولی نے میری شادی کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ اپنے ٹھکرائے جانے کے دوسرے روز میں حسب معمول لنچ کے وقت سینڈوچ زہر مار کرنے اپنے یار سام کے اسنیک بار پہنچ گیا۔ سام نے مجھے غور سے دیکھا اور سینڈوچ تیار کرنے کے لیے ٹماٹر کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''کہو عزیزم کیا رہا؟'' وہ ایک ذہین شخص تھا۔ فوراً معاملہ بھانپ لیا کرتا تھا لہٰذا اس سے کچھ چھپانا فضول تھا۔

''اس نے صاف انکار کر دیا۔'' میں نے ایک سرد آہ بھری۔ ''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

''حیرت ہے۔'' اس کے چہرے پر غور و فکر کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔

''تمہارے جیسے محنتی اور عمدہ لڑکے کو اس نے کیوں ٹھکرا دیا۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ تم کسی بھی لڑکی کے لیے ایک اچھا شکار ثابت ہو سکتے ہو۔''

''جولی کے لیے نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ میں اس کے ٹائپ کا نہیں ہوں اور یہ کہ وہ مجھے اپنے باپ سے متعارف کرانے کی جرات نہیں کر سکتی اس کا باپ بینک کا منیجر ہے۔''

''اس نے ایسی بات کہہ دی۔'' سام حیرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے تحت میری جانب دیکھ کر بولا۔

''شاید اس کی وجہ تمہاری لمبی لمبی زلفیں اور رنگ برنگ کا یہ لباس ہو جسے تم بے حد شوق سے پہنتے ہو۔''

میں نے افسردگی سے سر ہلایا۔ سام نے سینڈوچ میری جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کافی پیئو گے یا چائے؟''

''کافی۔'' میں نے دوبارہ ایک ٹھنڈی آہ بھری تیز اور بالکل سیاہ۔''

اس وقت نہ تو مجھے کچھ کھانا پینا اچھا لگ رہا تھا اور نہ کسی سے گفتگو کرنے پر طبیعت آمادہ ہو رہی تھی۔ لہٰذا جب سام میرے پاس سے ہٹ کر

دوسرے گاہکوں کی جانب متوجہ ہوگیا تو مجھے کچھ سکون ہوا اور میں سینڈوچ کھاتے ہوئے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوگیا۔

سینڈوچ کا ذائقہ گیلی ریت جیسا تھا لیکن اس وقت میں اس کے ذائقے کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے سیلون کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں میں ہیئر ڈریسر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ جولی کی نگاہ میں یہ پیشہ نہ صرف گھٹیا بلکہ زنانہ تھا ممکن ہے اس کا خیال درست ہو۔ اس نے کہا تھا۔

''اگر تم صرف مردوں کے بالوں کی آرائش ہی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔''

''لیکن میں مردوں کے بالوں کی بھی آرائش کرتا ہوں۔'' میں نے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہمارے سیلون میں زنانہ اور مردانہ دونوں بالوں کی آرائش کی جاتی ہے۔''

''اصلی مردوں کی بات کرو۔'' اس نے لفظ اصلی پر زور دے کر کہا۔

''شانوں تک لہراتی ہوئی زلفوں والے بھانڈوں کی بات مت کرو۔''

اس کی اس بات نے مجھے برہم کر دیا تھا۔ اس کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا وہ مجھے بھانڈ سمجھتی تھی کیونکہ میری زلفیں بھی شانوں تک پہنچتی تھیں۔ میرے بارے میں اس کا یہ خیال خاصا تکلیف دہ تھا۔ اس طرح اس نے میری تذلیل کی تھی میں نے سینڈوچ کا آخری ٹکڑا حلق سے اتارتے ہوئے بے خیالی میں اپنی کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور گرما گرم کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا لیکن دوسرے ہی لمحے چکرا گیا۔

''سام۔'' میں چیخا۔

''تم نے یہ کیسی کافی تھمادی۔''

شام، کافی کی مشین کے عقب میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے مشین کے شور میں میری آواز نہیں سنی لیکن جواب کسی اور نے دیا۔

''معاف کیجیے گا۔'' دوسرے ہی لمحے ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''آپ نے میری آدھی پیالی چائے پی لی ہے۔''

میں نے گردن موڑ کر اپنی بغل میں براجمان دوشیزہ کو دیکھا۔

''تو یہ انتہائی بدمزہ چائے تمہاری تھی۔ اس نے تو میرے گلے میں خراش ڈال دی ہے۔'' میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

اس نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے جواباً گھورا اور اپنی زلفوں کو غصے سے جھٹک کر بولی۔

''یہ تمہاری سیاہ کافی سے لاکھ درجہ خوش ذائقہ تھی اگر تم میرے لیے دوسری چائے کا آرڈر دے دو تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''سنو۔'' میں نے غصے سے جواب دیا۔

''میں نے ایک کپ کافی کے پیسے ادا کیے ہیں۔''

''لیکن تم نے میری چائے پی لی ہے۔'' وہ کاؤنٹر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''میں یہاں کی انتظامیہ سے شکایت کردوں گی۔''

''سام!'' میں دوبارہ چیخا۔

سام نے کاؤنٹر کے عقب سے جھانک کر پہلے اس لڑکی کے گلابی چہرے اور پھر میرے چہرے کی جانب دیکھا جس کی رنگت اڑ گئی تھی اسی لمحہ میں نے پہلی بار اس لڑکی پر بھرپور نظر ڈالی جو صورت

آشنا معلوم ہو رہی تھی میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر اسے پہچاننے کی کوشش کی اور مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اسے پہلے ایک بار لنچ کے اوقات میں اسی اسنیک میں دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' سام ہمارے قریب پہنچتا ہوا بولا۔

''تم کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟''

''اس نے میری چائے پی لی ہے۔'' لڑکی احتجاجاً چیخی۔

''اس نے میری کافی کی پیالی کہیں چھپا دی ہے۔'' میں بھی احتجاجاً چیخا۔

''صبر، صبر۔'' سام ایک ہاتھ بلند کرتا ہوا بولا۔

''ایک وقت میں ایک ہی فرد بیان کرے میں نہیں جانتا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو۔''

''ہم ہرگز ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔'' لڑکی نے تند لہجے میں کہا۔

''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔'' سام نے تاسف سے سر ہلایا۔

''تم دونوں کی عادات و خصائل اس قدر مشترک ہیں۔'' اس نے رک کر شانے اچکائے۔

''بہرحال شور مت کرو میرے گاہک پریشان ہو جائیں گے بہتر ہے کہ میں تم دونوں میں تصفیہ کرا دوں۔'' اس نے ٹھنڈی چائے کی وہ پیالی کاؤنٹر سے ہٹا کر دوسری چائے کی پیالی رکھ دی۔

''اور میری سیاہ کافی؟'' میں غرایا۔

سام نے جاتے جاتے مڑ کر میری جانب دیکھا۔

''اور اس کے پیسے کون ادا کرے گا۔''

''میں ہرگز ادا نہیں کروں گا۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا ''میں نے وہ پیالی دیکھی تک نہیں تھی۔''

لڑکی کا گلابی چہرہ غصے سے مزید گلابی ہو گیا۔

''میری طرف اس طرح مت گھورو۔'' اس نے آنکھیں نکالیں اور چائے کی ایک چسکی لی۔

عجیب لڑکی ہے میں نے دل میں کہا اپنے حلیے سے وہ سام کی گاہک نہیں معلوم ہوتی تھی اس نے گریس سے آلودہ جینز پہن رکھی تھی اور اس کے گیسو اتنی بے ترتیبی سے ترشے ہوئے تھے کہ لگتا تھا کہ کسی بچے نے انہیں گھر میں استعمال ہونے والی قینچی سے تراشا ہو۔ اس کی شرٹ پر بھی گریس کے دھبے پڑے تھے۔ یکایک وہ ہیسٹریائی انداز میں زور سے قہقہے لگانے لگی اور سارے گاہک مڑ کر اسے حیرت سے گھورنے لگے۔

''معاف کرنا۔'' چند لمحوں کے بعد وہ اپنی ہنسی پر قابو پا کر بول پڑی۔

''مجھے اس طرح قہقہے نہیں لگانے چاہیے تھے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اس وقت تمہاری صورت سے ویسی ہی بے زاری ٹپک رہی ہے جیسی میرے ڈیڈی کی صورت سے اس وقت ٹپکتی ہے جب میں گیراج سے گریس میں لتھڑی ہوئی گھر واپس آتی ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کے لیے مکینک کی حیثیت سے انجن وغیرہ میں دلچسپی لینا مناسب نہیں ہے وہ چاہتے ہیں کہ میں کسی بینک میں یا بہت بڑے ملبوساتی اسٹور میں ملازمت کروں۔''

''میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔'' میں غرایا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گالوں پر پڑے ہوئے دھبوں کے باوجود وہ ایک بہت ہی پرکشش لڑکی تھی اور اگر اس کے بے ترتیب گیسوؤں کو

قرینے سے تراشا جاتا تو اس کی سج دھج دیکھنے کے قابل ہوتی اس نے میری جانب مسکرا کر دیکھا اور میرے دل کی نیا ڈول گئی۔ مجھے اس کی یہ مسکراہٹ بے حد دلنشین لگی اور میں پہلی بار اپنے دل میں فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ نے میری ساری اداسی گویا نچوڑ دی تھی۔ اسی دوران سام مسکراتا ہوا کاؤنٹر کے دوسرے سرے پر نمودار ہوا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی و شرارت کی چمک تھی۔ اس شے نے مجھے مشکوک کر دیا۔

''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم دونوں دوستانہ فضا میں گفتگو کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ میرے گاہک ہمیشہ اسی طرح دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کریں۔ اس سے کاروبار پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کافی مشین کے برابر رکھی ہوئی کافی کی پیالی کی جانب اشارہ کیا۔ ''دیکھو۔'' اس کے لہجے میں کھسیاہٹ تھی۔

''بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے میرے خیال میں یہ تمہاری کافی ہے میں مصروفیت کی وجہ سے اسے وہیں رکھ کر بھول گیا تھا خیر کوئی بات نہیں یہ رہی دوسری گرما گرم کافی۔''

اس نے تازہ کافی کی دوسری پیالی میری جانب بڑھا دی اور ساتھ ہی آنکھ ماری وہ لڑکی دوبارہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی اور میں قتل ہوتے ہوتے رہ گیا کس غضب کی مسکراہٹ تھی ظالم کی لیکن اس کی یہ مسکراہٹ مجھے معنی خیز محسوس ہوئی۔ اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی یہ سارا چکر سام کا چلایا ہوا تھا دراصل اس سے میری اداسی دیکھی نہیں گئی تھی چنانچہ اس نے جان بوجھ کر ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کی خاطر ہماری پیالیوں کے ساتھ وہ حرکت کی تھی۔

''دھوکے باز۔'' کافی کی چسکی لیتے ہوئے میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کون؟'' لڑکی مسکرائی اس کی مسکراہٹ میں چاہت گھلی ہوئی تھی مجھے یہ سوچ کر اطمینان قلب ہوا کہ کوئی تو ہے جسے میری لمبی زلفوں اور رنگ برنگے لباس پر اعتراض نہیں ہے میں نے اس کی جانب دیکھا۔

''میں اس بڑے میاں سام کی بات کر رہا ہوں یہ سب اسی کی شرارت ہے۔ ٹھہرو ذرا یہ اپنے کام سے فارغ ہو جائے پھر میں اس کی وہ خبر لوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔''

''تمہارا مطلب۔'' لڑکی نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''اس کی شان میں چند بڑے ہی خوب صورت الفاظ استعمال کروں گا۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نہ...... نہ۔'' لڑکی جلدی سے بول پڑی۔ ''پلیز ایسا نہ کرنا وہ میرے ڈیڈی ہیں۔''

ہیپی کرسمس

ذوالفقار احمد

بعض کہانیوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مختصر ہونے کے باوجود ضخیم کہانیوں پر حاوی ہوجاتی ہیں۔ لکھنے والے کا انداز' کہانی پر اس کی گرفت اور موضوع کی ندرت کے باعث ایک مختصر کہانی بھی ضخیم سے ضخیم کہانی اور ناولٹ پر حاوی ہوجاتی ہے۔

ایک ایسی مختصر کہانی جو آپ کو ناول پر بھاری محسوس ہوگی۔

"کرسمس مبارک ہو۔" پیٹر نے بار کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

اگرچہ کرسمس کا دن نہیں تھا پھر بھی سڑکوں پر لوگوں کی ریل پیل تھی اور پیٹر بہت خوش تھا اسے یہ تین لفظ بہت اچھے لگ رہے تھے وہ خود کو زندگی سے بھرپور محسوس کررہا تھا اور گلاس سے معدے میں جانے والی ہر بوند حیات بخش ثابت ہورہی تھی۔

"ہیپی کرسمس۔" اس نے ایک بار پھر گلاس ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے زیرلب کہا۔ آج اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے یہ پورا شہر اس کا شناسا ہو اور اس شہر کا ہر فرد اس کے کنبہ کا رکن ہو۔

وہ آٹھ ماہ قبل وانہنگ سے نیویارک آیا تھا۔ یہ آٹھ ماہ اس نے تنہائی کے کرب اور ضمیر سے جنگ لڑتے ہوئے گزارے تھے اور آج جب وہ ایک قطعی فیصلے پر پہنچ گیا تھا تو اس کی مسرت دیدنی تھی آج کی شب شہر اس پر خوشیاں نچھاور کررہا تھا کرسمس کا دن ابھی چند روز بعد آنا تھا لیکن اس کے احساسات بالکل ایسے تھے جیسے کرسمس کی شب کسی بچے کے ہوتے ہیں آج اسے سڑک پر گھومنے والا ہر بچہ اپنی ماں کا بیٹا لگ رہا تھا یہ بڑی ہی اچھی اور سنسنی خیز کیفیت تھی اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں رینگ گیا۔ وہاں اس کی انگلیاں ایک لفافے سے ٹکرائیں اور پھر ان انگلیوں نے واپس آکر گلاس کو تھام لیا اس کے چہرے پر بشاشت کے تمام رنگ کھل گئے۔

وہ ایک دفتر میں ملازم تھا اور آج وہاں پارٹی تھی۔ اسی پارٹی کی وجہ سے اس کے ضمیر اور دل کے مابین ایک سال سے جاری جنگ کا خاتمہ بھی ہوا تھا پارٹی میں اس نے بے شمار چہرے دیکھے تھے معصوم، بدمعاش، شریف اور سپاٹ چہرے ان میں اس کا اپنا چہرہ بھی تھا بے جان، بے رنگ اور کھردرا چہرہ لیکن پارٹی کے ختم ہونے پر اس کے چہرے نے کئی رنگ بدل لیے تھے اور وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں عام انسان بن کر رہنا ہی زیادہ اچھا ہے لہٰذا اس نے وہی کیا جس کا اصرار اس کا ضمیر کرتا رہا تھا۔

"بارٹینڈر۔" اس نے اپنے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے سرخ چہرے والے بارٹینڈر کو بلایا اسے بارٹینڈر کا کرخت چہرہ بھی بہت اچھا لگا۔

"یس سر۔"

"مجھے پیٹر کہو دوست...... پیٹر...... میں تمہارا دوست ہوں۔"

"بہت بہتر پیٹر۔" بارٹینڈر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری طرف سے ایک گلاس پی لو۔"

"میں ڈیوٹی کے اوقات میں نہیں پیتا۔"

"آہ...... بارٹینڈر ڈیوٹی کے اوقات میں نہیں پیتے بلکہ پلاتے ہیں لیکن آج پی لو دوست میرے نام پر، میری مسرتوں کے نام پر آج میں بہت خوش ہوں شہر کے ہر شخص کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں واہ کیا شہر ہے اور ہاں سنو میں نشے میں تو نہیں لگ رہا۔"

"لگ رہے ہو پیٹر۔" بارٹینڈر نے ایک گلاس چمکاتے ہوئے کہا۔

"مگر میں نشے میں تو نہیں ہوں، سنو میں آٹھ ماہ قبل یہاں آیا تھا اور میرے کان میل سے بھرے ہوئے تھے باہر کا شور اور ہما ہمی دیکھ کر میں دیوانہ سا ہوگیا پریشان رہنے لگا لیکن پھر مجھے ایک ملازمت مل گئی اور میری ملاقات بہت سے اچھے لوگوں سے ہوئی۔ میں نے کپڑے پہننے کا سلیقہ سیکھا اور مجھے رہنے کے لیے ایک گھر بھی مل گیا۔ اب مجھے اس شہر سے بڑا پیار ہے۔ یہاں کا ہر باشندہ سنہرے دل کا مالک ہے سب پیارے ہیں۔ ان کے درمیان میں خود کو انسان سمجھنے لگا ہوں میں زندہ ہوں میرے خدا میں زندہ ہوں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم ایسا محسوس کرتے ہو پیٹر۔"
"آہ میرے دوست واہنگ میں تو میں مر چکا تھا لیکن اب زندہ ہوں مجھے نئی زندگی ملی ہے آؤ ایک گلاس میرے نام پر پیو۔"
"میں شراب نہیں پی سکتا۔"
"اچھا چھوڑو میں اصرار نہیں کروں گا۔" پیٹر نے خوش گوار لہجے میں جواب دیا۔
"آج رات میں کسی سے بحث نہیں کروں گا کسی سے ضد نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ آنے والا کرسمس میری زندگی کا پہلا خوش گوار کرسمس ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔ بارٹینڈر نے بھی از راہ مروت اس کا ساتھ دیا اور پھر جب پیٹر کی ہنسی تھم گئی تو اس نے گلاس اٹھا کر بارٹینڈر کی طرف دیکھا۔
"ہیپی کرسمس۔"
وہ اس وقت بھی آپ ہی آپ مسکرائے جا رہا تھا جب ایک اور شخص بار میں آ کر اس کے برابر والے اسٹول پر بیٹھ گیا اس نے بارٹینڈر کو ہاتھوں سے اشارہ کیا اور پھر بولا۔
"نیٹ...... رے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پرس نکال لیا۔
"نہیں دوست آج میری طرف سے پیو۔" پیٹر نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ اجنبی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بڑا ستواں اور پر وقار تھا آنکھوں میں چمک تھی مگر وہ چہرے کی مناسبت سے چھوٹی تھیں۔ "کیوں کیا بات ہے؟" اجنبی نے کرخت لہجے میں کہا۔
"ارے کچھ بھی نہیں۔" پیٹر ہنسنے لگا۔
"بس آج میں بہت خوش ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم میری طرف سے پیو۔"
اجنبی نے پرس سے پانچ کا نوٹ نکال کر بار ٹاپ پر رکھتے ہوئے ناک سکیڑی۔
"میں بھکاری نہیں ہوں نوجوان۔"
"میں نے یہ کب کہا۔ میں بہت خوش ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی میری خوشی میں شریک ہو جاؤ۔"
اجنبی ہنکارا بھر کر رہ گیا اور اسی لمحے بارٹینڈر نے گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ گلاس ایک ہی گھونٹ میں صاف کرنے کے بعد اس نے دوسرے گلاس کا حکم دیا۔
"میرا نام پیٹر چارلی ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"تو میں کیا کروں۔"
"اوہ اپنا تعارف نہیں کراؤ گے؟"
"فرینک۔"
"تم سے مل کر دلی مسرت ہوئی فرینک۔" پیٹر نے زبردستی اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"بس اب خاموش ہو جاؤ۔" فرینک نے اپنا ہاتھ چھڑا کر اسے دھتکار دیا مگر وہ برا ماننے کے بجائے ہنسنے لگا۔ "ایسی باتیں مت کرو فرینک آج کی رات خوشیوں سے بھری ہوئی ہے۔"
"مجھے حکم مت دو، تم ہو کون؟"
"پیٹر چارلی۔"
"دفعان ہو جاؤ میری اپنی پریشانیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ روکھا اور نفرت سے بھرپور تھا۔
"اوہ، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اپنی پریشانیوں کے بارے میں بتاؤ تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا۔"
"پریشانیاں میری ہیں تمہاری نہیں۔"
"مگر ہم سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنا ہمارا فرض ہے فرینک۔"
"جہنم میں جاؤ۔" فرینک نے جھلا کر جواب دیا اور دوسرا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔
"کیا میں تمہیں بدمست لگ رہا ہوں۔" پیٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"تم پاگل لگ رہے ہو۔"
"مذاق مت کرو یار۔" پیٹر ہنسنے لگا۔
"میں تم سے مذاق کیوں کروں گا۔ تم جیسے لگ رہے ہو، ویسا ہی میں نے جواب دیا ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ کوئی بات تمہاری پریشانی کا باعث ہے فرینک۔"
"سنو پیٹر میں یہاں پینے کے لیے آیا ہوں، اعترافات کے لیے نہیں۔"
"میرا خیال یہ بھی ہے کہ تم کبھی فوج میں رہے ہو، میں بھی بحریہ میں تھا وہاں سے جان چھڑا کر میں نے سکون کی سانس لی تھی...... خیر...... چھوڑو اب تو میں دنیا کے سب سے حسین شہر میں ہوں۔"
"تب پھر چوک پر جا کر ناچنا شروع کر دو۔"
"میرے دوست۔" پیٹر نے بڑے خلوص سے کہا۔
"اپنی پریشانی کا سبب بتا دو ممکن ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں تم اتنے اداس کیوں ہو، فرینک۔"
"میں کبھی اداس نہیں رہا۔"
"کیا تمہیں نوکری سے جواب مل گیا۔"
"نہیں، بس اب اپنی چونچ بند رکھو۔"

"آج کل کیا کرتے ہو؟"
"ٹرک ڈرائیور ہوں پہلے باکسر تھا۔"
"اوہ۔" پیٹر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "مگر تم نے باکسنگ کیوں چھوڑ دی۔"
"مجبوراً انہوں نے مجھے نا اہل قرار دے دیا ایک باکسر میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"
"اف...... رنگ میں......!" پیٹر کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔
"ہاں مگر تمہیں اتنا قلق کیوں ہوا کھیل میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے۔"
"تو یہی بوجھ، ضمیر کا بوجھ تمہیں پریشان رکھتا ہے اب میں سمجھ گیا" پیٹر نے کوٹ کی اندرونی جیب تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔
"میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں احمق۔" فرینک نے تلملا کر کہا۔
"کیا تم کرسمس کی تعطیلات پر گھر آئے ہوئے ہو، فرینک۔"
"میرا کوئی گھر نہیں۔"
"اوہ، مذاق مت کرو ہر انسان کا کوئی نہ کوئی گھر ضرور ہوتا ہے۔"
"تمہارا گھر کہاں ہے یہاں یا......!"
"پورا شہر میرا گھر ہی ہے، فرینک۔"
"تم واقعی پاگل ہو۔"
"میرے والدین کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میری عمر تین سال تھی اب وہنگ میں میرا کوئی نہیں لیکن نیویارک آ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں جنم جنم ہی سے یہاں کا رہنے والا ہوں اور ہر شخص میرا دوست ہے میں یہاں کسی اچھی لڑکی سے شادی کر کے اپنا خاندان بنانا چاہتا ہوں پھر جب ساری مشکلات دور ہو جائیں گی تو میں اسی شہر میں رہنے لگوں گا۔"
"خواب بھی دیکھتے ہو، پیٹر۔" فرینک نے تلخ لہجے میں کہا۔
"وہ باکسر کس طرح مرا تھا۔"
"میرے گھونسے سے، گھونسا اس کے نرخرے پر لگا تھا۔"
"اوہ تم نے بڑے غصے میں گھونسا مارا ہوگا؟"
"باکسر کبھی غصے میں نہیں آتے انہیں لڑنے کی ہی اجرت ملتی ہے۔ اب تم خاموش ہو جاؤ میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"
"مگر میں رقم کی خاطر کبھی کسی سے نہیں لڑتا۔ فرینک۔" پیٹر کہتا رہا۔ "میں غصیلا تو بہت ہوں لیکن اس غصے کو کبھی دولت کی خاطر استعمال نہیں کروں گا۔"
"بکواس مت کرو۔" یہ کہہ کر فرینک نے دوسری طرف منہ کر لیا۔
"فرینک میری خاطر ایک گلاس پی لو۔"
"بھاگ جاؤ، پریشان مت کرو۔"
"میں معذرت خواہ ہوں لیکن آج کی رات میں۔"
"بہت خوش ہوں یہی کہنا چاہتے ہو نا مگر خوشی کی کیا بات ہے کیا تم تیل کے کنوئیں کے مالک بن گئے ہو۔"
"میں تو بس۔"
"تم صرف پاگل اور بدمست شرابی ہو۔" فرینک کا پارہ چڑھنے لگا "شاید تمہارا باپ بھی پاگل تھا۔"
پیٹر اسے گھورنے لگا۔ "کیا کہا تم نے؟"
"یہی کہ تم پاگل ہو، تمہارا باپ بھی پاگل تھا اور شاید تمہاری ماں......!"
"فرینک۔"
"تمہاری ماں یقیناً آوارہ تھی۔" فرینک نے بڑے غصے کے عالم میں جملہ مکمل کر کے گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا۔
"شاید تم مذاق میں یہ سب کچھ کہہ رہے ہو۔"
"نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔" فرینک کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک عود کر آئی وہ پیٹر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔
"میری ماں کے بارے میں بھی؟"
"ہاں کتنی بار کہوں، تمہاری ماں یقیناً آوارہ تھی تم اس کی جائز اولاد نہیں ہو۔"
"ایسی باتیں مت کہو۔" پیٹر کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔
"تم پاگل ہو تمہارا باپ بھی پاگل تھا اور تمہاری ماں بھی۔"
"بکواس بند کرو۔" پیٹر نے پہلی بار بڑے غصیلے لہجے میں کہا۔
"تمہاری ماں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔"
"میں تمہیں......" پیٹر اسٹول چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔
"تمہاری ماں۔"
"کمینے۔" پیٹر اس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ اس نے بیئر کی بوتل اٹھائی اور پھر......!"
"مر گیا۔" کانسٹیبل نے نبض اور دل کی دھڑکن محسوس کرنے میں ناکامی کے بعد کہا۔
"کیا ہوا تھا؟"
"ہم بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔" فرینک نے جواب

دیا۔" اچانک اس پر دیوانگی سوار ہوگئی اور اس نے بیئر کی بوتل سے مجھ پر حملہ کر دیا کیوں بارٹینڈر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"جی ہاں اس نے بوتل اٹھائی تھی جو مسٹر فرینک کے سر کے اوپر سے گزر کر دور جاگری۔"

"پھر کیا ہوا؟" سارجنٹ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"پھر میں نے اسے دھکا دیا اور یہ گر کر مر گیا؟"

"تم کیا کہتے ہو بارٹینڈر۔" سارجنٹ نے پوچھا۔

"یہی ہوا تھا جناب۔ مگر مسٹر فرینک نے اسے گھونسا مارا تھا۔"

"میں نے محض دفاعی قدم اٹھایا تھا۔"

"کس چیز سے دفاع کر رہے تھے بوتل تو تمہیں نقصان پہنچائے بغیر ایک طرف گر گئی تھی۔"

"وہ......وہ بہت غصے میں تھا۔"

"کس وجہ سے۔"

"پتا نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں بتا سکتا ہوں جناب۔" بارٹینڈر نے لقمہ دیا۔

"مسٹر فرینک نے اس کی ماں کے بارے میں نازیبا کلمات کہے تھے۔"

"ٹھیک ہے فرینک فی الحال خود کو حراست میں سمجھو۔"

"اچھا ضرب کی نوعیت کیا ہے؟" سارجنٹ نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر بحث کر رہا تھا۔

"نرخرے پر کاری ضرب اور ایسی ضرب صرف اس وقت لگتی ہے جب جان بوجھ کر نرخرے کو نشانہ بنایا جائے ذاتی دفاع میں گھونسا چلایا جائے تو وہ صرف سر، کندھے، سینے، پیٹ یا کولہے پر لگ سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہم فرینک کا پچھلا ریکارڈ بھی دیکھ لیں ایڈی۔"

سارجنٹ نے اپنے ساتھی سے کہا اور وہ سر ہلا کر ریکارڈ روم کی طرف چلا گیا اسی لمحے ایک کانسٹیبل نے پیٹر کی جیبوں سے نکلا ہوا سامان سارجنٹ کی میز پر رکھ دیا جو ایک پرس چند سکوں اور ایک لفافے پر مشتمل تھا اور لفافے پر پولیس ہیڈ کوارٹر کا پتا لکھا ہوا تھا سارجنٹ نے لفافہ کھول کر خط نکالا اور بے صبری سے اسے پڑھنے لگا۔

"میں پیٹر چارلی ولد چارلی ہیکٹر، خدا کو حاضر و ناظر جان کر اعتراف جرم کر رہا ہوں۔

یہ آج سے ایک سال پہلے کی بات ہے میں واہنگ میں تھا کہ ایک روز مجھے اپنی ماں کی قبر پر جانے کا اتفاق ہوا وہ اس وقت مری تھی جب میری عمر تین ساڑھے تین سال تھی لہذا جب بھی میں احساس محرومی کا شکار ہوتا تھا تو ماں کی قبر پر بیٹھ کر یہی سوچتا رہتا تھا کہ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو میں اس احساس سے کبھی آشنا نہ ہوتا وہاں میں دیر تک بیٹھا رہا پھر معاً میں نے ایک لڑکی کے چیخنے کی آواز سنی وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں سمت کا اندازہ لگا کر اسی طرف دوڑا اور میں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ مجھے مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا ایک شخص میری پڑوسن کو گھونسے مار رہا تھا اس لڑکی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ اس شخص کی گرفت میں کسی بے بس پرندے کی طرح پھڑک رہی تھی میں اس شخص پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے اسے بری طرح مارا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اس دوران لڑکی فرار ہو کر گھر پہنچ گئی اور پھر جب مجھے احساس ہوا کہ میں قتل کر چکا ہوں تو خوف کی وجہ سے میں سامان لیے بغیر وہاں سے بھاگ کر نیویارک آ گیا۔ یہ اسی سال ۴ مئی کی بات ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اپنے ضمیر کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اعتراف کرلوں کہ کس حالت میں مجھ سے جرم سرزد ہوا ہے۔ باقی تفصیلات میں بالمشافہ ملاقات میں بتا سکتا ہوں میرا پتا یہ ہے پیٹر چارلی ۱۳۲ اے، ساؤتھ لین نیویارک۔

"وہ اسے پہچان گیا تھا لہذا اس نے جان بوجھ کر پیٹر کو اشتعال دلایا اور پھر اپنا انتقام لے لیا۔" سارجنٹ نے کاغذات کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا جن کے مطابق ۴ مئی کو واہنگ کے قبرستان سے چند گز دور کسی کی لاش نہیں ملی تھی بلکہ ایک بے ہوش شخص کو اٹھا کر اسپتال لایا گیا تھا اور اس کا نام فرینک تھا جو پیشہ کے اعتبار سے باکسر تھا۔ اور جس پر پہلے بھی نادانستہ قتل کا الزام لگ چکا تھا کاغذات میں کسی جگہ بھی فرینک کے خلاف یہ شکایت نہیں تھی کہ اس نے کسی لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا ہو لیکن سارجنٹ جانتا تھا کہ لوگ عموماً اس قسم کے کیس درج نہیں کراتے ہیں۔

"ٹھیک ہے ایڈی۔" سارجنٹ نے طویل سانس لے کر سگار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"فرینک کو قتل عمد کے الزام میں گرفتار کرلو، باقی جیوری پر چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس مرتبہ فرینک بچ کر نہیں نکل سکتا۔ بار ٹینڈر کی یہ گواہی بہت اہم ہے کہ فرینک نے جان بوجھ کر اسے اشتعال دلایا تھا۔"

فیصلہ عوام کا

ابن عرب

ہمارا معاشرہ ایک تھیٹر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے' جہاں ہر ایک خواہ عوام ہوں یا سیاست داں' استاد ہو یا دانشور سب ہی بھانڈ کا کردار ادا کر رہے ہیں کوئی بھی کسی ذمہ دار شخص کا کردار ادا کرنے کو تیار نہیں۔

ہمارے معاشرے کی عکاس سوچ و فکر کو درواکرتی تحریر۔

ملک میں جس قسم کے سیاسی حالات چل رہے تھے اس کی وجہ سے ساری پریشانی عوام کو برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔ اور ایک سیاسی جماعت کے بانی کا تو نعرہ ہی تھا کہ سیاسی قوت کا سرچشمہ عوام ہیں تو کئی برسوں کے بعد جب عوام گہری نیند سے جاگے تو انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس نعرے پر عمل کر کے دیکھ لیا جائے۔ اور اپنا آپ منوایا جائے کہ ہم ہی قوت کا سرچشمہ ہیں۔ اور اس سرچشمے میں کئی ایسے بھی تھے جن کو پلس تین نظر کے چشمے لگے ہوئے تھے۔ مگر وژن سب کا ایک تھا۔ اس لیے اب عوام نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پسند کا حکمران لائیں گے۔

عوام نے یہ فیصلہ تو کر لیا مگر یہ سب کیسے ہو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ بیچارے عوام تھے کوئی سیاسی لیڈر تو تھے نہیں کہ اپنی کرشمہ سازی سے ہر مسئلے کا حل چٹکیوں میں نکال لیتے۔ کئی ایک نے رائے دی کہ اس کے لیے الیکشن ہی مناسب راستہ ہے تو بہت سوں نے اس کی مخالفت بھی کہ اب تک جو الیکشن ہوئے ہیں ان میں ہمارے ووٹ کہاں گئے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ الیکشن ہم عوام کے لیے مضر صحت ہیں اور ایسے مضر کہ کوئی وزارت کہیں یہ سلوگن لکھواتی بھی نہیں کہ عوام اس مضر عمل سے دور رہیں تو یہ ان کے حق میں اور صحت کے لیے بہتر ہوگا۔

جب کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ایک لال بجھکڑ چاچا نے یہ رائے دی کہ ہم سب اپنی اپنی تجویز ایک پرچے پر لکھ کر ڈبے میں ڈال دیتے ہیں اور جس کی تجویز سب سے اچھی ہوگی اس پر عمل کر لیا جائے گا۔ یہ رائے اتنی اچھی تھی کہ کوئی رائے بہادر بھی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا اس لیے سب نہ صرف مان گئے بلکہ نہایت جوش سے اپنی اپنی تجویز لکھ کر متعلقہ ڈبے میں پھینکتے گئے۔

اتوار کے تعطیل والے دن سب جمع ہوئے اور جمع ہونے والی تجاویز کا جائزہ لیا گیا۔ ایک صاحب جو ٹی وی پروگراموں سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتے تھے ان کی تجویز سب کے دلوں کو ایسے بھا گئی جیسے ایک اینکر پرسن ایک سیاسی لیڈر کو بھا گئی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ بگ برادر اور بگ باس کی طرز پر بگ عوام کے نام سے ایک شو رکھا جائے جس میں ملک کی ہر بڑی قومیت کے فرد سے ایک ایک نمائندہ منتخب کیا جائے۔ اور ان کا امتحان لیا جائے۔ جو امیدوار زیادہ بہتر لگے گا اسے سب سے بڑی کرسی پر بٹھا دیا جائے گا۔

سب لوگوں نے ہاتھ اٹھا کہ اس تجویز کی تائید

سکے

میں اپنا اپنا ووٹ کاسٹ کیا یوں اس تجویز کو متفقہ عوامی تجویز قرار دے کہ اس پر جلد از جلد عمل پیرا ہونے کی ہدایت بھی کر دی گئی۔ لیکن ساتھ ہی یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی کہ عوام خود منظر عام پر نہیں آئیں گے۔ بلکہ ایک مخصوص فارم ہاؤس میں لگے خفیہ کیمروں کے ذریعے امیدواروں کی نگرانی کریں گے اور مخفی اسپیکروں کے ذریعے ہدایات جاری کریں گے۔

......☆☆☆......

اور پھر وہ مبارک دن بھی آ گیا جب عوام نے ملک کے ہر صوبے سے چنیدہ افراد کو جمع کر کے ایک فارم ہاؤس میں لا کر قید کر دیا اور اب وہ سب ڈرائنگ میں بیٹھے ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں خود کو سلمان خان اور عامر خان سمجھ رہے تھے۔

ابھی وہ مخمصے میں الجھے ہوئے تھے کہ ایک اسپیکر سے آواز ابھری۔ ''آپ سب لوگوں کو بگ عوام کے اس شو میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج تک ہمارے ملک میں نہ کبھی عوام کو بگ سمجھا گیا اور نہ ہی کبھی عوام نے آپ جیسے سیاستدانوں کو دل سے خوش آمدید کہا ہے۔''

آواز سنتے ہی چوہدری شیر دل نے اکڑ کر پوچھا۔ ''اوئے پہلے تو یہ بتاؤ کہ ہم سب کو یہاں بلایا کیوں گیا ہے۔''

اسپیکر سے آواز آئی۔ ''آج تک آپ لوگوں نے عوام کو اپنے اشاروں پر نچایا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ عوام آپ سے کچھ کام کروائے۔''

سرائیکی وسیب کا امیدوار اللہ وسایا نے اپنا ہی سر دھنتے ہوئے بولا۔ ''کمال ہے بھئی اب عوام کی یہ ہمت ہو گئی۔''

سندھی نمائندہ سائیں مولا بخش جو بڑی دیر سے گہری سوچ میں ڈوب کر خواہ مخواہ اپنی ہی سوچوں کا کچومر بنا رہا تھا دور کی کوڑی لاتے ہوئے بولا۔ ''اڑے بابا' ہم کو تو اس میں بھی کوئی بیرونی سازش کا ہاتھ لگتا ہے۔''

ظاہر اس بات پر غصہ کرنا تو عوام کا حق بنتا تھا۔ ''آپ لوگوں کو عوام کی بھلائی کے ہر کام میں بیرونی ہاتھ لگتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سب کچھ آپ ہی کے ہاتھ لگتا ہے۔''

پٹھان نمائندہ گل خان جوان تمام باتوں سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور کچھ نہ کچھ بولنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بلوچ سے مخاطب ہوا۔ ''بلوچ بابا۔ تم کچھ نہیں بولے گا یارا۔''

شمس بلوچ ویسے ہی بیزار بیزار سا بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت بے دلی سے بولا۔ ''نہیں ڑے۔ ہم ناراض ہوں۔''

گل خان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس پر کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔ بس بول ہی دیا۔ ''بڑا خوشی کا بات ہے۔''

اسی وقت اسپیکر پر ایک بار پھر عوام کی آواز ابھری۔ ''یہاں آپ سب کو مختلف ٹاسک دیئے جائیں گے جنہیں آپ سب نے مکمل کرنا ہے۔''

شہری سندھ کے نمائندے بشارت نے اپنی بیچ کی مانگ کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ یہ بتایئے کہ ہمیں کرنا کیا کیا ہو گا۔''

عوام نے کہا۔ ''ہلا گلا' موج مستی......شور شرابا۔''

اللہ وسایا بولا۔ ''یہ سب تو ہم اسمبلی میں بھی کر لیتے ہیں۔ پھر یہاں آنے کا کیا فائدہ۔''

عوام نے دلچسپی کا پہلو ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آنے کا یہ فائدہ ہے کہ بالی ووڈ کی فلم دبنگ اور ڈون کی ہیروئنز بھی آپ کے ساتھ اس مقابلے میں شریک ہیں اور آپ سب یقیناً ان دونوں کو جانتے ہوں گے۔''

شیر دل نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ او جی' ان کو کون نہیں جانتا جی۔ اتنا تو ہم سیاست کے بارے میں نہیں جانتے جتنا ان دونوں کے بارے میں جانتے ہیں۔''

اسی وقت باہر کے دروازے سے دو نہایت خوبصورت حسینائیں جلوے بکھیرتی ہوئی اندر آتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہر کوئی اپنی کئی بیرل کے حساب سے بہنے والی رال کو ٹپکنے سے بچانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

سوناکشی ایک ادا کے ساتھ بولی۔ ''ہم کو سب جانتے ہیں۔ لیکن کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم دونوں آپ لوگوں کو نہیں جانتیں۔''

مولا بخش نے شمس بلوچ کی طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہے۔ اگر پہلے سے جان لیتیں تو شاید اس شو میں شریک ہونے سے ہی منع کردیتیں' کیوں سائیں۔''

شمس بلوچ بھی پہلی بار کچھ موڈ میں نظر آنے لگا تھا۔ ''کہتا تو تم سچ ہے۔ اب دیکھنا ان لوگوں کا سامنے ہم کیسا پرفارمنس دکھاتا ہوں۔''

عوام نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز...... خواتین کے حقوق کا خیال رکھیں۔''

گل خان نے اپنا کلاہ ٹھیک کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔ ''کمال ہے......خواتین کا بھی حقوق ہوتا ہے۔''

مولا بخش نے خواہ مخواہ اپنے شانے اکڑاتے ہوئے کہا۔ ''اڑے بابا' یہ کیوں بھولتا ہے کہ خواتین کے حقوق کا بل ہم نے ہی پاس کروایا ہے۔''

اللہ وسایا ان سب پر اپنے شاعرانہ ذوق کی مار مارتے ہوئے بولا۔ ''دل میں ہک گل اکھ ساں' او اقبال صاحب نے کی خوب فرمایا ہے نا کہ وجود زن سے کائنات میں رنگ۔''

شمس بلوچ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ''رنگ۔ کون سا کمپنی کا۔''

گل خان بھی کیوں پیچھے رہتا پوچھ بیٹھا۔ ''یہ اقبال صاحب کون ہے۔ کون سا پارٹی سے تعلق ہے اس کا۔''

بشارت نے ان سب کو شرمندہ کرتے ہوئے اپنی علمیت جھاڑی۔ ''ارے میاں' اقبال! یعنی علامہ اقبال' سنا ہے' بہت بڑے شاعر تھے۔''

شمس کا شاعری سے کیا لینا دینا۔ ''تھے کا بات چھوڑ وڑے۔ جو ہے اس کا بات کرو۔ خواتین کا حقوق کا بات کرتا ہے۔ یہ بتاؤ ہم کو ہمارا حقوق کب ملے گا۔ نہیں تو ہم ناراض ہوں۔'' یہ کہہ کر شمس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر صوفے میں اور اندر دھنس جاتا ہے۔

ایک بار پھر عوام کی آواز آئی۔ ''آپ سب وزیراعظم بننے کے امیدوار ہیں' اور جو اس شو میں کامیاب ہوگا۔ عوام اسے آئندہ پانچ سال کے لیے وزیراعظم منتخب کرلیں گے۔ کیا آپ اس شو کے لیے تیار ہیں۔''

گل خان نے دور تک نسوار کی پچکاری مارتے ہوئے کہا۔ ''اوہ خدایا تیار نہیں ہوتا تو ادھر کیوں آتی۔ مڑا تم عوام بھی بالکل عوام ہی ہے۔''

عوام نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تو آپ لوگوں کا مقابلہ شروع ہوتا ہے اب۔''

......☆☆☆......

سب ہی لاؤنج میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اور کچھ ادھر ادھر رہیں۔ مولا بخش نے ہیروئنوں کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اڑے بابا۔ ہم لوگ تو ادھر وزیراعظم بننے آیا ہے۔ تم لوگ ادھر کیا شیو بنانے آیا ہے۔''

پریانکا منہ بنا کر بولی۔ ''یہ گلیمر کا دور ہے مسٹر اور ہمیں صرف گلیمر کے لیے ہی اس شو میں رکھا گیا ہے۔''

گل خان حیران رہ جاتا ہے۔ ''گلیمر......''

وہ اٹھ کر سوناکشی کی طرف بڑھتا ہے اور چوہدری اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیتا ہے۔ ''اوئے اتھے مرنا نہیں تھا تم نے۔ بگ عوام نے کیا کہا تھا۔ کوئی ان ہیروئنوں سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

''دل زیادہ نہیں، پر تھوڑے بہت تو فری ہو سکتے ہیں نا۔'' اللہ وسایا اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔

سوناکشی ایک ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے فری ہونے کی کوشش وہ کرے......''

بشارت فٹ سے بول پڑا۔ ''کون کرے۔''

''وہ کرے۔'' سوناکشی دوبارہ اٹھلا کر بولی۔

سائیں کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔

''کون کرے، اڑے بابا جلدی بتاؤ۔''

''وہ کرے جو تھپڑ کھانے کی ہمت رکھتا ہو۔''

سوناکشی نے جیسے ان کے سر پر بم سا پھوڑ دیا۔

گل خان سہم گیا اور بولا۔ ''فی الحال تو امارا کھانا کھانے کا دل کر رہا ہے۔ تھپڑ کسی اور کو کھلا دو۔''

کسی انجانے کونے میں لگے اسپیکر سے عوام کی آواز ابھری۔ ''آپ لوگوں کا پہلا سیگمنٹ ہی یہی ہے۔ آپ نے عوام کو تو بہت پکایا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ لوگوں میں سے کھانا کون اچھا بناتا ہے۔''

اللہ وسایا نے اکڑ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''او بھئی عوام، ہم وزیراعظم بننا چاہتے ہیں۔ کسی کھانے پکانے کے چینل کا شیف نہیں۔ سمجھا کہ نہیں۔''

''آپ لوگ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں میں سے سب سے اچھا کون کھاتا ہے۔'' عوام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

چوہدری کی ہنسی نکل گئی اور باقی سب یہاں وہاں جھانک کر دیکھنے لگے کہ یہ عجیب سی آواز کہاں سے ابھری ہے۔ ''او جی کھانے میں تو ہمارا جواب نہیں ہے۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہم سارا ملک کھا گئے' ہاہاہا۔''

عوام نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''معلوم ہے۔ بڑی بڑی ملیں اور بڑے بڑے ادارے کھا چکے ہیں آپ لوگ۔ اب کھانا بھی کھا کر دکھ لیں۔''

شمس بلوچ ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اڑے کیا مصیبت اے' ویسے امارا بھائی ادھر ہوتا تو اچھا ہوتا۔ وہ بہت اچھا کھانا بناتا ہے۔''

بشارت کو بچت کا یہی راستہ نظر آیا۔ ''ارے میاں تو بلاؤ نا اسے۔ کہاں ہے تمہارا بھائی۔''

''لاپتہ ہے۔'' بلوچ افسوس زدہ لہجے میں بڑبڑایا۔

......☆☆☆......

گل خان، بشارت اور سائیں کچن میں اپنا اپنا سر کھپا رہے ہیں۔ گل خان بھنا کر بولا۔ ''او یارا' کیا مصیبت ہے۔ ہم وزیراعظم بننے آیا تھا۔ کھانا پکانے پر لگا دیا ہے۔''

سائیں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اڑے خان صاحب۔ بابا فکر کیوں کرتا ہے۔ ہم

بھی تو ہے نا آپ کے ساتھ۔ مل کر کچھ نہ کچھ بنا ہی لیں گے۔ کیوں بھائی میاں۔"

بشارت نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میاں کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ ویسے بھی اسمبلی میں ہم لوگ مل کر ہی کھچڑی پکاتے ہیں۔ تو یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"تو یارا' کیا پکانے کا ارادہ ہے۔" گل خان ابھی بھی الجھن میں تھا۔

"مغز فرائی پکا لیں۔" سائیں نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

بشارت نے گل خان کی طرف بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "بیکار ہے' کچھ نہیں نکلے گا۔"

"یہ تم نے امارا بارے میں کچھ بولا ہے۔" گل خان کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

سائیں نے فوراً بات بناتے ہوئے کہا۔ "نہیں خان صاحب۔ آپ بات کو اپنا اوپر نہیں لے جاؤ۔ تو پھر ایسا کرتے ہیں۔ سب سے مشکل ڈش بناتے ہیں۔"

بشارت نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "کیوں مذاق کر رہے ہو بھائی' ہم سے تو آسان ڈش نہیں بن رہی اور تم مشکل ڈش کی بات کر رہے ہو۔"

سائیں بولا۔ "ٹھیک ہے۔ پھر ایک ڈش رہ جاتا ہے سائیں۔ انڈہ ابال لیتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا یارا۔ ویسے بھی امارا عوام اتنا سالوں سے ابل ہی رہا ہے۔ آج ہم انڈہ کو عوام سمجھ کر ابال لیتا ہے۔" گل خان نے خوش ہو کر تائید کرتے ہوئے کہا۔

سائیں ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "ششش' آہستہ بولو۔"

گل خان گھبرا کر بولا۔ "کیوں۔ ڈرون حملہ ہونے والا ہے کیا۔"

"میاں ہم تو چلے کہیں اور حملہ کرنے۔" بشارت نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اڑے سائیں ہم کو اس انڈہ کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر تم وری کدھر جاتا ہے بابا۔" سائیں نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

بشارت قدرے شرماتے ہوئے بولا۔ "میں وہ' ذرا اس سے چلبل پانڈے کے بارے میں پوچھنے جا رہا ہوں۔"

"خو ہم سمجھ گیا' تم لائن مارنے جا رہا ہے...... ہے نا بھائی میاں۔ ام ٹھیک بولتی ہے کہ نہیں۔" گل خان کسی قدر بے ڈھنگے پن سے ہنستے ہوئے بولا۔

"بابا' اس چکر میں نہیں پڑو' خواہ مخواہ تمہارا پوائنٹ کم ہو جائے گا۔" سائیں نے بشارت کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یار اگر میں ان سے بات نہیں کروں گا تو پھر ان کو اس شو میں رکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ کوئی تو ان سے بات کرے۔ ورنہ اکیلی تو وہ بیچاری بور ہو جائیں گی۔" بشارت اپنے لہجے میں دنیا بھر کی ہمدردی سمیٹے ہوئے بولا۔

......☆☆☆......

سوناکشی اور پریانکا سوئمنگ پول کے پاس ٹہلتے ہوئے آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کیے جا رہی تھیں۔

"کیا خیال ہے سوناکشی۔ سوئمنگ کر لیں۔ اب تو موسم بھی گرم ہوتا جا رہا ہے۔" پریانکا نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"جانتی ہو اس وقت ہم کس ملک میں ہیں۔ ایسے سینز پر یہاں کے لوگ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے رہنے دو۔" سوناکشی اسے سمجھاتے

ہوئے بولی۔
"مگر میرا تو موڈ ہو رہا ہے سوئمنگ گا۔" پریانکا بھی بضد تھی۔
"تو پھر تمہیں اپنے رسک پر ہی سوئمنگ کرنی پڑے گی۔ تم جانتی نہیں ہو ان لوگوں کو۔ دیکھا نہیں تھا کیسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ ندیدے کہیں کے۔" سوناکشی ایک جھرجھری سی لیتے ہوئے بولی۔
بشارت وہاں آتا ہے اور خواہ مخواہ کے پوز مارنے لگتا ہے۔ پریانکا نے اس کی طرف دیکھ کر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "لو ان کی کمی تھی۔"
بشارت خوش ہو کر بولا۔ "کمی تھی نا میری۔ یہی سوچ کر تو یہاں آیا ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ ویسے میرا نام بشارت ہے اور مجھے رات کو ہی خواب میں بشارت ملی تھی کہ آپ دونوں آ رہی ہیں۔" بشارت نے اپنے گٹکے زدہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔
پریانکا اور سوناکشی نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف اور آنکھ مار کر اشارہ کیا کہ اسے بے وقوف بنانا ہے۔
سوناکشی نہایت معصومیت سے بولی۔ "ان میڈم کا سوئمنگ کرنے کا موڈ ہو رہا ہے۔"
یہ سن کر بشارت میاں سے اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ "سوئمنگ۔ تو کیجئے نا۔ اور آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ کو تیرنا نہیں آتا تو میں سوئمنگ سکھا سکتا ہوں۔"
پریانکا نے بشارت کو ہوا کے گھوڑے پر سوار کرتے ہوئے کہا۔ "اوہ واؤ۔ آپ کو سوئمنگ آتی ہے۔"
"نہیں بھی آتی تو کیا ہوا۔ آپ کے لیے آگ کا دریا پار کر سکتا ہوں۔ یہ تو پھر بھی پانی ہے۔"
بشارت نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا اور کھانسنے لگا۔
"میں سوئمنگ تو کرنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے لگ رہا ہے کہ پول کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔" پریانکا نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
بشات نے فوراً ہی جھک کر پول میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "کہاں ٹھنڈا ہے۔ نارمل ہے۔ ایسے ہی پانی میں تو سوئمنگ کا مزا آتا ہے۔ آپ اتریں نا پانی میں۔"
سوناکشی نے اسے مزید چڑھاتے ہوئے کہا۔ "صرف ہاتھ سے پتہ نہیں چلتا۔ پلیز پہلے آپ سوئمنگ کریں نا تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے۔"
"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" بشارت نے بھی مزید اکڑتے ہوئے کہا اور اندر کی طرف جانے لگا۔
پریانکا نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔ "ارے آپ کہاں چل دیئے۔"
"سوئمنگ کاسٹیوم پہننے۔" بشارت نے جواب دیا۔
سوناکشی ایک ادا سے بولی۔ "کاسٹیوم کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔"
"یعنی ایسے ہی آپ کا مطلب ہے۔" بشارت کی رال اس کی تھوڑی سے ہوتی ہوئی اس کے دامن کو داغدار کرنے لگی۔
"جی ہمارا یہی مطلب ہے۔ پہلے آپ اتریں پول میں پھر ہم۔ اور پھر تینوں۔" پریانکا نے کہا اور ہلکے سے ہنسنے لگی۔ بشارت کا یہ حال تھا کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑنے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ اور بڑی مشکل سے زمین پر اپنے پاؤں جمانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔
پھر وہ ایک شان سے چلتا ہوا پول کے کنارے پر آیا اور جھک کر دونوں لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ دونوں

نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پانی میں اترنے کو کہا اور بشارت نے آنکھیں بند کر کے پول میں چھلانگ دی۔ دونوں اس کا مذاق اڑانے لگیں اور بشارت جو ایک بالٹی پانی کے سوا کبھی پانی میں اترا بھی نہیں تھا وہ اتنے بڑے سوئمنگ پول میں ڈوبتے ہوئے غوطے لگانے لگا۔

''واہ' واہ۔ کیا ڈوبنے کا اسٹائل بنایا ہے آپ نے۔ ایسا ایکشن تو سلمان خان نے بھی نہیں کیا کبھی۔'' سوناکشی مزے لیتے ہوئے بولی۔

پریانکا نے بھی اس کی تعریف کے کنکر پھینکے۔

''بڑے ٹاپ کے سوئمر ہیں آپ تو۔''

ادھر بشارت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار پانی میں اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس پر بھی سوناکشی کو مزا آ رہا تھا۔ ''واہ۔ کیا اوپر نیچے ہو رہے ہیں۔ جیسے ڈالر کے ریٹ۔''

سوناکشی نے اب غور کیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اور گھبراہٹ کے عالم میں وہ ہندی اردو کی بجائے انگلش میں چیختے ہوئے بولی۔ ''I think he is drowning in the real''

یہ سن کر پریانکا بھی گھبرا گئی۔ ''oh my God''

''ہم تو اس کی مدد بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمیں تو سوئمنگ آتی ہی نہیں۔'' سوناکشی بے بسی سے بولی۔

''فلم میں بھی ڈمی سے کام چلاتے ہیں۔''

پریانکا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور دونوں اندر کی طرف بھاگنے لگیں۔ جبکہ بشارت میاں غوطے کھانے میں ہی مصروف رہے۔

☆☆☆......

چوہدری اور اللہ وسایا پنجہ لڑانے کا مقابلہ کر رہے ہیں جبکہ گل خان ریفری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

''چہ کوئی کو اوپر نہیں اٹھاؤ۔ قسم پہ خدا' اگر تم نے بے ایمانی کیا تو ہم تم کو دنیا سے اٹھا دے گی۔'' گل خان نے چوہدری کو الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا۔

''اوئے میرے نال متھا نہ لا۔ تُو میرے کو جانتا نئیں اے۔'' چوہدری اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور دوسری بات یہ کہ میں تیرے نال متھا نئیں پنجہ لڑا ریا واں۔'' اللہ وسایا نے پورا زور لگاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دونوں لڑکیاں گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوتی ہیں۔ پریانکا بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ ڈوب رہا ہے۔ وہ ڈوب رہا ہے۔''

''ٹائٹانک تو کب کا ڈوب گیا۔ تم کس کا ڈوبنے کا بات کر رہا ہے۔'' گل خان بے پروائی سے بولا۔

سوناکشی بولی۔ ''وہ بشارت بھائی میاں سوئمنگ پول میں ڈوب رہا ہے۔''

''تو ہم کی کریں۔ ویکھ نئیں رئی اے کہ کتنا اہم مقابلہ چل رہا ہے۔'' چوہدری نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیتے ہوئے کہا۔

''آہو جی' یا تو معاملہ ادھر یا ادھر۔ آج تو فیصلہ ہو ہی جانا چاہئے۔'' اللہ وسایا بھی بھرپور زور لگاتے ہوئے بولا۔

''مگر وہ تمہارا ساتھی ہے۔ تمہارا ملک کا ہے۔ اس کو بچانا تم لوگوں کا فرض ہے۔'' پریانکا نے انہیں غیرت دلاتے ہوئے کہا۔

''فرض کا بات نئیں کرو۔ ہم لوگ ادھر ملک کو بچانے کا واسطہ جمع ہوا ہے۔ کسی اور کو نئیں۔'' گل خان نسوار کی پچکاری مارتا ہوا بولا۔

”وہ بھی تو تمہارے ساتھ ہی یہاں جمع ہوا ہے۔“ سوناکشی نے اسے غیرت دلاتے ہوئے کہا۔
اللہ وسایا پنجہ چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ”کیوں بھئی۔ ہار مان لی۔“ چوہدری نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔
”پنجہ بعد میں لڑا لیں گے۔ پہلے اس کو تو بچا لیں۔ جیسا بھی ہے۔ ہے تو اپنا ہی سنگی ساتھی نا۔“ اللہ وسایا قومیت حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔
”ٹھیک اے مڑا۔ تم جاؤ۔ ہم دیکھتی ہے سائیں نے انڈہ ابالا کہ خود ابل گیا۔“ یہ کہہ کر گل خان کچن کی طرف بڑھ جاتا ہے۔
”چلو بھئی۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ اللہ وسایا نے سوناکشی اور پریانکا کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔
جبکہ گل خان کچن کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا کہ ”کمال اے یار...... ہم تو بولتی اسے اس کو ڈوبنے دو۔ ایک امیدوار تو کم ہوگا۔ اور عوام بھی خوش ہوگا۔“

......☆☆☆......

سوناکشی، پریانکا اور اللہ وسایا بھاگتے ہوئے سوئمنگ پول کے پاس آتے ہیں۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ سوئمنگ پول خالی تھا اور بشارت میاں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔
”اوئے کدر ہے بھائی میاں۔ پول تو سارا خالی ہے۔ کہیں وہ پانی میں رہ رہ کر مینڈک تو نہیں بن گیا۔“ اللہ وسایا نے پانی میں اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔
”میرا شاید پانی میں نیچے ڈوب گیا ہے۔“ سوناکشی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
”مگر یہاں تو نیچے تک نظر آ رہا ہے، اور اس پول میں تو شارک مچھی بھی نہیں ہے جو اس کو کھا گئی ہوگی۔“ اس بار اللہ وسایا نے پانی کی بجائے سوناکشی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”تو پھر وہ گیا کہاں؟“ پریانکا بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔

......☆☆☆......

بشارت میاں اوندھے لیٹا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور سائیں مولا بخش اس کی دونوں ٹانگیں ہینڈ پمپ کی طرح چلا کر اس کے پیٹ سے پانی نکال رہا ہے۔ اُوکی آواز کے ساتھ بشارت میاں کے منہ سے کافی سارا پانی نکل جاتا ہے اور اسے ہوش آنے لگتا ہے۔
”اڑے بابا۔ تم سوئمنگ پول میں کیا کر رہا تھا۔ سارا پانی میلا کر دیا نا پول کا۔“ سائیں نے اسے ہوش میں آتا دیکھ کر ٹوکا۔
بشارت اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ڈوب رہا تھا اور کیا کر رہا تھا۔ اب سوئمنگ پول میں کوئی کرکٹ تو کھیلنے سے رہا۔“
”مگر ایسا کیا بات ہو گیا کہ تم ڈوب کر اپنا جان دینے پر تیار ہو گیا۔ ابھی تو تم مقابلہ ہارا بھی نہیں ہے۔“ مولا بخش پریشان لہجے میں بولا۔
بشارت تھوڑا شرمندہ ہونے کی ناکام کوشش کرتا ہوا بولا۔ ”بس یار وہ دونوں ہیروئنیں ہیں نا، انہوں نے فرمائش کر دی تھی۔“
”انہوں نے فرمائش کر دیا اور تم فرمائشی طور پر ڈوبنے کے لیے کود گیا، تم کو تیرنا آتا ہے۔“ سائیں نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔
”ارے سائیں۔ اگر مجھے تیرنا آتا تو ڈوبتا ہی کیوں۔“ بشارت نے سائیں کی عقل پر لٹھ مارتے ہوئے کہا۔

''اڑے چریا۔ جب تم کو تیرنا نہیں آتا تو پانی میں کودا کیوں؟'' سائیں اپنا حساب پورا کرتے ہوئے بولا۔

بشارت نے ایک بار پر شرمانے کی کوشش کی مگر اس چکر میں وہ عجیب ہونق سا لگنے لگا تھا۔ ''وہ میں سمجھا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ' سوئمنگ پول میں' سمجھ رہے ہونا۔''

''ہم تو سمجھ رہا ہوں بابا' مگر تم ان دونوں کو نہیں سمجھ سکا ہے' شکر کرو۔ ہم تمہارے کو ابلا ہوا انڈہ کھلانے آیا اور تم کو پانی میں دیکھ کر بچالیا' نہیں تو شام کو اسی پانی سے تم کو آخری غسل دیتا ہم لوگ۔'' سائیں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

''سائیں آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری جان بچالی۔'' بشارت کا لہجہ ممنونیت سے بھرا ہوا تھا۔

''اب یہ ایک انڈہ بچا ہے' کھانا ہے تو کھاؤ' نہیں تو یہ بھی جاتا ہے میرے پیٹ میں۔'' سائیں نے اس کی آنکھوں کے سامنے انڈہ یوں لہرایا جیسے دشمن کے آگے ہتھیار لہرا رہا ہو۔

''سائیں' اگر میرے کوٹے میں یہ ایک انڈہ ہے تو یہی سہی۔'' یہ کہہ کر بشارت نے جلدی سے انڈہ جھپٹ لیا اور ظاہر ہے دوسرے ہی لمحے وہ اس کے منہ کے راستے پیٹ میں اتر چکا تھا۔

......☆☆☆......

سب امیدوار لاؤنج میں جمع تھے اور خفیہ اسپیکر سے بگ عوام کی آواز ابھر رہی تھی۔ ''اب آپ سب کے درمیان انتاکشری کا مقابلہ ہوگا' عوام دیکھنا چاہتی ہے کہ ان کے مستقبل کا ہونے والا وزیراعظم کتنا سریلا ہے' اس کے لیے آپ کی چار چار کی ٹیم بلیک اور ٹیم ویری بلیک بنا دی گئی ہے۔ اور دونوں ہیروئنیں آپ کو لیڈ کریں گی' کسی کو کوئی اعتراض۔''

''کوئی اعتراض ہوگا بھی تو آپ کو کیا فرق پڑے گا۔'' بشارت منہ بسورتا ہوا بولا۔

''مڑا دیکھ لو' ہم سب کائر دیکھ لو' بس ایک بار وزیراعظم بن جائے پھر دیکھنا عوام کا بانسری کیسا بند کرتی ہے۔'' گل خان نسوار کی تازہ چٹکی لگاتا ہوا بولا۔

''او خان بھائی آہستہ بولو' عوام کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' چوہدری نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا اور گل خان جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتا ہے۔

''اسٹارٹ عوام خود کرتی ہے۔ پھر آپ نے باری باری اپنا گانا سنانا ہے' (گاتے ہوئے) پبلک ہے۔ یہ پبلک ہے سب جانتی ہے۔ یہ پبلک ہے' ارے اندر کیا' ارے باہر کیا ہے سب پہچانتی ہے۔ یہ پبلک ہے۔'' عوام نے مقابلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹیم بلیک۔ حرف ی سے گانا ہوگا۔''

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جیسے مشورہ کر رہے ہوں۔ پریا نکا گانا شروع کرتی ہے اور سب ایک ساتھ شروع ہو جاتے ہیں۔ ''یہ شام مستانی' پیو اور جیئے جا۔''

''خاموش' اس شو میں چائے پانی' دودھ اور کولڈ ڈرنک کے علاوہ باقی ہر ڈرنک منع ہے' وہ آپ لوگ یہاں سے باہر نکلنے کے بعد پی سکتے ہیں' حرف الف'' اسپیکر سے عوام کی آواز ابھری۔

''الے۔ مہنجا مارویڑا' مہنجا جوگیڑا' مارویڑا مٹھڑا مہنجا۔ مارویڑا لاہوتی مہنجا' الے مہنجا مارویڑا۔'' سائیں نے بغیر بریک کے گانا شروع کیا اور خود ہی لہکنے بھی لگا۔

یہ دیکھ کر بشارت کو بھی جوش آنے لگتا ہے۔

''اینا مینا ڈیکا' رم پم پوش' رم پم پوش۔''

سونا کشی سب کو ایک نظر دیکھتی ہے اور ایک ادا کے ساتھ لچکتے ہوئے گانا شروع کرتی ہے۔ ''بابو جی ذرا دھیرے چلو' بجلی کھڑی یہاں بجلی کھڑی۔''

''یہ بجلی بیچ میں کہاں سے آ گئی۔'' عوام نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''اوئے عوام' اوئے تیرے کو تو خوش ہونا چاہیدا اے' تیرے گھر میں نہ سہی' اس حسینہ دے گانے میں تو بجلی ہے نا۔'' چوہدری' سونا کشی کے گانے سے زیادہ اس کے لچکنے کا لطف لیتے ہوئے بولا۔

اور پھر اسی طرح کافی دیر تک یہ بے معنی مقابلہ چلتا رہا۔ تب تک جب تک کہ عوام کو یہ لوریاں سن سن کر نیند نہ آ گئی۔

......☆☆☆......

رات کافی بیت چکی تھی۔ اور سب کو نیند کی دیوی اپنی آغوش میں لینے کے بے تاب ہو رہی تھی۔ سائیں اپنی رلی اٹھا کر لان میں نکل آیا اور ایک بینچ پر رلی اوڑھ کر سو گیا۔

گل خان لان میں ایک کرسی پر بیٹھ کر نسوار کی چٹکی منہ میں ڈال ہی رہا تھا کہ نیند کی دیوی نے اسے اچانک یوں اپنی گود میں لے لیا جیسے موت کا فرشتہ کسی کی روح قبض کرتا ہے۔ اور اب منظر یہ تھا کہ نسوار کی چٹکی ہونٹوں کے قریب تھی اور گل خان دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

اللہ وسایا اور چوہدری گھاس پر ایک دوسرے میں ضم ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوئے ہوئے تھے اور کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اللہ وسایا کا سر کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور چوہدری کی ٹانگیں کہاں ختم ہو رہی ہیں۔

جبکہ شمس بیڈ روم کا دروازہ لاک کر کے ایسے سو رہا تھا جیسے اسے کسی بیرونی حملے کا خدشہ ہو۔

وہاں پریانکا اور سونا کشی پرندوں کے لیے بنے ہوئے بڑے سے پنجرے میں تالا لگا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

بشارت میاں صوفے پر سونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے لیٹا ہوا تھا۔ پھر وہ اٹھتا ہے اور دبے پاؤں ایک ایک جگہ سب کو دیکھتا ہوا باہر کی طرف آتا ہے۔ اسے ایک طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے ہنسنے کی آوازیں آتی ہیں اور اس کی بتیسی نکل آتی ہے۔ وہ جلدی سے آوازوں کی طرف بڑھتا ہے مگر یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ لڑکیاں پنجرہ بند کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ سونا کشی اور پریانکا اسے دیکھ کر اسے زبان چڑاتی ہیں۔ بشارت تالے سے زور آزمائی کرتا ہے اور مایوس ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھے بیٹھے ہی پنجرے سے ٹیک لگا کر سو جاتا ہے۔

......☆☆☆......

صبح ناشتے کے بعد سب ہی لاؤنج میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ سائیں سب کو چڑاتے ہوئے کہتا ہے۔ ''اڑے بابا۔ کل تو ہم نے میلہ لوٹ لیا۔''

''او بھئی۔ ہم تو روزانہ بیان دیتے ہیں کہ لوٹنے میں آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔'' چوہدری نے اپنی طرف سے اس کی بھرپور عزت افزائی کرتے ہوئے کہا۔

''خو یہ کون سا میلہ کا بات کرتی ہے۔'' گل خان کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''میلہ اور نوٹوں کا تھیلہ' ان کے لیے معمولی بات ہے بھئی۔'' چوہدری نے پھر وار کرتے ہوئے کہا۔

''غلام فرید میں تے ایویں جیویں وچھڑی کونج قطاراں۔'' اللہ وسایا کو کچھ اور نہ سوجھا تو بابا فرید کو ہی بیچ میں لے آیا۔

''میاں آپ کونج بیچاری کو بیچ میں کیوں لا رہے ہیں اور رہی قطار کی بات تو یہ سب کونجوں کے ہی نخرے ہیں۔ ہم پاکستانیوں کو کبھی کسی بات کے لیے قطار میں دیکھا ہے کبھی۔'' بشارت کو بھی کہنے کا موقع مل ہی گیا۔

''اڑے او تم تو ایسا بولتا پڑا ہے جیسے تم دودھ کا نہایا ہوا ہے۔'' شمس تپ کر بولا۔

''اللہ کے فضل و کرم سے میں روزانہ نہاتا ہوں اور جب پانی نہیں ملے گا تو بندے کو دودھ سے ہی نہانا پڑتا ہے۔'' چوہدری اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''آپ لوگوں میں اتنا اختلاف کیوں ہے۔'' پریانکا نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

''اس لیے کہ ہم سے کسی نہ کسی کو حزبِ اختلاف میں جو رہنا ہوتا ہے۔'' شمس کی سمجھ میں تو اس وقت یہی جواب آیا تھا۔

'آپ کو پتہ ہے یونٹی یعنی اتحاد میں کتنی طاقت ہے۔'' سوناکشی نے بھی اپنے طور پر انہیں کچھ غیرت دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اس کی طاقت ہم گزشتہ الیکشن میں دیکھ چکے ہیں۔'' چوہدری منہ بنا کر بولا۔

''میاں شہیدِ ملت نے فرمایا تھا کہ پاکستانی قوم ایک مٹھی کی طرح ہے۔''

''مٹھی سمجھتا ہے ناں مٹھی۔ بابا مکہ، مکہ تو سمجھتا ہے نا گھونسہ۔'' سائیں بشارت کے فرمان کی تشریح کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں مگر یہ اور بات ہے کہ تم لوگوں کا مکہ خود تمہارے ہی لوگوں کو ناک آؤٹ کر رہا ہے۔'' پریانکا نے ہنس کر کہا۔

''اللہ کے فضل و کرم سے اس بار ہماری حکومت بننے دیں، ہم ایک ایک لٹیرے کو انصاف کے کٹہرے میں لے آئیں گے۔'' چوہدری نے سینے پر ہاتھ مارا اور نتیجتاً اسے کھانسنا بھی پڑا۔

''سوائے اپنے۔'' بشارت نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''او بھائی میاں، میرے متھے نہ لگا کر۔'' چوہدری نے بشارت کو غصے سے دیکھ کر کہا۔

''مجھے تمہارے متھے لگنا بھی نہیں ہے، کیونکہ مجھے مصنوعی فصل سے ویسے بھی الرجی ہے۔'' بشارت، چوہدری کے مصنوعی بالوں کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''پاجی آپ انصاف کے کٹہرے کی بات کر رہے تھے۔'' اللہ وسایا بھی بیچ میں کود پڑا۔

''اڑے بابا۔ بات ہی کر رہے تھے نا، انصاف تو نہیں کر رہے تھے۔'' سائیں نے اپنی دانست میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور امارا ادھر انصاف کا صرف بات ہی ہوتا ہے، کبھی جلسہ میں تو کبھی پارٹی کا نام رکھ کر، ہوتی کیا ہے، کچھ نہیں۔'' گل خان نے ایک کونے میں نسوار کی پچکاری کا ڈرون حملہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ آپ کے ہر حکمران پر لوٹ مار کا الزام لگتا ہے، کیا تمہارے کنٹری میں کوئی ایماندار آدمی نہیں بچا۔'' سوناکشی حقیقت میں حیران تھی کہ یہ کیسی قوم ہے۔

''ہم مسلمان ہیں۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا حق فرمایا۔'' اس بار بشارت میاں نے دین کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

''او بھائی میاں۔ اس لوٹ مار میں ایمان اور اللہ کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ او کج ہوش دے ناخن کر۔'' چوہدری کو بھی غصہ آ گیا۔

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جیسی قوم ہوتی ہے۔ ہم ویسے ہی حکمران نازل کرتے ہیں۔'' بشارت نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے؟'' پریانکا اپنے رسیلے ہونٹوں پر قاتل مسکان سجاتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ جیسی عوام ہے۔ ویسے ہی حکمران مل رہے ہیں'' بشارت کچھ زیادہ ہی موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

''اس لیے میں تو کہتا ہوں سائیں کہ حکمرانوں کو گالی دینے سے پہلے تھوڑا اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔'' سائیں نے اپنی قمیص کے بٹن کھول کر اپنے گریبان میں جھانکتے ہوئے کہا۔

......☆☆☆......

سب لان میں جمع تھے اور جھاڑیوں میں چھپے اسپیکر سے بگ عوام کی آواز ابھر رہی تھی۔ ''آپ کو 23 مارچ کے حوالے سے تقریر کرنی ہے تو سب سے پہلے کون آگے آتا ہے۔''

''23 مارچ؟'' لان میں بھنبھناہٹ سی ابھری اور سب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

''ول تریویھ مارچ کو کیا ہوا تھا۔'' اللہ وسایا نے حیرانی سے پوچھا۔

''کم از کم ہم تو نہیں ہوا تھا۔'' گل خان نے قومی شناختی کارڈ نکال کر اس میں لکھی تاریخ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''بابا کچھ نہ کچھ تو ہوا تھا' جب ہی تو عوام نے اس تاریخ کے بارے میں تقریر کا بولا ہے۔''

سائیں بھی مخمصے کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''اللہ کے فضل و کرم سے مجھے 23 مارچ کے بارے میں معلوم ہے۔'' اتنے سنجیدہ ماحول میں چوہدری کی فاخرانہ آواز ابھری اور سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''اڑے او۔ تم کو کیا معلوم ہے۔'' شمس حیرت سے بولا۔

''مینوں معلوم ہے کہ 23 مارچ کو چھٹی ہوتی ہے۔'' چوہدری نے بہت بڑے قومی راز کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''او خو تو ایسا بولو نا کہ چھٹی پر تقریر کرنا ہے۔'' گل خان ماتھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔ ہاتھ کچھ زیادہ زور سے لگ گیا تھا اس لیے گل خان کو اسے کچھ دیر کے لیے سہلانا بھی پڑا۔

''23 مارچ میرے لیے بھی بہت اہم ہے۔'' پریانکا نے کہا۔

''23 مارچ ہماری قومی تاریخ ہے۔ آپ کے لیے اہم کہاں سے ہو گئی۔'' بشارت نے حیرت سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''23 مارچ کو میری فلم ریلیز ہونی ہے۔'' پریانکا اس کی حیرت دور کرتے ہوئے بولی۔

''اور 23 مارچ کو میری ایک فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔'' سوناکشی نے بھی اس تاریخ کے حوالے سے اپنی مصروفیت بتا دی۔

تیئیس مارچ کے حوالے سے سب کی ناقص معلومات پر بشارت کو غصہ آ گیا اور وہ چیخ کر بولا۔ ''خاموش' کیا ہوا گیا ہے آپ لوگوں کو' آپ لوگ 23 مارچ کے بارے میں نہیں جانتے' شرم آنی چاہیے آپ سب لوگوں کو۔''

''اڑے بابا۔ اگر تم کو معلوم ہے تو تم ہی شروع

کرونا پھر۔'' سائیں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بشارت ہکلانے لگا۔ ''مم میں، میں......''

''مڑا اس کا مطلب ہے اس کو بھی نہیں معلوم۔'' گل خان کو اس کا مذاق اڑانے کا موقع مل گیا تھا۔

''بس یہ معلوم ہے اور ہلکا ہلکا سا یاد آ رہا ہے کہ 23 مارچ کو لاہور میں کچھ ہوا تھا۔'' بشارت اپنی یادداشت کے آخری کناروں تک کو کھنگالتے ہوئے بولا۔

یہ سن کر سب چونک گئے اور چوہدری کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر چوہدری گھبرا گیا۔ ''او نئیں ایمان نال، میں نے کج نئیں کیتا' اے سراسر الزام اے میرے تے۔''

عوام نے خود ہی ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب کی معلومات کے لیے عوام آپ کو بتاتی ہے کہ 23 مارچ کو پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی۔''

یہ سن کر سائیں سوچ میں پڑ گیا۔ ''اس وقت ہم اسمبلی میں تھا یا نہیں۔''

''اوئے ہم تو شاید واک آؤٹ پر تھے۔'' چوہدری بھی اپنی یادداشت کو کھنگالتے ہوئے بولا۔

''اور ہم ناراض۔'' شمس نے مختصر سا جواب دیا اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

''رہنے دیں۔ عوام کو معلوم ہو چکا ہے کہ 23 مارچ کے بارے میں آپ سب کتنا کچھ جانتے ہیں۔'' پریانکا نے تپ کر کہا اور سب کی جان میں جان آ گئی۔ اور ان کے چہروں پر طمانیت جھلکنے لگی۔

......☆☆☆......

اللہ وسایا لاؤنج میں بیٹھا نیا صوبہ نیا صوبہ کا سبق یاد کر رہا ہے۔ سونا کشی اس کے قریب آتی ہے۔ ''سنئے۔''

''سن رہا ہوں۔ بکدی جا۔'' اللہ وسایا مدرسے کے بچے کی طرح ہل ہل کر سبق یاد کرتا ہوا بولا۔

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' سونا کشی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے مالش والا دھندا چھوڑ دیا ہے۔'' اللہ وسایا کا پورا دھیان اپنے سبق پر تھا۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ مجھے ٹیبلیٹ لا دیں گے۔'' سونا کشی تپ کر بولی۔

''کیوں، میں تیرے ابے کا ملازم ہوں۔'' اللہ وسایا اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بالی ووڈ کی سپر اسٹار ہوں۔ کنگ خان کی ہیروئن ہوں۔'' سونا کشی نے اترا کر اپنے بال جھٹکے۔

''میں جانتا ہوں کہ بالی ووڈ میں میرا کوئی چانس نہیں ہے۔ اس لیے تم کنگ خان کی ہیروئن ہو یا پینے والی، مینوں کیا فرق پڑتا ہے۔'' اللہ وسایا بے پروائی سے بولا۔

''عیب بدتمیز ہیں آپ بھی۔'' سونا کشی نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور پلٹ کر جانے لگی۔ اللہ وسایا کچھ سوچ کر اسے آواز دیتا ہے۔ ''اچھا، اچھا رکو۔''

''اب کیا ہے۔''

''میں آپ کا کام کر دیتا ہوں، آپ میرا کام کر دیں۔'' اللہ وسایا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جلدی بولو۔''

''تم کسی طریقے سے چوہدری کو بے وقوف بناؤ۔ میں موبائل پر تم دونوں کی مووی بنا کر نیٹ پر

اپ لوڈ کر دوں گا۔'' ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اللہ وسایا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''اوہ۔ واؤ' کیا آئیڈیا ہے' لیکن مجھے کیا ملے گا۔'' سونا کشی اپنی الجھن بتاتے ہوئے بولی۔

''جو تم چاہو اور یہ میرا وعدہ ہے کہ جیسے ہی میں وزیراعظم بنوں گا۔ تم کو اس ملک کی سب سے وی وی آئی پی پرسنالٹی کا درجہ مل جائے گا۔'' اللہ وسایا نے اسے اس سیڑھی پر چڑھاتے ہوئے کہا جسے اس نے خود بھی نہیں دیکھا تھا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ وی وی آئی پی۔ واؤ۔'' سونا کشی خود کو اسٹیٹ گیسٹ کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

''یہ ایک ہونے والے وزیراعظم کا وعدہ ہے۔'' اللہ وسایا ہاتھ آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

''اوکے تو پھر ڈن ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سونا کشی نے اللہ وسایا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجائی۔

......☆☆☆......

چوہدری لان میں ٹہل رہا ہے اور اسے سونا کشی اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو وہ خواہ مخواہ کی پوزنگ کرنے لگتا ہے۔ سونا کشی اس کے قریب آ کر مسکرانے لگتی ہے۔

''او جی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کسی ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار میں کام مل گیا ہے۔ ہیں نا۔'' چوہدری نے اپنی دانست میں عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں جی۔ میں تو یہاں صرف آپ کی دل پشوری کرنے آئی ہوں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ مجھے دل لاہوری کہنا چاہیے تھا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔'' سونا کشی ایک ادا سے اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''نا جی۔ نا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر چوہدری ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ''لیکن کسی اور کو اعتراض نہ ہو۔''

''دوسروں سے ہمیں کیا لینا۔ جب پیار کیا ہے تو بدنامی سے کیسا ڈرنا۔'' یہ کہہ کر سونا کشی اپنے موبائل پر منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیے کا گانا لگا کر ڈانس کرنے لگتی ہے اور چوہدری خود کو سلطان راہی سمجھنے لگتا ہے۔ جبکہ اللہ وسایا باڑ کے پیچھے سے چھپ چھپ کر موبائل سے ان کی مووی بنانے لگتا ہے۔

......☆☆☆......

سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے۔ چوہدری لیپ ٹاپ اٹھائے غصے سے آگ بگولہ ہوتا ہوا وہاں آتا ہے۔

''یہ سازش ہے' سراسر سازش ہے میرے خلاف۔''

''قسم پہ خدا تمہارا کمرے میں ہیروئن کا تھیلی ہم نے نہیں رکھی۔'' گل خان نے گھبرا کر اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں سائیں۔ ہم نے بھی کچھ نہیں کیا' اور ہم تو ویسے بھی فرینڈلی اپوزیشن کو ویل کم کرتے ہیں۔'' سائیں نے بھی اپنی صفائی دے دی۔

چوہدری غصے سے شمس کو گھور کر دیکھتا ہے تو وہ منہ پھیر کر کہتا ہے۔ ''اڑے ہم سے تو بات ہی نہیں کرو۔''

''کیوں؟۔ تیرے نال بات کیوں نہ کروں' تم نے چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔'' چوہدری بھنا کر بولا۔

''ہم ناراض ہوں۔'' یہ کہہ کر شمس پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

''او یار اک تے تیری ناراضگی نے اوکھے میں ڈال دیا ہے' یہ ضرور اس سرائیکی کی سازش ہے۔ یہ

ہی میرے خلاف ہے۔ یہی میرے سے کچھ نہ کچھ مانگتا رہتا ہے۔ کچھ اور نہیں سوجھا تو صوبہ ہی مانگ لیا۔ منگتا کہیں کا۔'' چوہدری نے اپنی توپ کا رخ اللہ وسایا کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''اوئے، میں تیرے خلاف نہیں، تیرے صوبے میں رہنے کے خلاف ہوں۔'' اللہ وسایا بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

''مگر سائیں۔ ہوا کیا ہے۔ جو تم اتنا شور کر رہا ہے۔ کیا کسی نے تمہارا بستر پہ کھجلی والا پوڈر چھڑک دیا ہے۔'' سائیں کو تشویش ہونے لگی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

''یہ دیکھو، کسی نے موبائل پر میری مووی بنا کر نیٹ پر اپ لوڈ کر دی ہے۔'' چوہدری نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سائیں کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

''خو۔ اس میں تو یہ دبنگ ہیروئن ہے، تم اس کو کیوں نہیں پوچھتی۔'' گل خان نے بھی جھانک کر دیکھا اور اپنی رخ سونا کشی کی طرف کر دیا۔

''اوئے۔ ڈبنگنی ...... تم نے یہ حرکت کیوں کی۔'' چوہدری پنجابی فلموں کے ویلن کی طرح دھاڑتا ہوا بولا۔

''میرا دماغ مت خراب کرو، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔'' سونا کشی نے ہوائی مکھی اڑاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم میرے ساتھ گانا کیوں گا رہی تھیں۔ منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیے۔'' سونا کشی کا لہکنا یاد کر کے چوہدری بھی لاشعوری طور پر لہکنے لگا۔

''مگر سائیں۔ ادھر تو منی کی بجائے چوہدری بدنام ہو رہا ہے۔ (گاتے ہوئے) چوہدری بدنام ہوا۔ یار و نیٹ کے ذریعے۔'' سائیں کو تو جیسے اس کا مذاق اڑانے کا ایک نادر و نایاب موقع مل گیا تھا۔

''اوئے میں کہتا ہوں یہ ڈبنگنی شامل ہے اس سازش میں۔'' چوہدری کا شک اب بھی پوری طرح سے سونا کشی پر ہی تھا۔

اللہ وسایا نے سونا کشی کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مس دبنگ، تہاڈی بڑی مہربانی ہوگی، اگر ایک کپ چائے اور پلا دو۔''

''خو۔ ہم کو بھی پلانا، مگر چینک میں۔'' گل خان نے اپنی پخ بھی بیچ میں اڑا دی۔

سونا کشی اٹھ کر کچن میں آتی ہے۔ چوہدری بھی اس کے پیچھے پیچھے آ جاتا ہے۔ لیپ ٹاپ اس نے بغل میں دبا رکھا ہے۔ سونا کشی کیتلی میں پانی بھر کر چولہے پر رکھتی ہے۔ مگر چوہدری کیتلی کا پانی بیسن میں بہا دیتا ہے۔

''کوئی چائے وائے نہیں بنے گی، یہ چوہدری کا آرڈر ہے۔''

باہر سب چوہدری کا مزا لے رہے تھے۔ اللہ وسایا نے آواز لگاتے ہوئے کہا۔ ''سونا کشی۔ ڈرنا نہیں، مستقبل کا ہونے والا وزیر اعظم تمہارے ساتھ ہے۔ ڈٹ جاؤ۔''

''چائے تو بنے گی۔ اور ضرور بنے گی۔ کوئی بات نہیں میں دوبارہ پانی بھر لیتی ہوں۔'' سونا کشی نے بھی اپنے ڈھیٹ پنے کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

سونا کشی دوبارہ پانی بھرتی ہے اور اس میں چائے کی پتی ڈالتی ہے۔

''لو اب چائے کی پتی کا بھی نقصان کرنا پڑے گا۔'' چوہدری کو پانی سے زیادہ پتی کے ضائع ہونے کا افسوس ہو رہا تھا۔

''تو مت کرو، چلو پیچھے ہٹو۔'' یہ کہتے ہوئے سونا کشی نے چوہدری کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف کیا اور پھر کیتلی چولہے پر رکھ دی۔

''ہاتھ مت لگانا' ہاتھ مت لگانا۔ ورنہ''
چوہدری نے پرزور انداز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا اور اپنے بازو پر ہاتھ پھیر پھیر کر چومنے لگا۔
''ورنہ یہ تم لوگوں کا سب سے پرانا نعرہ ہے' ورنہ کیا کرلو گے۔'' سوناکشی بھی تنگ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔
''میں بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ بولو تو۔'' اس سے پہلے کہ چوہدری اپنے کسی ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہناتا' عوام کی آواز نے اسے پاجامہ پہنادیا۔
خواتین کا احترام کیا جائے' اور خاص طور سے ان امپورٹڈ میموں کا' ورنہ تمہارے خلاف میموں کا کمیشن بن سکتا ہے۔''
''اوئے بس یہی سوچ کر تو لحاظ کر رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی چوہدری کے خلاف ہی کمیشن بٹھا دے۔'' چوہدری اب بھی بھنایا ہوا تھا۔
سوناکشی نے دوبارہ ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہٹو بھی۔ چائے بنانے دو۔ یہ ایکشن بازیاں پھر کبھی دکھالینا......''
''بابا جلدی بناؤ' ہم کو بھی طلب ہو رہا ہے۔''
سائیں نے کچن میں جھانکتے ہوئے کہا۔
''ہاتھ مت لگا' نی کڑیے۔'' چوہدری' سوناکشی کے ہاتھ کے لمس کا مزا لیتے ہوئے بولا۔
''مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے کیچڑ میں ہاتھ خراب کرنے کا۔'' سوناکشی نے بے پرواہی سے کہا۔
''تو پھر میرے اوپر کیچڑ کیوں اچھالا''
چوہدری نے ایک ہاتھ سے اپنے کرتے کو یوں جھاڑا جیسے واقعی میں اس کے کپڑوں پر کسی نے کیچڑ اچھال دیا ہو۔
''اوخو کیوں جھوٹ بولتی ہے' تمہارا کپڑا تو ایک دم صاف ہے۔'' گل خان بھی بڑے غور سے اس کے کپڑوں کو دیکھ رہا تھا۔
''اوئے میرے کریکٹر پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔''
چوہدری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
شمس نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا' تمہارا کوئی کریکٹر بھی ہے۔ لوز کریکٹر۔''
''دیکھو بلوچ بابا اب تم میرے متھے مت لگو۔''
چوہدری سوناکشی کے بڑھتے ہوئے حمایتیوں سے پریشان ہو رہا تھا۔
''ہمیں لگتا ڑے' ہم ناراض ہوں۔'' شمس نے کہا اور منہ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور چوہدری بیچارہ تپ کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارنے کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکا۔
سوناکشی چولہا جلاتی ہے۔ چوہدری بجھا دیتا ہے۔ تھوڑی دیر تک ان دونوں میں یہ کھیل چلتا رہتا ہے۔ پھر سوناکشی چولہے کے بٹن پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔
''اگر میرے ہاتھ کو ہاتھ لگایا نا تو میں عوام سے تمہاری شکایت کردوں گی۔ تم بھی چائے پیو گے۔''
''بھاڑ میں جائے۔'' چوہدری چلا کر بولا۔
''کون' عوام یا چائے۔'' بشارت کو بولنے کا موقع مل ہی گیا تھا۔
شور کی آواز سن کر پریانکا بھی سوناکشی کی مدد کے لیے آجاتی ہے اور چوہدری کو جھاڑنے لگتی ہے۔ ''اے کیا بدتمیزی ہے۔ تمہیں لڑکیوں سے بات کرنی نہیں آتی' چلو ہٹو یہاں سے بے شرم کہیں کے۔''
''کہیں کا نہیں جی' یہیں کا ہوں۔''
سوناکشی محبت بھری نظروں سے چوہدری کی طرف دیکھتی ہے اور ایک ادا کے ساتھ دل لبھانے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوتی ہے۔ ''آپ

کہیں تو ایک کپ آپ کے لیے بھی بنادوں۔"
اس کے یہ انداز تو جیسے چوہدری کو دیوانہ سا کر گیا تھا۔
"آپ نے اتنی محبت سے کہا ہے جی۔" چوہدری ریشہ خطمی لہجے میں بولا۔
"ہاں جی۔"
"پھر تو زہر بھی پی لوں گا۔"
"ابھی تو Available نہیں ہے۔ اس شو کے بعد عوام خود ہی تمہیں دے دے گی۔" سوناکشی نے یہ کہتے ہوئے چولہا جلا دیا۔

......☆☆☆......

(رات آہستہ آہستہ اپنے پیر پھیلانے لگی تھی۔ سب ہی لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اتنے میں گل خان غصے سے لال پیلا اور نیلا سفید ہوتا ہوا لاؤنج میں آتا ہے۔
"یہ سازش ہے مڑا۔۔۔ بہت بڑا سازش ہے۔" گل خان نے چیختے ہوئے کہا اور سب ہی چونک کر اسے دیکھنے لگتے ہیں۔
"کیا ہوا خان صاحب' کیوں کڑک مرغی کی طرح شور کر رہے ہو۔" سائیں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"اوئے کسی نے ہمارا دماغ کو ماؤف کرنے کے لیے بہت بڑا سازش کیا ہے۔" گل خان نے اپنا گھٹنا کھجاتے ہوئے کہا۔
"پتہ نہیں تم نے کس چیز کا نام دماغ رکھ دیا ہے۔" بشارت اپنا سر کھجاتے ہوئے معصومیت سے بولا۔
"کچھ بتاؤ بھی سہی خان صاحب' ایسے شور کرنے سے آپ کے خلاف ہونے والی سازش رک تو نہیں جائے گی۔" اللہ دسایا کو لگ رہا تھا کہ کہیں اس سازش میں را یا افغانستان کی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ نہ نکل آئے۔
"خوچہ کسی نے ہمارا نسوار کا ڈبی چوری کر لیا ہے۔" گل خان نے صدی کا سب سے بڑا راز فاش کرتے ہوئے کہا۔
"نسوار کی ڈبی۔" سوناکشی حیرت سے اپنی ہی آنکھوں میں ڈوبی جا رہی تھی۔
"وہ تو آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے کہنے پر باہر پھینک دی تھی کہ آج کے بعد نسوار نہیں کھاؤں گا۔" پریانکا نے گل خان کی یادداشت پر دو ہتھوڑ مارتے ہوئے کہا۔
گل خان زور سے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "خدائے پہ امان' ہمارا دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔"
اس سے پہلے کہ یہ معنی خیز بحث کچھ اور طول پکڑتی اسپیکر سے بگ عوام کی آواز ابھری۔
"اٹینشن پلیز' ہمارا نیکسٹ سیگمنٹ ہے۔ نچ لے۔"
"تے نچ لے۔ ساتوں کی۔" چوہدری لاپرواہی سے بولا۔
"اس نچ لے میں آپ کے دو گروپ بنیں گے۔" عوام نے چوہدری کی بات کو ردی کی ٹوکری میں ٹھونستے ہوئے کہا۔
"گروپ بنے گا؟۔ یعنی ادھر بھی گروپ بازی ہوئے گا۔" شمس بولا۔
"ہاں۔۔۔ آپ لوگ کوئی کام تو مل کر کر لیا کریں۔ اور ہر گروپ میں ایک ایک لڑکی ہوگی' آپ لوگ تیار ہو جائیں۔" عوام نے کہا۔
اور جلدی ہی دو گروپ آمنے سامنے آگئے اور ظاہر مقابلہ تھا کہ کون کس کے مقابلے میں حد سے

زیادہ بے ڈھنگا ناچ سکتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ کوئی کام ڈھنگ سے کر سکتے تو عوام کو اتنا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔

.......☆☆☆.......

سب لان کی گھاس پر نیم دراز تھے۔ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ یہ گھاس بھی قوم کے لیے نہ چھوڑیں، لیکن ابھی تو انہیں یہ مقابلہ جیتنا تھا اس لیے گھاس عوام کی شکر گزار تھی۔اور کسی گملے میں لگے اسپیکر سے عوام کی آواز آرہی تھی۔

''اب آپ سب کے درمیان Stand up کامیڈی کا مقابلہ ہوگا۔''

''اسٹینڈ اپ کامیڈی ہی کیوں سائیں؟'' سائیں نے بغیر سوچے استفسار کیا۔

''کیونکہ آج تک تم لوگوں نے مختلف بہانوں سے عوام کو مختلف لائنوں میں کھڑا رکھا ہے۔اب وقت آگیا ہے کہ عوام تم لوگوں کو کھڑا کرے۔'' عوام نے جواب دیا۔

''الیکشن میں کئی بار کھڑے ہو چکے ہیں۔ بلکہ کچھ مال مل جانے کے بعد بیٹھ بھی چکے ہیں۔'' بشارت اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''جو سیگمنٹ ہے وہ تو پورا کرنا ہی ہوگا۔ورنہ تم لوگ جانتے ہو کہ اب الیکشن کمیشن بھی آزاد ہوتا جا رہا ہے۔'' عوام نے انہیں ڈراتے ہوئے کہا۔

''چہ ہم تقریر کے لیے کھڑی ہوتی ہے تو لوگوں کو آٹومیٹک کامیڈی لگتی ہے۔ام سیریس بات بولتی ہے اور لوگ ہنستی ہے۔'' گل خان اپنی کامیڈی کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

''چلیں ٹھیک ہے، تو وہ مقابلہ کرواتے ہیں جو آپ کا پرانا کام ہے۔'' عوام نے سیگمنٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''او یار اس کو ہمارے پرانے کام کے بارے میں کس نے بتا دیا۔ چوہدری گھبرا کر بولا۔

''پتہ نہیں۔ میں تو ادھر ہی ہوں۔ تمہارے ساتھ۔'' اللہ وسایا نے اپنا دامن جھاڑتے ہوئے کہا۔

''اور اب تو تم ہمارا ساتھ چھوڑنے کے لیے مرے جا رہے ہو۔ چوہدری نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''اڑے بابا۔ یہ اس کا حق ہے۔'' سائیں اللہ وسایا کی طرفداری کرتے ہوئے بولا۔

''اوئے تو بڑی طرفداری کر رہا ہے اس کی۔'' چوہدری نے طنز کی کمان سائیں کی طرف موڑ دی۔

''سائیں۔اگر تم اتفاق سے وزیراعظم بن جاؤ تو مجھے بھی کوئی وزیر بنا دینا۔'' اللہ وسایا نے سائیں کی طرفداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میں آپ کے خلاف کبھی کوئی خط نہیں لکھوں گا۔ عدالت کے کہنے پر بھی نہیں۔'' اللہ وسایا دانت نکوستے ہوئے بولا۔

''آپس کی باتیں بعد میں کر لینا' اب تم لوگوں کے درمیان تقریری مقابلہ ہوگا۔عوامی مسائل پر۔ تو پہلے کون شروع کرے گا۔'' عوام نے ان کی بے تکی باتوں سے بیزار ہو کر دخل اندازی کی۔

''میں......'' اسکول کے بچوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''ٹھیک ہے تو پہلے تم ہی سہی۔''

چوہدری نے لمبی کھنکار کے ساتھ اپنا گلا صاف کیا اور ہتھیلیوں کو بھونپو بنا کر شروع ہو گیا۔

''میرے ساتھیو آج کا اہم موضوع ہے پانی' پانی زندگی ہے' پانی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ ہم فصل اگا سکتے ہیں' نہ نہا دھو سکتے ہیں...... لیکن پانی نہ

ہونے سے ایک اور بھی فائدہ ہوا ہے' دریا خشک ہوجاتے ہیں اور اس دریا کی جگہ گاؤں گوٹھوں کے بچے کرکٹ کھیلتے نظر آتے ہیں' اس طرح ہمارا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ ہم نے پورے ملک میں مثبت سرگرمیوں کے لیے کھیلوں کے میدان پھیلا دیئے ہیں۔''

جیسے ہی چوہدری نے اپنی تقریر ختم کی بشارت میاں اپنی تقریر لے کر میدان میں کود پڑے۔

''کہتے آج کا سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری ہے' لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' سب سے بڑا مسئلہ ڈکیتی اور لوٹ مار ہے' اور یہ اس لوٹ مار کے علاوہ جو ہم سیاست دان کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ بیروزگاری کی وجہ سے ڈکیتیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن میں نے آج تک کسی بے روزگار کو ڈکیتی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس بیچارے کو تو بیروزگاری سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔''

بشارت میاں کی بولتی بند ہونے سے پہلے گل خان کی بولتی اسٹارٹ ہوگئی۔ سب بولتی اے کہ بجلی مسئلہ ہے' خو چہ مسئلہ تو بنے گی' تم کو کون بولتا ہے کہ بجلی کا تار کو ہاتھ لگاؤ' پھر یہ بھی بولتی ہے کہ بجلی کے تاروں میں بجلی نہیں ہوتی' تو میرا بھائی' اس تار کو خالی کیوں ضائع کرتی ہے' ہم اپنا ماں بہن کو مشورہ دیتا ہے کہ بجلی کے تاروں پر کپڑے سکھایا کرے' بچہ لوگ اس پر جھولا جھولا کرے۔ تالیاں۔''

جب کہیں سے کسی تالی کی آواز نہیں آئی تو اللہ وسایا نے موقع غنیمت جانا۔ ''دل میں مہنگائی دے بارے میں اکھاں گا' کون کہندا اے کہ مہنگائی اے' جس بازار جس مارکیٹ وچ جاؤ لوکاں دی بھیڑ نظر آندی ہے' اوئے اگر مہنگائی ہے تو پھر یہ سب وہاں کیا لینے جاتے ہیں۔ کیا بچیاں تاڑنے جاتے ہیں۔'' اس بات پر اللہ وسایا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی زوردار تالیاں بجنے لگیں۔ تقریر پر نہیں بچیوں کو تاڑنے کی بات پر۔

شمس خاموشی سے صوفے کی پشت پر یوں چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا جیسے پہاڑ پر بیٹھا ہوا ہو۔

''بلوچ بابا آپ کیا بولتے ہو۔'' سائیں نے شمس کو کہنی ماری۔

''اڑے ہم کچھ نہیں بولتا ہوں۔'' شمس نے بے دلی سے جواب دیا۔

کیوں؟

''ہم ناراض ہوں۔'' شمس نے مختصراً کہا اور جوں ہی پیٹھ پھیری جگہ کم ہونے کی وجہ سے زمین پر آ رہا۔

''یار یہ تو ایسے ناراض رہتا ہے جیسے باقی لوگ سونے کے چمچوں میں کھانا کھا رہے ہیں۔'' بشارت میاں نے تپ کر کہا۔

''کہنے کو تو ہم بھی بہت چاہتا ہے سائیں۔ مگر پھر لوگ بولے گا کہ ہم بولتا ہے اس لیے ہماری خاموشی کو ہی بولنا سمجھو۔ اور نہیں سمجھ میں آتا تو ہم کیا کرے۔'' اتنا سا کہہ کر سائیں نے اپنی جان چھڑالی۔

''اور اب مقابلہ ہے اداکاری کا اس میں بھی گروپ بازی ہوگی' کیونکہ تم لوگ تو ویسے بھی مختلف گروپوں کی پشت پناہی کرتے ہی رہتے ہو......'' بگ عوام کی آواز ابھری۔

''او یار ہماری سیاسی اداکاری کم ہوتی ہے کیا۔'' چوہدری کی ہنسی نکل گئی۔

''اب حقیقی اداکاری کرنی ہوگی' گروپ اے کسی فلمی سچوئشن پر اداکاری کرے گا' تو شروع ہوجاؤ۔''

گروپ اے میں چوہدری۔ سائیں۔ گل خان اور پریا نکا کو رکھا گیا تھا۔

''جج صاحب۔'' چوہدری زور سے چیخا۔

''اتنی زور سے چیخو گے تو جج صاحب عدالت چھوڑ کر ہی بھاگ جائیں گے۔'' سائیں نے اسے سمجھایا۔''

''یارا ہمارا فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' گل خان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''شکرو کرو۔ اس زمانے میں ججوں کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔'' سائیں نے ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو آدھا فلم انڈسٹری توہین عدالت کے جرم میں اندر ہوتی۔'' گل خان یہ کہہ کر عظیم الشان بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔

''چلو سین شروع کرتے ہیں۔'' چوہدری نے انہیں ٹوکا۔

اس کی بات سن کر پریانکا زور سے آواز لگاتی ہے۔ ''مولیا'(ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ اور دوبارہ آواز لگاتی ہے)وے مولیا۔

چوہدری ایک جھٹکے سے کود کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔''میں آ گیا ماں۔''

''وے انی دیر کیوں کیتی؟'' پریانکا نے اس گال پر ایک تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

''سوری ماں' میرے گھوڑے دی سی این جی مک گئی سی۔ اور پیٹرول پمپ تے پیٹرول بھی غائب تھا۔ تو دس ماں کی گل اے۔'' چوہدری نے سلطان راہی کی طرح گردن جھٹکتے ہوئے ڈائیلاگ مارا۔

''وے مولیا' ساڈے دشمناں نے ساڈی غیرت نوں للکارا اے۔'' پریانکا نے اپنا ڈائیلاگ جھاڑا۔

''غیرت۔ او کہڑی شے ہوندی اے۔'' چوہدری کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''اوئے ہوندی اے اک شے' دشمناں نے للکارا اے۔''

''اے کی کہہ رئی اے ماں۔ تینوں کتنی بار منع کیتا اے کہ دشمنیاں نہ پال' اے کی طرح ہن مینوں بھی مروا کے اے چھڈے گی۔'' چوہدری بے بسی سے بولا۔''

اور چوہدری اپنا ڈائیلاگ بول کر جیسے ہی پیچھے پلٹتا ہے سائیں کو اپنے سامنے پاتا ہے۔

''تو آیا اے سوہنیا۔''

اب سب گل خان کی طرف دیکھتے ہیں کہ اب ڈائیلاگ بولنے کی باری اسی کی تھی۔ مگر ڈائیلاگ بولنے کی بجائے گل خان منہ سے زوردار دھماکے کی آواز نکالتا ہے۔''

''یہ کیا کیا؟'' پریانکا نے حیرت سے پوچھا۔

''ام کو ڈائیلاگ یاد نہیں تھا۔ اس لیے جان چھڑانے کے لیے ہم نے خودکش دھماکہ کر دیا۔ سب ختم۔''

اسپیکر سے پھر بگ عوام کی اواز ابھرتی ہے۔

''اب دوسرے گروپ کی باری ہے۔ آپ لوگوں کو ٹاسک دیا جاتا ہے کہ کسی مشہور کامیڈی ڈرامے کی نقل کریں۔''

گروپ بی میں بشارت میاں۔ اللہ وسایا۔ شمس اور سونا کشی کو رکھا گیا تھا۔ اپنی باری آنے پر چاروں کھلاڑیوں کی طرح ایک دائرے میں کھڑے ہو کر مشورے کرنے لگتے ہیں۔ شمس ناراض ہو کر ایک طرف بیٹھا ہے۔ باقی بھی اسے لفٹ نہیں کرواتے۔

''ہم بلبلے کی کاپی کریں گے۔'' بشارت میاں نے اپنے گروپ کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ چوائس آپ کے ہاتھ میں

ہے۔''عوام نے منظوری دے دی۔

''لیکن اس کے لیے ہمیں ایک اورنی میل چاہئے ہوگی'اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پریانکا کو ادھار پر ہمیں دے دیا جائے۔'' اللہ وسایا نے ڈیمانڈ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں اوئے' یہ نہیں ہوسکتا۔'' چوہدری اڑیل بیل کی طرح اڑتے ہوئے بولا۔

''واہ واہ سائیں۔ہم نے ایک سے کام چلایا اور تم کو دو دو چاہئے۔'' سائیں نے بھی اس کی تائید کی۔

''اجازت دی جاتی ہے۔'' عوام نے گروپ بی کی ڈیمانڈ مانتے ہوئے کہا۔

''یہ عوام کی زیادتی ہے۔'' چوہدری نے احتجاج کا راستہ اپنا لیا۔

''تو تم لوگ آج تک عوام کے ساتھ کیا کرتے آئے ہو۔'' عوام کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''ہم احتجاج کرتی ہے۔'' گل خان ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔

''تو کرتے رہو......'' عوام نے ان کا اعتراض رد کردیا۔

''تو کیا عوام ہمارے احتجاج کا نوٹس نہیں لے گی۔'' سائیں نے میز بجاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں نے کبھی عوام کے کسی احتجاج کا نوٹس لیا ہے۔شروع ہوجاؤ۔'' عوام کا حکم آخری تھا۔

یہ سنتے ہی سوناکشی بلبلے کی مومو کے انداز میں چلتی ہوئی آتی ہے۔''سلیم'سلیم''

بشارت'نبیل کا کردار نبھا رہا تھا۔''نبیل ماں جی۔''

''ہاں'سلیم'نبیل کو مت بتانا کہ ہم اس شو میں حصہ لے رہے ہیں۔'' سوناکشی مومو کی طرح ہلتے ہوئے بولی۔

''ماں جی نبیل میرا نام ہے۔'' بشارت بولا۔

''ہیں...... اچھا۔ تو پھر یہ سلیم کون ہے۔'' سوناکشی بولی۔

''اُف۔'' بشارت نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''چپ۔'' سوناکشی چیخ کر کہتی ہے۔

اسی وقت اللہ وسایا محمود کے انداز میں بولتا ہے۔''موموٗ موموٗ میرا بنیان کہاں ہے۔''

سوناکشی مومو کے انداز میں چلتی ہوئی اس کے پاس آتی ہے۔''بنیان۔وہ کیا ہوتا ہے۔''

''وہ۔وہ ہوتا ہے جو ہم قمیص کے نیچے پہنتے ہیں۔'' اللہ وسایا بولا۔

''اچھا وہ۔'' سوناکشی اپنی عینک درست کرتی ہوئی بولی۔

''ہاں وہ۔کہیں دیکھا ہے تم نے۔ میں نے اس ٹیبل پر رکھا تھا۔''

یہ سنتے ہی سوناکشی اچھل پڑتی ہے۔''اوئی وہ بنیان تھا۔''

''ہاں بنیان تھا۔تم تو ایسے اچھل رہی ہو جیسے وہ بچھو تھا۔''

''اپنا نام مت لو میرے سامنے۔'' سوناکشی نے اسے ٹوکا۔

''ماں جی۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ کولر میں پانی دیکھ کر بھرنا۔ کچرے والا آرہا ہے۔'' بشارت بولا۔

''اب کچرا نہیں ہے بچو' میں نے سارا پانی اسی بنیان سے چھان کر تو ڈالا ہے۔'' سوناکشی ہاتھ لہرا کر بولی۔

پریانکا خوبصورت کے انداز میں اخبار پڑھتی ہوئی آتی ہے۔

''خوبصورت۔ ذرا دیکھنا تو۔'' اللہ وسایا اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

''میں آپ کو کیوں دیکھوں محمود صاحب۔''

''اوہو۔ میں اپنی نہیں اخبار کی بات کر رہا ہوں۔'' اللہ وسایا بھنا کر بولا۔

''ہاں تو' میں اخبار ہی تو دیکھ رہی ہوں۔'' پریانکا بولی۔

''میرا مطلب ہے۔ اس میں دیکھ کر بتاؤ کہ تاریخ کیا ہے؟''

''مگر محمود صاحب۔ اخبار میں تاریخی نہیں صرف تازہ خبریں ہوتی ہیں۔'' بشارت حیرت سے بولا۔

''اوہو بھئی' تاریخ یعنی Date کیا ہے؟۔'' اللہ وسایا سر پکڑ کر بولا۔

''23 مارچ۔'' پریانکا نے کہا۔

''اوہ تئیس مارچ۔'' اللہ وسایا یوں بولا جیسے اس تاریخ کو اس کا بانڈ کھلنے والا تھا۔

''کیوں' تئیس مارچ کو بھی نیاز ہوتی ہے کیا۔'' بشارت اپنی رال کو بہنے سے روکتے ہوئے بولا۔

''چپ۔ نیاز ہوتی نہیں' نیاز ہوتا ہے۔ کیوں نیاز۔'' سوناکشی مومو کے انداز میں ڈانٹتی ہے۔

''محمود۔'' اللہ وسایا بولا۔

''ہاں۔ محمود' بھی ہوتا ہے۔'' سوناکشی لہرا کر بولتی ہے۔

......☆☆☆......

بشارت اور سائیں لاؤنج میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے صرف وہ باتیں جن سے کبھی عوام کا مستقبل سنورنے کے چانسز نہیں تھے۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی' کوٹہ اور لوٹا تو سمجھو کہ ہماری عوام کا مقدر بن چکا ہے۔'' بشارت نے سائیں کی کسی بات پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یار وہ خان صاحب بہت خوش نظر آرہا تھا۔ خیر تو ہے نا۔'' سائیں کو جیسے اچانک یاد آ گیا۔

''ہاں' اسے اسٹور میں سے ایک پرانا کمپیوٹر مل گیا ہے' کہہ رہا تھا گیمز کھیل کر امریکہ کو ہرائے گا۔'' بشارت نے گل خان کی خوشی کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت گل تیزی سے چلتا ہوا آتا ہے اور ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنے لگتا ہے۔

''کیا ہوا خان صاحب۔ کیا ڈھونڈ رہا ہے بابا۔'' سائیں نے ازراہ مروت پوچھ ہی لیا۔

''ہتھوڑی۔'' گل خان اس کی طرف دھیان دیئے بغیر بولا۔

بشارت نے حیرت سے کہا۔ ''ہتھوڑی' ارے میاں' ہتھوڑی کا کیا کرو گے۔''

''یار کمپیوٹر میں ونڈوز لگانا ہے۔'' یہ کہہ کر گل خان ان دونوں کو حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے دیا۔

اسی وقت عوام کی آواز آتی ہے۔

''آپ تینوں یہاں کیا کر رہے ہیں۔''

''وہی جس کے لیے آپ نے یہاں بلایا ہے۔ باتیں اور کیا۔'' سائیں بولا۔

''آپ لوگ بھی لان میں چلیں۔ سب وہیں ہیں۔'' عوام نے حکم جاری کیا۔

''کوئی اور سیگمنٹ ہے کیا۔'' بشارت نے پوچھا۔

''تو یہاں آپ کو دعوت کھانے کے لیے بلایا گیا ہے کیا۔'' عوام نے تپ کر کہا۔

''چلو میرا بھائی۔ چلنا ہی پڑے گی۔'' گل خان بولا۔

......☆☆☆......

لان میں پوشیدہ مائیک سے عوام کی آواز ابھر

رہی تھی۔

''اگلا سیگمنٹ ہے بکرا نہلانا۔''

''کیا۔'' سائیں حیرت سے اچھل پڑا۔

''ہم لوگ بکرے کو نہلائیں گے۔'' بشارت میاں کو اس سیگمنٹ پر اعتراض ہو رہا تھا۔

''او یار ایک سال سے تو میں خود نہیں نہایا۔ بکرے کیا نہلاؤں گا۔'' چوہدری بولا۔

''ہاں۔ تم لوگوں نے اتنے سالوں سے عوام کو قربانی کا بکرا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اب عوام چاہتی ہے کہ تم لوگ بکروں کو نہلا کر صاف کرو۔''

پھر چشمِ فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ وزارتِ عظمیٰ کے متوقع امیدواروں نے کس طرح سے ان بکروں کو نہلایا اور چکر میں خود ان کی گت بنی۔ جبکہ پریانکا اور سوناکشی کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

☆☆☆

اس بار سب کو لاؤنج میں جمع کیا گیا تھا۔ اور عوام کہہ رہی تھی۔

''اب ہوگا Rapid Fire Round۔ یعنی سب سے ایک ایک سوال پوچھا جائے گا۔ اور جو جتنا جلدی جواب دے گا۔ اس کو اتنے ہی پوائنٹ ملیں گے۔''

''چہ۔ فائر کرنے میں تو امارا جواب نہیں ہے۔'' گل خان اکڑ کر بولا۔

''خان صاحب۔ یہ بندوق کا نہیں۔ سوال جواب کا فائر ہوگا۔'' بشارت نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ایک ہی بات ہے یارا۔'' گل خان نے ناک پر بیٹھنے والی مکھی کو اڑاتے ہوئے کہا۔

عوام کی آواز آئی۔ ''آغاز خان صاحب سے ہی کرتے ہیں۔''

''کرو۔ کرو' ہم ڈرتا نئیں اے' پوچھو کیا پوچھنا ہے۔'' گل خان اکڑ سے کم بات کرنے پر راضی ہی نہیں تھا۔

''امریکی دباؤ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟۔''

''چہ امریکی دباؤ' (گلا دبانے کا ایکشن کرتے ہوئے) 'امریکی مر جاتا ہے۔''

''سائیں تم بتاؤ سندھ کارڈ کیا ہے؟۔''

''سندھ کارڈ وہ کارڈ ہے جس پر سندھ کے عوام کو ایک کلوراشن بھی نہیں ملتا۔'' سائیں نے جواب دیا۔

''بلوچ بابا آپ بتاؤ۔ احساسِ محرومی کیا ہے؟''

''اڑے ہم کو نہیں پتہ' ہم ناراض ہوں۔'' شمس منہ پھیرتے ہوئے بولا۔

''بشارت میاں آپ بتائیں۔ معیشت کیسے ترقی کر سکتی ہے؟''

''واہ ابھی سے سارے گر بتا دوں۔ پہلے وزیراعظم بناؤ پھر بتاؤں گا۔ اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں میں نے۔'' بشارت ہاتھ نچا کر بولا۔

''چوہدری صاحب۔ پگ کو داغ لگ جائے تو؟''

''داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔'' چوہدری نے کہا اور داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر حرام ہے جو کوئی ایک بھی داد دینے کے موڈ میں ہو۔

''اللہ وسایا۔ اب تمہاری باری ہے۔ یہ بتاؤ مرغی پہلے آئی یا انڈہ۔''

''میرا خیال ہے پہلے مرغا آیا تھا۔'' اللہ وسایا نے اپنا بیہودہ خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''فلم بین اور تماش بین میں کیا فرق ہے؟۔''

''ایک ہی بات ہے۔ فلم بین سینما میں ہمارا تماشہ دیکھنے ہی تو آتے ہیں۔'' پریانکا اٹھلا کر بولی۔

''آپ کی تعریف؟''

''تعریف اس ڈائریکٹر کی جس نے مجھے ہیروئن بنایا۔'' سوناکشی بھی کیوں پیچھے رہتی۔

......☆☆☆......

سارے امیدوار موجود ہیں۔ عوام کی آواز ابھر رہی ہے۔

''آج 23 مارچ ہے' پورے بارہ بج رہے ہیں' یعنی اب وقت آ گیا ہے کہ تم لوگوں کے چہروں پر بھی بارہ بجا دیے جائیں۔''

''چہ ام کو معلوم اے کہ سب سے زیادہ پوائنٹ امارا اے۔'' گل خان فخر سے بولا۔

''کیوں خان صاحب' ہم کیا یہاں بھٹے بھوننے آئے تھے۔'' بشارت چڑ کر بولا۔

''ہاں سائیں' ہم سے زیادہ دوسرے کو شیشے میں اتارنے کا فن کون جانتا ہے۔'' سائیں نے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے کہا۔

''اوئے میں جانتا ہوں کہ میرے سامنے یہ سب بچے ہیں۔'' چوہدری نے پرانے ویلن مظہر شاہ کے انداز میں بڑھک ماری۔

''اپنے ماں پیو کے۔'' اللہ وسایا اسے ٹھینگا دکھاتے ہوئے بولا۔

''ام کیا بولے' ام تو ناراض ہوں۔'' شمس حسب عادت پیٹھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''فائنل رزلٹ آ گیا ہے۔'' عوام نے خوشخبری سناتے ہوئے کہا اور یہ سنتے ہی سب خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔

(سب خوش ہو کر ناچنے لگتے ہیں)

لاؤنج میں ''میں وزیراعظم بنوں گا۔ میں وزیر اعظم بنوں گا۔'' کے نعرے گونجنے لگتے ہیں۔

''رزلٹ اور عوام کی رائے کے مطابق تم لوگوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا ہے۔'' عوام نے رزلٹ کا بم ان سب کے اوپر گراتے ہوئے کہا۔

''یہ بے ایمانی ہے' دھاندلی ہے۔'' سائیں چیخ کر بولا۔

''یہ تو پری پول دھاندلی ہے۔'' چوہدری بھی چیخا۔

''ایسے دستور کو صبح بے نور کو میں نہیں مانتا۔ میں نہیں مانتا۔'' بشارت جوش میں آ کر بولا۔

''ہمارے کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے ڑے۔ کیوں کہ ہم تو ناراض ہوں۔'' یہ تھا شمس کا جواب۔

اس سے پہلے کہ باقی بھی اپنا اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے۔ عوام نے چیخ کر حکم صادر فرمایا۔ ''گارڈ''

یہ حکم سنتے ہی جدید اسلحہ سے لیس کئی گارڈز اندر آ جاتے ہیں۔

''عوام کا حکم ہے کہ ان سب کو دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے۔''

سب شور کرتے ہیں مگر گارڈ انہیں دھکے دینا شروع کر دیتے ہیں۔

''ہمارے لیے عوام کا کیا حکم ہے۔'' پریانکا بولی۔

''عوام دونوں ہیروئنوں کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ انہوں نے یہاں آ کر ہمارے شو میں حصہ لیا۔ اور عوام سیاستدانوں کو پسند کرے نہ کرے۔ تمہاری اداکاری اور ڈانسوں کو بہت پسند کرتی ہے۔

یہ سن کر دونوں ہیروئنیں اپنے اپنے ہاتھ چوم کر ہتھیلی پر پھونک مار کر ہوائی بوسہ عوام کی طرف اچھالتی ہیں۔

ذوق آگہی

سباس گل

شعور
(انعام یافتہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مضر ہے۔ جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوتی ہے اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے علم پستی کے درجہ میں ہے اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافت نفس پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون توڑنا ہے۔ مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور ونزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا حسرت کے نشے میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا کر دیا ہے۔

امام عبیداللہ سندھی کی کتاب "شعور آگہی" سے اقتباس

اشفاق شاہین...... کراچی

خوشخبری

یا حیی یا قیوم جل شانہ حیات اور قائم رہنے والا کون؟ صرف اور صرف اللہ پاک یہ اللہ جل شانہ ہی تو ہے جس کی ابتدا نہیں جس پر زوال نہیں، خوشخبری ہے مومنوں کے لیے وعدہ ہے اللہ جل شانہ کا ان سے یہی ایماندار لوگ کامیاب ہیں اور ہمیشہ جنتوں میں رہیں گے۔ جن میں انواع و اقسام کے کھانے ہیں پھل ہیں اور دودھ، شربت، شہد اور شراب کی نہریں بہتی ہیں۔ لفظ ہمیشہ پر غور کریں گے تو ایک لازوال خوشی بدن میں سرایت کر جائے گی وہ رب ہی تو ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا ہے۔ اس نے صدیوں سے آسمانوں کو، زمین کو اور سیاروں کو اپنی جگہ قائم رکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے فنا نہیں کرتا وہ خود فنا سے پاک ہے اور اپنی پسندیدہ چیزوں کو فنا نہیں ہونے دیتا۔ مومنو خوش ہو جاؤ کہ تم ہمیشہ خوش رہو گے، یاسیت کا شکار وہ بدکار اور گناہگار ہوں گے جو برے ہیں اور جہنم کا ایندھن ہیں جہاں وہ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور ان کو نیند نہ آئے گی۔ جہاں نیند ہے وہ راحت کی جگہ ہے۔ جہنم میں بستر کہاں اور راحت کہاں؟

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور

حدیث نبوی ﷺ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں۔ حسن اخلاق، دین کی سمجھ۔

(ترمذی شریف)

ایم ارشد وفا...... گوجرانوالہ

باتوں سے خوشبو آئے

- جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں تو آپ کو مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے جانے کی ضرورت نہیں۔
- بڑے آدمی گفتگو میں دھیمے مگر عمل میں تیز ہوتے ہیں۔
- گوشت کے بغیر سبزی کھانا پڑے، پینے کے لیے صرف پانی ملے، سونے کے لیے تکیہ نہ ہو، یہ حالت بہتر ہے اس دولت سے جو ناانصافی سے حاصل کی گئی ہو۔
- **بڑا آدمی ہمیشہ مطمئن رہتا ہے، چھوٹا آدمی ہمیشہ ڈانوں ڈول۔**
- بڑا آدمی تھوڑے الفاظ اور زیادہ کارناموں کا مالک ہوتا ہے۔
- بڑا آدمی ہمیشہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی شکایت کرتا رہتا ہے۔

◈ وہ جن میں کبھی تبدیلی نہیں آتی ولی ہوتے ہیں یا احمق۔

انتخاب: انجم فاروق ساحلی......لاہور

تعلیم

میں پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت کے بچوں کو پڑھانے پر مامور تھا یہاں پرائمری اسکول میں بھی کم از کم سولہ سال کی حاصل کردہ تعلیم کے بعد درس و تدریس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے اپنی چوتھی جماعت کے بچوں کو یعنی سب کو ایک ایک بلی کا بچہ دیا۔ ان سے کہا کہ یہ بلونگڑے اپنے اپنے گھر لے جائیں۔ انہیں پالیں اپنے ہاتھ سے کھلائیں پلائیں ان کے ساتھ کھیلیں بھی۔ دو ماہ کے بعد تمام طلبا سے مطالبہ کیا کہ میری بلیاں مجھے واپس کردیں۔ اگلے دن طلبا بلیاں اسکول لے آئے لیکن سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہیں اپنے اپنے پالتو جانور سے محبت ہوگئی تھی۔ بلیاں دیکھ کر ہمارے پرنسپل صاحب بھی آگئے موڈ خراب تھا اور تھوڑے خفا ہوکر بولے۔

"آپ یہ کس کام میں پڑگئے ہیں؟ آپ کا کام بچوں کو اخلاقیات سکھانا ہے۔"

میں نے پرنسپل صاحب سے بڑے ادب سے عرض کی کہ جناب یہی ہم میں بحثیت قوم کمی ہے میں پہلے ان بچوں کو زندگی سے محبت کرنا سکھادوں؟"

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

اقوال زریں

☐ زندگی ہمیں ہمارے منصوبوں کے مطابق جینے کی اجازت نہیں دیتی۔

☐ سب سے اچھی تحریر وہ ہے جس میں اللہ رب العزت کی بڑائی بیان کی گئی ہو۔

☐ بدبخت ہے وہ انسان جس کے ماں باپ زندہ ہوں اور اس سے ناراض ہوں۔

☐ زندگی کی تمام سڑکیں سیدھی نہیں ہوتیں۔

☐ دونوں جہانوں کے خزانے زبان کے نیچے پوشیدہ ہیں۔

☐ خاموشی اور صبر سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔

منعم اصغر......ڈیرہ غازی خان

مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں

◈ ایک نسل جن چیزوں کو غیر ضروری جان کر گلی میں رکھ آئی ہے اگلی نسل ان چیزوں کو اٹھا کر پھر سے گھر میں سجالیتی ہے آثار قدیمہ کے طور پر۔

◈ جیسے زیادہ پانی سے پودے کی جڑیں گل جاتی ہیں ایسے ہی بچے سے زیادہ پیار کرنے سے آپ بچے کی جڑوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔

◈ دسترخوان پر اتنا ہی کھایئے کہ اٹھ سکیں اٹھیں گے نہیں تو دوبارہ کیسے بیٹھیں گے۔

◈ آسمان اس پرندے کا نہیں ہوتا جس کے پر بڑے ہوں بلکہ آسمان اس پرندے کا ہوا ہے جس میں قوت پرواز ہو۔

◈ جن چیزوں کو آپ چاندنی رات میں دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں انہیں کبھی دوپہر میں دیکھ لیا کیجیے۔

ریاض بٹ......واہ کینٹ

فرمودات حضرت علیؓ

● حکمت مومن کی کھوئی چیز ہے حکمت خواہ منافق سے ملے لے لو۔

● انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔

● اب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

● جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو۔

● بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینہ سے بچو۔

● گناہ پر ندامت گناہ کو مٹادیتی ہے نیکی پر غرور نیکی کو تباہ کردیتا ہے۔

● سب سے بہترین لقمہ وہ ہوتا ہے جو اپنی محنت سے کمایا جائے۔

● جو شخص پاک دامن عورت پر تہمت لگاتا ہے اسے

سلام مت کرو۔

● ہمیشہ سچ بولو تا کہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

● موت کو ہمیشہ یاد رکھو موت کی آرزو کبھی نہ کرو۔

ملک جوادنواز قریشی......ڈیرہ اسماعیل خان

بے حس سماج کے بے رحم رویے

کہاں سے لکھوں، کس کس ستم، کس کس کہانی پہ لکھوں، یہ سوچ سوچ کے جو خیالات جنم لیتے ہیں وہ بھی منتشر ہوجاتے ہیں۔ ایک ٹاپک لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو سماج کا دوسرا روپ سامنے آجاتا ہے اور دھیان پھر اس طرف چلا جاتا ہے۔ اس کشمکش میں کتنے ہی دن گزر جاتے ہیں۔ آس پاس ایسے ایسے واقعات روز کا معمول بن چکے ہیں کہ جسے دیکھ کر انسانیت تک شرما جائے۔ ہم لوگ جیسے اندھے قانون کے بہرے، گونگے سماج کا وہ حصہ بن چکے ہیں جہاں کچھ بھی ہوتا رہے اف تک نہیں کی جاتی جو ہو جیسا بھی ہو اس سے جان بوجھ کر لاتعلق ہو جانا عام سی بات بن چکی ہے۔ شاید ہمارے اعمال ہمیں دکھتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے دلوں کو زنگ لگ چکا ہے۔ ہم لوگ اپنے اندر جھانکتے نہیں، بس دوسروں کی برائیاں کرنے کی جستجو میں دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ احساسات و جذبات کی قدر کھو چکی ہے۔ انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ہمارا سماج اپنی قدر کھو بیٹھا ہے۔ انسان اشرف المخلوق کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے جو چرند پرند جانور پیدا کیے ان سب سے بڑھ کر انسان کو رتبہ ملا مگر اب انسان انسان نہیں رہا جانور سے بھی بدتر ہو چکا ہے۔ اس میں ہوس، لالچ، طمع اتنی حد تک سرایت کر چلی ہے کہ وہ اپنے ہی باپ، بیٹوں، بھائیوں کو قتل کرتا پھرتا ہے۔ اس کے آگے جان اتنی سستی ہو چکی ہے کہ ایک ہی جگہ بہت سارے انسانوں کا خون بہا کر بھی وہ جھر جھری تک نہیں لیتا۔ آج کل کے دور میں کسی دوسرے کے درد کو محسوس کرنے والی حس دم توڑ چکی ہے۔ کوئی انسان کسی حادثے کا شکار ہو کر کہیں تڑپتا ہے مگر مجال ہے کہ کوئی شخص اس کی مدد کرنے کے لیے قدم بڑھائے۔ اس کے پاس اتنا ٹائم ہی نہیں ہے ایک طرف یہاں ظالم اگر انسان ہے تو دوسری طرف مظلوم بھی انسان ہے یہ سب اس لیے ہے کہ انسان اپنی ذمہ داری کا احساس بھلا بیٹھا ہے۔ حرص و طمع کو اپنے دل میں پال بیٹھا ہے۔ ہم اس بے رحم سماج کا حصہ بن چکے ہیں جہاں گولیوں سے چھلنی لاشیں ملتی ہیں جہاں آئے دن خودکش حملوں میں انسانوں کے اعضا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ جہاں عام آدمی کے جذبات سیاست کے بے رحم پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں۔ جہاں ہر شعبے میں کرسی پہ بیٹھنے والے خود کو شاہ اور کام کے لیے آنے والے افراد کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں زبردستی کرسی پر بٹھایا گیا ہو اور بغیر تنخواہ کے کام لیا جا رہا ہو، ایک سپاہی عام آدمی سے ایسے بات کرتا ہے جیسے وہ قانون کا محافظ نہ ہو کوئی ملک کا بادشاہ ہو یہ سب کیا ماجرا ہے۔ ہر کوئی پیسے کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہا ہے۔ آئے دن محبت، اخلاق ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی کے پاس ایک پل نہیں کہ وقت نکال کر کسی کے پاس دو پل بیٹھا جائے۔ جانے دنیا کس سمت چل نکلی ہے۔ خدا خیر کرے، اللہ ہمارے حالات پر رحم کرے اور ہمیں سیدھا راستہ دکھائے۔

عبدالمالک

اقتباس

''کچھ لوگ ہمیشہ ایسے ہی جاتے ہیں، بن بتائے، بغیر کوئی اپائنٹمنٹ لیے، وہ اپنا کوئی پتا، فون نمبر بھی بتا کر نہیں جاتے جن پر انہیں رابطہ کر لیا جائے، ان کی کوئی قیمتی چیز بھی پیچھے نہیں رہ جاتی جس کو لینے کے لیے انہیں آنا پڑے۔ انہیں جانے کی اس قدر جلدی ہوتی ہے کہ وہ کوئی جھوٹا وعدہ کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے، کسی نشانی کو دے جانا بھی ان کے نزدیک تضیع اوقات ہوتا ہے۔ وہ تو جھٹ پٹ دروازہ کھڑکی کھول کر یوں نکل جاتے ہیں جیسے پل کے نیچے سے پانی گزر جاتا ہے آناً فاناً۔

اقتباس: راجہ گدھ (بانو قدسیہ)
فائزہ بھٹی......چونکی

کچھ لوگ

⌘ کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں، وہ چاہے ہم سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں دل ان کی روح سے سمٹ جانے کے لیے بے چین رہتا ہے۔

⌘ کچھ لوگ گلابوں کی طرح ہوتے ہیں ان کا نام لیتے ہی ہمارے اردگرد خوشبو سی پھیل جاتی ہے۔

⌘ کچھ لوگ ستاروں کی طرح ہوتے ہیں جو دور سے چمکتے ہیں مگر ہمارے ہاتھ نہیں آتے۔

⌘ کچھ لوگ گھٹاؤں کی طرح ہوتے ہیں جو دوسروں پر اس طرح برستے ہیں کہ زندگی کی سخت دھوپ نرم چھاؤں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

رانی اسلام......گوجرانوالہ

تین چیزیں

حدیث میں آتا ہے "جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے سوائے تین چیزوں کے۔"

علم:۔ جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

نیک اولاد:۔ جو مرنے والے کے لیے دعا کرے۔

صدقہ جاریہ:۔ جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فیض یاب ہوں۔

عظمیٰ فرید خان......ڈی آئی خان

سات حکایتیں زندگی کی

✦ شک:۔ وہ رشتہ ختم ہوجاتا ہے، جس میں شک اپنی جگہ بنالیتا ہے۔

✦ پیار:۔ اگر کسی سے پیار کرنا ہے تو اتنا کرو کہ وہ چاہ کر بھی تم سے نفرت نہ کرسکے۔

✦ نفرت:۔ اگر کسی سے نفرت کرنی ہے تو پہلے خود کو دیکھ لو۔

✦ احساس:۔ جب تک دلوں میں احساس نہ ہو کوئی رشتہ کامیاب نہیں ہوتا۔

✦ غصہ:۔ اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے پیار کریں تو اپنے اندر سے غصہ ختم کرو۔

✦ یقین:۔ اگر کسی پر یقین کرنا ہے تو حد سے زیادہ کرو یا تو ایک اچھا انسان ملے گا یا پھر اچھا سبق۔

✦ عزت:۔ ہر رشتے کی بنیاد عزت ہے، جس رشتے میں عزت نہیں اس کی بنیاد کمزور پڑجاتی ہے۔

فائزہ عباس......گوجرانوالہ؟

وقت کیا ہے؟

● وقت ایک بہتا دریا ہے، جو کبھی نہیں رُکتا۔

● وقت ایک ایسا پیمانہ ہے، جو کبھی ناپا نہیں جاتا۔

● وقت دنیا کا سب سے بڑا استاد ہے جو انسان کو ہر اچھے بُرے کا فرق بتاتا ہے۔

● وقت کی اگر کوئی قیمت ہے تو وہ اس کا صحیح استعمال ہے۔

● وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

● وقت اپنے ساتھ خوشیاں بھی لاتا ہے اور غم بھی لاتا ہے۔

● جو لوگ وقت رکنے کا انتظار کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

● عقل مند شخص وہ ہے جو وقت کو ہیرا سمجھ کر استعمال کرے۔

● وقت دنیا کی سب سے بڑی گردش ہے جو امیروں کو بھی فقیر بنادیتا ہے۔

رابعہ ساحر محمد حنیف......جہانیاں

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

(انعام یافتہ کلام)

مرتے ہوئے ضمیر کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے
وہ کر نہیں رہا تھا میری بات کا یقین
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے
بھولے سے کوئی میری سمت دیکھتا نہ تھا
چہرے پر اک زخم لگانا پڑا مجھے
اک اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے
اس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے

محمد ذیشان ہاشمی

نعتیہ ہائیکو

نعت رسول ﷺ کی ہے
مل کے درود و سلام پڑھو
بات رسول ﷺ کی ہے

بام و در مہکے
میں نے اکثر دیکھا ہے
نعت نبی ﷺ کہہ کے

دل کی ابجد کا
پہلا حرف اور آخری بھی
میم محمد ﷺ کا

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

محبت کے ولی ہوتے

محبت کر لی مٹی کے پتلے سے
یہ نہ کرتے تو وقت کے قلندر ہوتے
ڈوب گئے تیری جھیل سی آنکھوں میں
ورنہ ہم خودی کا اک گہرا سمندر ہوتے
بس خواب میں تراش لیا تم کو
ورنہ ہم جاگتی راتوں کا سکندر ہوتے
ذرا نظر بھر کے دیکھنے کی خیانت کر لی
ایسا نہ کرتے تو محبتوں کے ولی ہوتے

ریحانہ سعیدہ......گڑھی شاہو، لاہور

اندھیرا صرف میرا ہے

میں تنہائی پہنتا ہوں
اداسی کے اجاڑ آنگن میں چنتا ہوں
کٹھن محرومیوں کے زرد پتوں کو
مری آنکھوں میں جگراتے بھرے ہیں ایک مدت سے
مرے ہونٹوں پہ چسپاں ہیں چٹختی ہچکیاں
چہرے پہ کھلتی، کھلتی، دھتی خراشیں ہیں
میں اپنی ذات میں اجڑے ہوئے گاؤں کا میلہ ہوں
مرے یارو......
تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں
مری سنگت میں مت بیٹھو......
تمہیں تو خود سنورنا ہے
تمہاری خواہشوں کے بام و در پہ روشنی کے پھول کھلنا ہیں
تمہیں لکھنا ہے......اپنی سانس کی گرمی سے
نیندوں کا سفرنامہ
مری سنگت میں مت بیٹھو
کہ میں پتھر کا مجسمہ ہوں
کہ میں محرومیوں کے شہر کا باسی ہوں
مری قسمت اداسی
کم لباسی، ناشناسی ہے
مری سنگت میں مت بیٹھو
مجھے ملنے سے کتراؤ
خود اپنے دل کو سمجھاؤ
میرے نزدیک مت آؤ

میرے دل میں اندھیرا ہے
اندھیرا صرف میرا ہے
کلام محسن نقوی
انتخاب: ایم جے قریشی...... ڈی آئی خان

ماں

ماں جب سے تم جدا ہوئی ہو
ہر رشتہ ہی مجھ سے بیگانہ ہوا
دنیا والوں نے تیرے بعد بہت ضربیں دی
تب پتا چلا کہ درد کیا ہوتا ہے؟
اپنے گھر کی آرزو میں مجھے بربادی ملی
کوئی حوصلے کی تھپکی نہیں بلکہ جھڑکی ملی
ہر در بند ہوا ماں کی جدائی سے
صحرا کی تپتی ریت اور میرے ننگے پاؤں
زندگی کا بھی زندگی سے گزر نہ ہوا
رونا، تڑپنا، ٹوٹنا، بکھر جانا سب لاحاصل
میرا کوئی بھی اپنا آسرا، سہارا نہ ہوا
ماں وہ رشتہ جو روٹھی تقدیر رب سے بھی منوالے
ماں جب سے تم جدا ہوئی ہو
مجھ پر تو کبھی اللہ کی رحمت کا بھی نزول نہ ہوا
انتخاب جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

غزل

اشک پلکوں پر جھلملاتے ہیں
لوگ کچھ ہم کو یاد آتے ہیں
تیری یادوں سے دل لبھاتے ہیں
اپنی آنکھوں کو ہم جگاتے ہیں
روشنی اور بڑھتی چلی جاتی ہے
چہرے گلنار مسکراتے ہیں
تیری تصویر کاغذ دل پر
اپنے ہاتھوں سے ہم بناتے ہیں
ان کو تکلیف نہ کوئی پہنچے
اپنے زخموں کو ہم چھپاتے ہیں
اہل دل ہم ہی شہر میں ٹھہرے
لوگ کیوں ہم کو آزماتے ہیں
یہ سلیقہ ہمیں نہیں آیا
وہ بھلائیں اگر بھلاتے ہیں
ان سے ہوئی ہے گفتگو رانا
یہ ستارے جو جگمگاتے ہیں
قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

انجمن میں جنس جب سے بے نقاب آنے لگا
دید کی پیاسی نگاہوں کو حجاب آنے لگا
یہ شکست حسن ہے یا میری چاہت کا کمال
محو حیرت ہوں مرے خط کا جواب آنے لگا
گر پیش ایام مجھ پر مہرباں ہونے لگی
غم مرے حصے میں دیکھو بے حساب آنے لگا
لب کہ پیاسے تھے میرے صدیوں سے پیاسے ہی رہے
تشنگی بھڑکانے پھر سے اک سراب آنے لگا
بخش دی ہے بے قراری جذبہ دل نے مجھے
کون کہتا ہے امنگوں پر شباب آنے لگا
یار لوگوں نے دیا ہے نام اس کو نیند کا
ذہن پر میرے جو سپنوں کا عذاب آنے لگا
کیا کروں کیسے دل ناداں کو سمجھاؤں قمر
پھر اسی کم بخت پر خانہ خراب آنے لگا
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

میں اک جسم ہوں اور وہ میرا سایہ ہے
جیسے یارو عشق مرا ماں جایا ہے
دل کی ہر اک دھڑکن مجھ سے کہتی ہے
اب آیا بس اب آیا اب آیا ہے
دیوانے بھی مجھ سے وحشت کھاتے ہیں
تیری چاہت نے یہ حال بنایا ہے
آج کے بعد میں اپنے دل کو ڈھونڈوں گا
اس نے دل پہ ہاتھ اچانک رکھا ہے

میں دیوانہ میں پاگل مجنوں فرہاد
سچ ہے یارو اس نے جو فرمایا ہے
برکھا رت ناراض ہے پانی مجھ سے دور
ساحل پر یہ کیسا موسم چھایا ہے
خالد ایاز ساحل

غزل

ہو میری یادداشت فنا یا ہو میری ذات فنا
میں گر جاؤں زمانے کی نظروں میں مگر نہ ہو تیری بات فنا
اسے کیا خبر کہ تلخ لہجہ سن کر
ہوتے ہیں کسی مظلوم کے جذبات فنا
کچھ لمحے گنوانے سے کہاں بات بنے گی
تلاش محبوب میں ہوتے ہیں دن رات فنا
مل گئی ہیں اہل چمن کو کچھ اور سریلی آوازیں
اب تو ہونے ہی تھے میرے نغمات فنا
میری قسمت، میرے حالات بدلنا بہت دور رہا
عجب بات ہے کہ ہوگئے خود حالات فنا
اس سے پہلے کہ تم بیٹھو کسی غیر کی ڈولی میں
یقین رکھو کردے گا صائم کائنات فنا
ظہور احمد صائم......مانگا منڈی، لاہور

غزل

شباب اس کا تھا حسن جمال تھے اس کے
حسیں نہایت حسیں خدوخال تھے اس کے
وہ حور تھی کہ پری تھی کہ اپسرا کوئی
غزالی آنکھیں تھیں ابرو ہلال تھے اس کے
ستارہ اوج پہ تھا اس کی خوش نصیبی کا
وہ ماہ و سال کا اور ماہ وسال تھے اس کے
دراز قامتی ایسی کہ بس قیامت تھی
ادا و ناز بھی سب بے مثال تھے اس کے
ہمیشہ اس کی ہی یادوں میں کھوئے رہتے تھے
ہمیشہ پیش نظر خدوخال تھے اس کے
ٹھہر، ٹھہر گئی دھڑکن عجیب عالم تھا
اداس رخ پہ پریشان بال تھے اس کے
وہ اجنبی تھا مگر کب تھا اجنبی کی طرح
تعلقات تو سب سے بحال تھے اس کے
بس ایک مجھ سے تھیں اس کو شکایتیں ورنہ
زمانے والے سبھی ہم خیال تھے اس کے
رچا ہوا تھا ذہن میں کچھ اس طرح نیر
ہماری شام و سحر تھی خیال تھے اس کے
نیر رضوی......لیاقت آباد، کراچی

غزل

سب دل کے ارمان آج دبا دیے ہیں
جو جاگے تھے جذبات سلا دیے ہیں
سینے سنبھال رکھے تھے کہیں دور دل میں
کسی خاک کی مانند اڑا دیے ہیں
وہ سر راہ ملے تو نظر یوں چرا گئے
گویا ہم سے غریب سب بھلا دیے ہیں
اب مانگتے ہیں پاؤں پڑ کے معافی
وہ لوگ جو عشق نے جلا دیے ہیں
انا ہے یہ تیری یا آغاز جدائی ہے
گزرے ہوئے قصے پھر اٹھا دیے ہیں
میری خطائے ناکردہ پر وہ یوں برہم ہوئے کہ توبہ
اک ہم ہیں کہ ہر ستم پہ مسکرا دیے ہیں
آتے ہیں کہ نہیں میرے گھر میرے یار کی مرضی
میں نے تو در و دیوار خوب سجا دیے ہیں
فاروق تیرے اشعار میں کچھ تو دم ہے
کہ سنگ دل لوگ بھی آج رلا دیے ہیں
عمر فاروق ارشد......فورٹ عباس

غزل

جفا کا داغ ہمیں اور وفائیں اور کہیں
بہاریں اور کہیں اور خزائیں اور کہیں
یہ دل اس کے خیالوں میں ڈوبا رہتا ہے
کہ جس کا حسن یہاں اور ادائیں اور کہیں
میں لاش بے کفن و گور، دشت فرقت میں
ہیں جس کی خوشبوؤں والی ہوائیں اور کہیں

تلاشے تھے تیرے پیکر میں رنگ خوابوں کے
ہیں تیری ہستی کی رنگین ادائیں اور کہیں
ہیں میرے جذبے تیرے سحر کی فصیلوں میں
یہاں پہ دھیاں ترا اور صدائیں اور کہیں
وہ زندگی کا تصور تو تجھ سے تھا خانم
پہ مستجاب تھیں تیری دعائیں اور کہیں

فریدہ خانم......لاہور

آنکھیں

معصوم سے چہرے پر ستاہ شب آنکھیں ہیں
جو دیکھیں ان میں ڈوب جائے
جیسے صحرا میں آگ جلتی جائے
جیسے خوشبو سے رنگ ملتے جائیں
ان خواب آنکھوں کے رت جگے
ترے عارض پہ کھلتے جائیں
اور
سوال کرتی شمع، سحری نامہ بری آنکھیں ہیں
کیوں دل کو تڑپاتی ہیں
روح میں اتر جاتی ہیں
تصور میں پوچھتی ہیں
جن کو نہ ملنا ہو
کیوں جیون رستے میں آتے ہیں
ساحل جیسی لگتی ہیں وہ جھیل سی گہری آنکھیں ہیں

ایمان خان......لاہور

غزل

یار بھی راہ کی دیوار سمجھتے ہیں مجھے
میں سمجھتا تھا میرے یار سمجھتے ہیں مجھے
میں تو چپ ہوں کہ اندر سے بہت خالی ہوں
اور سب لوگ پر اسرار سمجھتے ہیں مجھے
میں تو بدلتے ہوئے حالات میں ڈھل جاتا ہوں
دیکھنے والے اداکار سمجھتے ہیں مجھے
وہ جو اس پار ہیں ان کے لیے اس پار ہوں میں
وہ جو اس پار ہیں اس پار سمجھتے ہیں مجھے
نیک لوگوں میں مجھے نیک گنا جاتا ہے
اور گناہگار، گناہگار سمجھتے ہیں مجھے

محمد عمران ہاشمی......کھلن ہٹھاڑ

غزل

پرانی یادوں سے دامن چھڑا لیا جائے
بہتر یہی ہے سب کچھ بلا دیا جائے
ہمی پر ظلم ہوا قصور وار بھی ہم
آواز اٹھاؤ کہ یہ جھوٹ مٹا جائے
جو صرف آگ لگائے روشنی نہ دے
وہ چراغ رخ زیبا مٹا دیا جائے
قانون بنایا جائے اس شہر بے وفا کے لیے
ہر وفادار دیوار میں چنوا دیا جائے

مقدس حنا......

لمحہ......!

اک لمحہ جو
گزرے تو پل میں گزر جائے ہے
اور جو رُکے تو
طویل صدیوں پر محیط ہو جائے ہے
اس اک لمحے میں کچھ بھی ممکن ہے
کبھی خوشی کے بے کراں سمندر ملتے ہیں
تو کبھی دکھ کے طویل سلسلے
کبھی ملن رت کی خوشیاں
تو کبھی جدائی کے حائل طویل فاصلے
بس اک "لمحہ" پر منحصر ہے
زندگی انساں کی
وہ اک لمحہ جو
یوں بھی گزرتا ہے
کہ خوشی ملے تو جلدی
اور غم ملے تو طویل

مینا سید......قصور

زرین قمر

زیر نظر کہانی ملک میں ہونے والے آپریشن ضرب عضب کا ایک باب ہے' جو ہماری پاک فوج نے بیرونی اور ہماری صفوں میں چھپے دشمنوں پر لگائی۔ یہ اس کاری ضرب کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہمارا ازلی دشمن بلک کر اپنے بل سے باہر آکر ہمیں گیدڑ بھبکیاں دے رہا ہے اور لائن آف کنٹرول پر کبھی سول آبادیوں پر فائرنگ کرتا ہے تو کبھی اکا دکا تخریب کاری کی وارداتیں کرکے قوم کا مورال گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتا کہ اس کا سامنا ایک ایسی قوم اور ایسی آرگنائز فوج سے ہے جو وقت پڑنے پر جسموں پر بم باندھ کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ جاتی ہے۔

جذبوں کی آنکھ سے پڑھی جانے والی تحریر' جو آپ کے دوران خون کو تیز کر دے گی۔

فتح محمد کراچی کینٹ اسٹیشن پر ٹرین سے اترا تو بہت گھبرایا ہوا تھا وہ نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا وہ پہلی بار کراچی آیا تھا اور پشاور کے ایک چھوٹے سے علاقے کا رہنے والا تھا اسے اپنے دوستوں سے پتا چلا تھا کہ کراچی میں کاروبار بہت اچھا ہے وہاں چھوٹے سے چھوٹا کام کر کے بھی بہت زیادہ پیسہ کمایا جا سکتا ہے۔ خود اس کے کئی دوست کراچی آئے تھے اور یہاں کامیاب زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے پاس نہ تو اتنی رقم تھی اور نہ ہی کوئی جاننے والا کراچی میں رہتا تھا کہ جس کے سہارے وہ کراچی آ کر کوئی کاروبار کر سکے پھر اسے ایک اجنبی ملا جو اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوا وہ شخص دیکھنے میں بہت توانا، سرخ و سفید اور مضبوط اعصاب کا مالک تھا تعارف ہونے پر فتح محمد کو پتا چلا کہ وہ افغانستان کا رہنے والا ہے اور وہاں کے حالات کی وجہ سے اپنی فیملی کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گیا ہے اور پچھلے دو سال سے افغان بستی میں رہائش پذیر ہے۔ اس نے فتح محمد کو بتایا کہ اس کا نام محمد صدیق خان ہے اور وہ کراچی میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہے جو اسے کسی کاروبار سے لگا سکتے ہیں یا کوئی اچھی ملازمت دلوا سکتے ہیں اس بات نے فتح محمد کو بہت متاثر کیا پھر دو چار ملاقاتوں کے بعد صدیق خان نے اسے اپنے ایک دوست فرحان اللہ کے بارے میں بتایا جو کئی لوگوں کو کراچی میں سیٹ کرا چکا تھا۔

"تم کچھ انتظام کر کے کراچی جاؤ" ایک ملاقات پر محمد صدیق خان نے اس سے کہا۔ "میں نے فرحان اللہ سے بات کر لی ہے وہ تمہیں کام پر لگوا دے گا۔"

"لیکن میں اس سے کیسے ملوں گا، اسے اتنے بڑے شہر میں کہاں ڈھونڈوں گا؟" فتح محمد نے بے چارگی سے کہا۔

"تمہیں اسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں وہ تمہیں خود ڈھونڈ لے گا۔" محمد صدیق خان نے اپنی گھنی سیاہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے ڈھونڈ لے گا؟" فتح محمد نے حیرت سے کہا۔

"بھئی وہ مجھے کیسے ڈھونڈے گا، وہ مجھے جانتا تو نہیں اور میں بھی اسے نہیں جانتا ہم ایک دوسرے کو کیسے پہچانیں گے۔"

"جب تم جاؤ گے تو میں تمہارے وہاں پہنچنے کے بارے میں اسے فون کر کے بتا دوں گا میں تمہارے کراچی اسٹیشن پر پہنچنے کا وقت اور تمہارا حلیہ وغیرہ بتا دوں گا۔ یہ بتا دوں گا کہ تم کس ٹرین سے کس وقت کینٹ اسٹیشن پہنچو گے۔"

"اچھا" فتح محمد نے حیرت سے کہا لیکن اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ محمد صدیق خان سچ بول رہا ہے اسے دھڑکا ہی لگا ہوا تھا کہ کہیں کراچی جا کر وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے کیونکہ اگر اسے محمد صدیق خان کا دوست نہیں ملا تو وہ کیا کرے گا۔

"ارے پریشان کیوں ہو رہے ہو اگر تمہارے سوچنے کے مطابق ایسا ہو بھی گیا کہ میرا دوست تمہیں ملنے نہیں آیا تو تم دوسری ٹرین سے واپس گاؤں آ جانا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" فتح محمد نے اطمینان کا اظہار کیا پھر اس نے محمد صدیق خان کے کہنے کے مطابق کچھ پیسوں کا بندوبست کیا تھا جس میں اس کی ماں نے بہت مدد کی تھی کچھ رقم اس نے اپنے شوہر اور بچوں سے چھپا کر پس انداز کی ہوئی تھی اور کچھ رقم اس نے اپنے بھائی سے ادھار لے کر فتح محمد کو دی تھی۔

"دیکھ بیٹا احتیاط سے کام لینا کسی چور کے ہتھے نہ لگ جانا پیسے سنبھال کر رکھنا اور اپنے سامان کی

حفاظت کرنا۔" اس کی ماں نے چلتے چلتے اسے ہدایت کی تھی۔

"ٹھیک ہے ماں اب میں بچہ تو نہیں ہوں مجھے پتا ہے یہ رقم تو نے بڑی محنت سے اور بہت دنوں میں جمع کی ہے مگر تو فکر نہ کر تیرا بیٹا وہاں جا کر کوئی اچھا کاروبار کرے گا اور جب واپس آئے گا تو تیرا قرض اتارنے کے ساتھ ساتھ اپنی پیاری بہن نوراں کی شادی بھی دھوم دھام سے کرے گا۔" اس نے ماں سے وعدہ کیا۔

"ہاں بیٹا اب تو ہی ہمارا سہارا ہے۔" ماں نے پر امید انداز میں کہا۔

وہ اکیلا ہی اسٹیشن گیا تھا جہاں صدیق خان پہلے سے اس کا منتظر تھا وہ دونوں ٹرین کی آمد کا انتظار کرتے رہے تھے اس دوران محمد صدیق خان اس سے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھتا رہا تھا اور یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کتنی رقم لے کر جا رہا ہے۔

"پچاس ہزار روپے۔" فتح محمد نے بڑے فخر سے بتایا جیسے بہت بڑی رقم ہو۔

"بس؟" محمد صدیق خان نے "بس" پر بڑا زور دیا تھا۔

"ہاں...... کیوں؟" فتح محمد نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں، اگر کم ہوئے تو فرحان اللہ تمہاری مدد کر دے گا۔ وہ بہت رحمدل اور ساتھ ساتھ دریا دل بھی ہے۔" محمد صدیق خان نے ہنستے ہوئے کہا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا جب وہ بات کرتا تھا تو بار بار اپنی سیاہ گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا شاید یہ اس کی عادت تھی جو غیر ارادی طور پر اس سے سرزد ہوتی تھی۔

"اچھا ٹرین آنے والی ہے میں فرحان کو فون کر دیتا ہوں۔" اس نے جیب سے سرخ رنگ کا موبائل نکالتے ہوئے کہا اور فتح محمد حسرت سے اس کے موبائل کو دیکھنے لگا اس کے پاس موبائل نہیں تھا اور اس کی حسرت تھی کہ کبھی وہ بھی اتنا کمائے کہ موبائل فون خرید سکے۔

"فرحان۔" دوسری طرف سے کال ریسیو ہونے کے بعد محمد صدیق نے بات شروع کی۔

"دیکھو دوست میں ایک شخص فتح محمد کو تمہارے پاس کراچی بھیج رہا ہوں یہ میرا بہت ہی اچھا دوست ہے، اسے کاروبار کی تلاش ہے تمہیں پتا ہے میں دوستوں کا دوست ہوں اور اگر کسی کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو ضرور کرتا ہوں تم میری خاطر اسے کسی کاروبار سے لگوا دو۔" محمد صدیق خان نے کہا اور پھر رک کر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ فتح محمد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، وہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ پرسوں صبح نو بجے کی ٹرین سے کراچی کینٹ اسٹیشن پہنچے گا اس کا اکنامی کلاس کا ٹکٹ ہے اس نے نیلے رنگ کا شلوار قمیص پہنا ہوا ہے اور اس کے ساتھ بس ایک چھوٹا سیاہ رنگ کا اٹیچی کیس ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

"اس کے بال سیاہ لمبے گھنگھریالے ہیں اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے ہے پشاوری ٹوپی اور پاؤں میں پشاوری چپل ہے براؤن کلر کی۔" اس نے فرحان اللہ سے بات کر کے فون بند کر دیا تھا اور فتح محمد کی طرف دیکھنے لگا تھا جو حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا اس نے کتنی آسانی پیدا کر دی تھی اب تو اس کا دوست فرحان اللہ اسے با آسانی پہچان سکتا تھا۔

"اچھا دوست ٹرین آ گئی ہے۔" صدیق خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ، گھبرانا نہیں اللہ تمہاری مدد کرے گا۔" محمد صدیق نے اسے ٹرین میں چڑھانے کے بعد

رخصت کرتے ہوئے کہا۔
''اللہ حافظ۔'' فتح محمد نے بھی ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا۔
پھر کراچی تک سارا راستہ وہ گھبرایا گھبرایا سا رہا تھا ٹرین میں اس کے ڈبے میں موجود ایک نوجوان نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ کاروباری مرکز ہونے کی وجہ سے کراچی جاتے ہیں اور وہاں ملازمت کر کے پیسے گھر بھیجتے ہیں اسے بھی کوئی نہ کوئی ملازمت یا کاروبار مل جائے گا۔
اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ انتظار گاہ کے دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا تھا اس نے اپنا سیاہ اٹیچی کیس خاص طور سے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا تا کہ فرحان وہ دیکھ کر اور اس کا حلیہ دیکھ کر اسے آسانی سے پہچان لے۔
اسے وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک لمبا، سرخ و سفید رنگت والا شخص اس کی طرف تیزی سے چلتا ہوا آیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا اٹیچی کیس چھیننے والے انداز میں اس سے لینے لگا۔
''آؤ جی...... دوستو...... آؤ۔'' اس نے کہا اور فتح محمد نے اٹیچی کیس پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر دی۔
''کون ہو تم...... کیا ہے تم ہمارا اٹیچی کیس کیوں چھین رہے ہو؟'' فتح محمد نے تیزی سے کہا تو وہ شخص سیدھا کھڑا ہو کر اسے گھورنے لگا۔
''کیا تم فتح محمد نہیں ہے۔'' اس نے پوچھا۔
''ہاں میں فتح محمد ہوں۔''
''تو پھر آؤ نا ہمارے ساتھ ارے پریشان مت ہو، ہم محمد صدیق خان کا دوست ہے فرحان اللہ۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تمہیں محمد صدیق خان نے ہمارے بارے میں بتایا تو ہوگا۔'' اس نے پوچھا تب فتح محمد نے بغور اس کا جائزہ لیا سفید شلوار قمیص اس پر سرمئی رنگ کی واسکٹ سر پر براؤن کلر کی بڑی سی پگڑی اور چہرے پر سیاہ رنگ کی بڑی بڑی مونچھیں جو اس کی لمبی اور گھنی داڑھی میں گم ہو گئی تھیں۔
''میں محمد صدیق کا دوست ہوں، یہاں آنے والے کافی لوگوں کو کاروبار پر لگوا چکا ہوں۔'' اس نے بتایا۔
''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' فتح محمد نے اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا وہ اس کا اٹیچی کیس پکڑنے کے بعد ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔
''ہم تمہیں پہلے اپنے ڈیرے پر لے جائے گا۔'' فرحان اللہ نے کہا۔
''بھئی تم تھکا ہوا آیا ہے، ابھی آرام کرنا کچھ کھانا پیا ادھر تمہارے ٹھہرنے کا بھی بندوبست کر دیا ہے باقی باتیں کل کریں گے آج تم مزے کرو۔'' فرحان اللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
پھر ٹیکسی میں فرحان اس سے اس کے بارے میں سوالات کرتا رہا تھا اس نے جب اپنی رقم کے بارے میں بتایا تھا تو فرحان نے ٹیکسی ہی میں اس سے وہ رقم لے لی تھی۔
''رقم تو میرے پاس محفوظ رہے گی۔'' اس نے نوٹوں کی گڈی اپنی قمیص کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔
''ڈیرے پر ہر طرح کے لوگ آتے ہیں کسی کا کوئی پتا نہیں میں نہیں چاہتا کہ تمہاری رقم چوری ہو جائے میرے پاس امانت رہے گا اور کاروبار کے لیے تمہیں جب ضرورت پڑے گی تو لے لینا۔''
''ٹھیک ہے۔'' فتح محمد نے اطمینان سے کہا۔
کچھ ہی دیر میں وہ لوگ ڈیرے پر پہنچ گئے تھے۔

جہاں محمد صدیق خان نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی تھی یہ ڈیرہ ایک چھوٹی سی بستی میں قائم تھا۔ جہاں کئی شہروں سے آئے ہوئے لوگ مقیم تھے رات کا کھانا کھانے کے بعد محمد صدیق خان نے اسے ایک بڑے ہال میں چارپائی پر لیٹنے کو کہا تھا جہاں اور بھی بہت سی چارپائیاں تھیں جن پر دوسرے شہروں سے آنے والے لوگ لیٹے ہوئے تھے ڈیرہ ایک سرائے کا منظر پیش کررہا تھا لیکن ایک بات فتح محمد کے لیے حیران کن تھی کہ یہاں پر قیام وطعام کا بہت اچھا انتظام تھا لیکن اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جارہا تھا۔

دوسرے روز اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب محمد صدیق خان نے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک موبائل فون تحفے میں پیش کیا۔

''ارے یہ کیا؟'' فتح محمد نے حیرت سے کہا اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی زندگی کی اہم ترین خواہش یوں آسانی سے پوری ہوجائے گی۔

''بھئی میں نے تم سے صبح ناشتے پر وعدہ کیا تھا نا کہ میں تمہیں موبائل فون دلواؤں گا۔''

''ہاں لیکن تم تو یہ مجھے تحفے میں دے رہے ہو میں نے تو خریدنے کی بات کی تھی۔'' فتح محمد نے کہا۔

''ہاں کوئی بات نہیں فی الحال یہ تحفہ ہی سمجھو جب تم سیٹ ہوجاؤ کاروبار مل جائے اور کچھ کمانے لگو تو پھر اس کی قیمت دے دینا دراصل ابھی تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔ یہاں کراچی میں یہ بہت ضروری ہے۔''

''مجھے کیا ضرورت ہوگی، تم مجھے کسی سے ملواؤ گے تو اس سے آمنے سامنے ہی بات ہوگی۔''

''ہاں لیکن ضروری نہیں کہ ایک ملاقات میں ہی کام ہوجائے ہوسکتا ہے کہ تمہیں کئی بار اس سے ملنا پڑے یہاں ملنے کے لیے بھی وقت لینا پڑتا ہے ہر

خلیفہ ہارون رشید کا قصہ

ہارون رشید بادشاہ کا ایک لڑکا غصہ سے بھرا ہوا باپ کے سامنے آیا اور کہا: فلاں سردار کے لڑکے نے مجھ کو ماں کی گالی دی ہے۔ ہارون رشید نے سلطنت کے ارکان سے دریافت کیا: ایسے شخص کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ ایک نے قتل کرنے کا ارشاد کیا' دوسرے نے زبان کاٹ دینے کا اور تیسرے نے مال کی ضبطی کا اور جلاوطن کرنے کا مشورہ دیا۔ ہارون رشید نے بیٹے سے کہا: اے بیٹے اخلاق کی بات یہ ہے کہ اس کو معاف کردو اگر معاف نہیں کرے تو تم بھی ماں کی گالی دے دو' گالی دینے میں اس کا خیال رکھنا کہ حد سے نہ بڑھو اگر ایسا ہوا تو پھر تمہاری طرف سے ظلم اور مخالف کی طرف سے دعویٰ ہوگا۔

عقل مند کے نزدیک وہ شخص بہادر نہیں ہے جو مست ہاتھی سے جنگ کرے بلکہ حقیقی بہادر وہ ہے جب اس کو غصہ آجائے تو حق کے خلاف نہ کہے یعنی نامناسب باتیں زبان سے نہ نکالے۔

☆☆☆

ایک سمجھ دار تاجر کی حکایت

ایک تاجر کو تجارت میں ہزار دینار کا نقصان ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا: مناسب نہیں ہے کہ کسی سے اس کا ذکر کیا جائے۔ لڑکے نے عرض کیا: ابا! آپ کا حکم ہے اس لیے میں کسی سے نہیں کہوں گا لیکن مجھے اس کے فائدے پر آگاہ رہنا چاہیے کہ چھپانے میں کیا مصلحت ہے؟ باپ نے کہا: تاکہ مصیبت ایک سے دو نہ ہوجائیں' ایک تو مال کا نقصان دوسرے دشمنوں کی خوشی۔

فائدہ: اپنے نقصان کا ذکر دوستوں کے سوا کسی اور سے نہیں کرنا چاہیے' دشمنوں کو سنانے سے نقصان تو پورا نہیں ہوسکتا البتہ ان کو خوش ہونے کا موقع ملے گا جو ایک مستقل مصیبت ہوگی۔

مرسلہ: عبدالستار ...... فیصل آباد

شخص بہت مصروف ہے۔" فرحان اللہ نے کہا۔
"اچھا ٹھیک ہے۔" فتح محمد نے کہا اور موبائل فون لے کر جیب میں رکھ لیا۔
دوسرے دن فرحان اللہ اس کے ساتھ کافی دیر رہا تھا۔ اس نے اسے کراچی کے مختلف مقامات کی سیر بھی کرائی تھی اور سیر کے دوران ایک دوست کا تذکرہ کیا تھا جو لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاروبار لگوا کر دیتا تھا اس کے علاوہ اس نے فتح محمد کو موبائل استعمال کرنا اتنا سکھا دیا تھا کہ وہ آنے والی کال ریسیو کر لے اور کسی نمبر کو ملا کر کال کر لے اس نے اسے اپنا نمبر بھی موبائل میں سیو کر دیا تھا۔
"کل میں تمہیں اس شخص سے ملواؤں گا۔" فرحان اللہ نے فتح محمد سے رات کے وقت کہا جب وہ اس کے ساتھ ڈیرے پر پہنچ گیا تھا۔
"میرا دوست صدر کے علاقے میں ایک دکان کا مالک ہے۔ میں اس کے پاس تمہیں لے چلوں گا۔" فرحان اللہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔" فتح محمد نے کہا۔
"کوئی بات نہیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔" فرحان اللہ نے جواب دیا۔
دوسرے روز دوپہر کے وقت فرحان اللہ اسے لے کر کراچی کے بارونق علاقے صدر میں پہنچا تھا تاکہ اسے اپنے کاروباری دوست سے ملوا سکے جب وہ اس کی دکان پر پہنچا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا اس کے ملازم نے بتایا کہ اس کا مالک ایک گھنٹے بعد آئے گا۔
"اچھا ٹھیک ہے ہم ایک گھنٹے بعد آ جاتے ہیں۔" فرحان اللہ نے کہا اور فتح محمد کو ساتھ لے کر ایک قریبی ہوٹل میں جا بیٹھا۔
"چلو دوپہر کا کھانا ہی کھا لیں اتنی دیر میں وہ آ جائے گا تو میں تمہیں ملوا دوں گا۔" فرحان اللہ نے کہا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔
کھانا کھانے کے بعد اچانک فرحان اللہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے اور وہ کچھ مضطرب سا لگنے لگا۔
"کیا ہوا کیا بات ہے تم اچانک پریشان نظر آ رہے ہو؟" فتح محمد نے پوچھا۔
"ارے میں بھول گیا تھا مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے بس دس پندرہ منٹ لگیں گے تم ایسا کرو یہاں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں پریشان مت ہونا، میں اگر لیٹ ہوا تو تمہیں فون کر دوں گا تمہیں پتا ہے نا کہ کیسے ریسو کرنا ہے۔" فرحان اللہ نے کہا تو فتح محمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ہاں یہ والا بٹن دبانا ہے۔" اس نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔
"ہاں بس بس ٹھیک ہے جیسے ہی تمہارے موبائل کی گھنٹی بجے گی تم اس بٹن کو دبا کر کال ریسیو کر لینا میں تم سے بات کر لوں گا۔" اس نے کہا۔ پھر وہ اپنا سیاہ بیگ وہیں میز کے قریب رکھ چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔
"میرا یہ بیگ بھی یہاں رکھا ہے۔ میں بھی جلد ہی آ جاؤں گا۔" اس نے کہا فتح محمد نے اثبات میں سر ہلایا اور فرحان اللہ وہاں سے چلا گیا فتح محمد کو حیرت تو ہوئی تھی کہ فرحان نے پہلے اس سے مصروفیت کا ذکر نہیں کیا تھا۔
فتح محمد تقریباً دو گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا تھا اس عرصہ میں ہوٹل کا ویٹر بھی دو بار اس کے پاس آیا تھا اور کھانے کے بل کی ادائیگی لینا چاہی تھی لیکن فتح محمد کے پاس پیسے نہیں تھے وہ تو ساری رقم فرحان اللہ کو دے چکا تھا۔
"میرا دوست مجھے یہاں بٹھا کر گیا ہے یہ اس کا

بیگ بھی رکھا ہے ابھی آ جائے گا تو تمہارے پیسے دے دے گا۔'' فتح محمد نے کہا اس وقت اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی اور اس نے میز پر رکھا ہوا فون اٹھایا۔

جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی تھی اس کی میز کے قریب رکھا ہوا بیگ ایک دھماکے سے پھٹا تھا اور فتح محمد کے ساتھ ساتھ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے بھی پرخچے اڑ گئے تھے ہوٹل میں آگ لگ گئی تھی قریب کی عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے ہوٹل کے اندر اور باہر زخمی زمین پر پڑے چیخ رہے تھے اور ہوٹل کے اندر بہت سے لوگوں کے زخمی بدن پڑے تھے۔

چند ہی لمحوں میں شہر کے رفاہی اداروں کی ایمبولینس سائرن بجاتی وہاں پہنچ گئی تھیں اور زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر اسپتالوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس سارے ہنگامے سے کچھ دور ایک بلڈنگ کی آڑ میں فرحان اللہ کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں موبائل تھا جس سے اس نے فتح محمد کو چند لمحے پہلے کال کی تھی اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی چند لمحے وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ ایک تنگ سی گلی میں چلا گیا تھا اور حادثے کی جگہ پر موجود افراتفری میں لوگوں نے اس کی موجودگی کو محسوس بھی نہیں کیا تھا۔

اس واقعے کے دو روز بعد ہی ایک مذہبی جلوس میں بھی یکے بعد دیگر دو دھماکے ہوئے تھے جس میں ڈیڑھ سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے تھے اور کافی لوگ مارے گئے تھے۔ اس قسم کے خودکش دھماکے روزمرہ کا حصہ بن گئے تھے۔ پاکستان اور اسلام کے دشمن کہیں خودکش جیکٹس پہن کر حملے کر رہے تھے کہیں موبائل ڈیوائس کے ذریعے پلانٹڈ بموں کو اڑا کر لوگوں میں خوف و ہراس پھیلایا جا رہا تھا اور کہیں انہیں موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔

ان حادثات کو روکنا بظاہر حکومت کے لیے دشوار

نظر آرہا تھا خودکش حملہ آور اچانک نہ جانے کہاں سے ملک میں گھس آئے تھے جو آئے دن اس قسم کی کارروائیاں کر رہے تھے اور محب وطن پاکستانیوں کو بے موت مار رہے تھے۔

2 نومبر 2014ء واہگہ اور لاہور بارڈر پر روزانہ کے معمول کی پریڈ کے دوران خودکش حملہ ہوا جس میں 55 افراد شہید ہو گئے اور 200 کے قریب زخمی ہوئے۔"

اس خبر نے لوگوں کے دل دہلا دیے دشمن اب ہمارے اندر گھس کر ہمیں نقصان پہنچا رہا تھا۔

11 دسمبر 2014ء کو ایک بار پھر سارے پاکستان میں صف ماتم بچھ گئی جب پشاور آرمی پبلک اسکول میں طالبان نے گھس کر اساتذہ اور بچوں کا قتل عام کیا اور ان کے لیڈر کی طرف سے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ اس کارروائی کا جواب ہے جو آپریشن ضرب عضب کی صورت میں ان کے خلاف کی جا رہی ہے۔

اس طرح کے سیکڑوں واقعات سے عوام دکھ و غم کی تصویر بن گئے تھے ہر دوسرے گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی کسی کا بیٹا، کسی کا باپ کسی کے بچے ان حادثات کا شکار ہو رہے تھے یا زخمی ہو کر عمر بھر کے لیے اپاہج ہو رہے تھے۔ دشمن کے خلاف ایک سخت جواب دینا ناگزیر تھا چنانچہ فیصلہ ہوا اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے کارروائیاں تیز کر دی گئیں۔

ملک کے تمام اداروں کو الرٹ کر دیا گیا اور تمام چھوٹے بڑے متاثرہ شہروں میں حساس اداروں نے اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔

خاص طور سے شمالی وزیرستان پاکستان دشمن عناصر اور تنظیموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ملک بھر میں تخریبی کارروائیاں کرنے والے وہیں جا کر پناہ لیتے تھے اور وہیں سے پاکستان کے مختلف شہروں کو نشانہ بناتے تھے۔ خاص کر کوئٹہ، پشاور (پشاور کا قصہ خوانی بازار) وغیرہ کثرت سے ان واقعات کا شکار ہو رہے ہیں۔

پھر 2014ء ہی میں کوئٹہ کے علاقے میں کثرت سے کئی موبائل ڈیوائس پلانٹڈ دھماکے ہوئے حکام پتا لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں لیکن کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ کیونکہ یہ خاص قسم کے موبائل تھے جو ملک کے اندر نہیں خریدے جا رہے تھے پھر ملک کے حساس اداروں کو ایسے گروہ کا پتا چلا جو ملک میں یہ کام کرانے میں ملوث تھا۔ یہ پانچ افراد پر مشتمل گروپ تھا جن میں سے چار غیر ملکی تھے جن کا تعلق پڑوسی ممالک بھارت اور افغانستان سے تھا اور ایک مقامی شخص تھا جو وزیرستان کا رہنے والا تھا اور باقی چاروں سے عمر میں کم تھا۔

2014ء میں ہونے والے کوئٹہ دھماکوں کے صرف چوبیس گھنٹے بعد ان لوگوں کو ٹریس کر لیا گیا تھا جو شمالی علاقہ جات میں موجود تھے ان کے سرغنہ کا نام بندے لال تھا لیکن وہ مقامی طور پر محمد صدیق خان کا نام استعمال کرتا تھا ان پانچوں افراد کے گھروں اور چیزوں کی تلاشی کے دوران پولیس کو چار رسیدیں ملیں جو ان میں سے ایک کے سامان سے ملیں یہ چار رسیدیں موبائل فون کی تھیں جو ٹرائی بینڈ ورژن کے تھے اور استعمال کر کے پھینک دیے جانے والے تھے اور دنیا میں کسی بھی جگہ استعمال کیے جا سکتے تھے ان میں سے ایک قیمتی سم کارڈ موجود تھا جس کی مالیت ٹوئنٹی پاؤنڈ اسٹرلنگ تھی۔ وہ تمام فون نقد خریدے گئے تھے اور سب موقع سے غائب تھے۔ پولیس کو صرف ان کی رسیدیں ملی تھیں انہیں بھی چھپانے کی غرض سے وہاں رکھا گیا تھا۔

پولیس نے فون غائب ہونے کے باوجود ان کے

نمبرز ٹریس کر لیے تھے اور انہیں ریڈ فلیگ کر دیا تھا تا کہ اگر پھر انہیں استعمال کیا جائے تو انہیں پکڑا جا سکے۔

یہ بھی پتا لگا لیا گیا تھا کہ محمد صدیق خان اور اس کے گروپ کا سب سے قریبی ساتھی فیض اللہ پچھلے دنوں پاکستان آیا تھا اور یہاں تین ماہ گزارنے کے بعد واپس گیا تھا لیکن یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی یہاں کس سے ملنے آئے تھے لیکن کوئٹہ دھماکوں کے کئی ہفتے بعد ایک غیر ملکی ٹی وی سے نشر ہونے والی ایک خبر اور ویڈیو کے ذریعے یہ بات پتا چل گئی تھی کہ صدیق خان نے پاکستان کے وزٹ کے دوران وہ ویڈیو بنائی تھی اور وہ دھماکوں میں ملوث تھا۔

پھر 2014ء کے آخر تک یہ بات واضح طور پر سامنے آ گئی کہ ایک ''لی وہائٹ'' سیل فون جیسے ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا اس گروپ کو تحفے میں دیا گیا جو پاکستان میں کارروائیاں کر رہا تھا لیکن دینے والے کا سراغ نہیں ملا تھا۔

مختلف مقامات پر کارروائیاں کرنے کے بعد گروہ کے لوگ زیادہ تر پشاور کے شمالی پہاڑی سلسلوں میں پناہ لیتے تھے جہاں مختلف قبائل آباد تھے۔

اس گروپ کا ایک فرد عبدالٰہی تھا اس کا سیل فون اس کے لیے تفریح کا ذریعہ تھا اور بدقسمتی سے اس کے فون کی بیٹری کی چارج ختم ہو گئی تھی اور وہ اسے چارج کرنا بھی بھول گیا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا عبدالٰہی اس وقت اس گھر میں اکیلا تھا جہاں اس نے پناہ لی ہوئی تھی اس کے ساتھی نماز پڑھنے گئے تھے اور ایک ساتھی محمد صدیق خان اوپری منزل پر سونے چلا گیا تھا۔

عبدالٰہی کا بھائی کوئٹہ شہر کے مغربی حصے میں سیکڑوں میل دور رہتا تھا اس کی ماں بیمار تھی وہ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا اس نے سوچا کہ وہ ایک چھوٹی سی کال کرے گا لیکن اس کے فون کا چارج ختم ہو چکا تھا اس کی نظر قریب ہی میز پر رکھے ہوئے صدیق خان کے فون پر پڑی جو اپنا موبائل وہاں بھول گیا تھا اس کا فون چارج تھا عبدالٰہی نے سوچا چھوٹی سی کال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے وہ چھوٹی سی کال کر کے ماں کی خیریت معلوم کر لے گا۔ اس نے اپنے بھائی کا نمبر ڈائل کیا اور اسے دوسری طرف سے دوسرے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دی اور اسی لمحے اسلام آباد میں ایک کاؤنٹر ٹیررازم سینٹر کے لسنگ ڈپارٹمنٹ میں ایک چھوٹی سرخ بتی روشن ہو گئی۔

ڈیپارٹمنٹ میں موجود پاکستان آرمی کا آن ڈیوٹی آفیسر جو مانیٹرنگ کر رہا تھا اس نے میز پر لگا ایک بٹن دبایا اور اس لمحے اس کا آفیسر آن لائن ہو گیا۔ وہ چند لمحے فون پر ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے سارجنٹ سے پوچھا۔

''لگتا ہے وہ اپنی ماں کے بارے میں کوئی بات کر رہا ہے۔'' سارجنٹ نے چند لمحے سننے کے بعد کہا۔

''یہ شاید اپنے بھائی سے بات کر رہا ہے۔''

''کہاں سے؟'' آفیسر نے پوچھا۔

''پشاور ٹرانسمیٹر سے۔'' سارجنٹ نے چیک کرنے کے بعد جواب دیا۔

اس کے بعد سارجنٹ کو مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ پوری کال آٹومیٹکلی ریکارڈ ہو گئی تھی اور اس پر کام بھی شروع ہو گیا تھا لیکن سارجنٹ کا خیال تھا کہ اتنی چھوٹی کال پر کسی جگہ کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا اسے یقین تھا کہ جو کوئی بھی کال کر رہا ہے وہ اتنا احمق نہیں ہو گا کہ زیادہ وقت خرچ کرے۔

سارجنٹ نے میز پر لگے تین مزید بٹن دبائے اور پشاور میں موجود سی ٹی سی کے ہیڈ آفس کے فون کی گھنٹی

بجی یہ کال پشاور میں موجود ایک آرمی آفیسر کرنل رزاق نے ریسیو کی تھی۔

''کتنی دیر پہلے۔''اس نے کچھ دیر کال سننے کے بعد پوچھا۔

''تقریباً تین منٹ پہلے۔''اسے بتایا گیا اور اس نے اسی لمحے اپنی ٹیم کے ساتھ کام شروع کر دیا ادھر اسلام آباد میں سی ٹی سی میں موجود سارجنٹ نے اپنے آفیسر کو بتایا کہ کال ختم ہوگئی ہے لیکن فون کی لائن کاٹی نہیں گئی۔

پشاور میں موجود چار منزلہ گھر کے چھوٹے سے کمرے میں عبدالٰہی نے فون کرنے کے بعد جلدی میں صدیق خان کا فون ایسے ہی ٹیبل پر رکھ دیا تھا کیونکہ اس نے صدیق خان کے واپس آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی تھی جلدی میں وہ فون آف کرنا بھول گیا تھا اور کرنل رزاق کی ٹیم کے لیے اتنا وقت کافی تھا۔

اسی لمحے صدیق خان کمرے میں داخل ہوا اور اس نے میز پر رکھا ہوا فون اٹھایا جو آن تھا اس نے فون آف کیا اور اسے جیب میں رکھ لیا وہ سمجھا تھا کہ شاید وہی جلدی میں فون آف کرنا بھول گیا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ پاکستان آرمی کے جوانوں کے لیے اس تک پہنچنے کے لیے اتنا وقت کافی تھا انہوں نے اس کے مقام کا پتا لگا لیا تھا اور کرنل رزاق اپنے چھ ساتھیوں کی ٹیم کے ساتھ وہاں کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

کرنل رزاق پینتیس سالہ نوجوان تھا شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا بہت جوشیلا اور وطن پرست وہ چاہتا تھا کہ اسے آج جو مشن ملا ہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہو فیصلہ کیا کہ وہ اس چھوٹے سے گھر پر رات کے وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ ریڈ کرے گا اس نے دن کی روشنی میں جگہ کا معائنہ کر لیا تھا اس مقصد کے لیے وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سادہ لباس میں اس علاقے میں پہنچا یا تھا اس نے اندازہ لگایا تھا کہ جس گلی میں گھر واقع تھا وہ بہت تنگ تھی اور اس میں ایک وقت میں ایک گاڑی ہی گزر سکتی تھی اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ رات کے وقت بھی وہ وردی میں نہیں ہوں گے۔

پھر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ صبح تین بجے کے قریب آپریشن کیا جائے سب فوجی مقامی لباس یعنی شلوار قمیص میں ہوں گے یا لمبے چوغے پہنے ہوں گے جیسے کہ قبائلی پہنتے ہیں تاکہ کوئی ان کی موجودگی پر نہ چونکے اس کے علاوہ انہوں نے گاڑیاں بھی وہ لی تھیں جو مقامی طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ خاص طور سے پرانے علاقے اور قصہ خوانی بازار کے علاقے میں اس نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ آپریشن نہایت خاموشی سے کیا جائے گا۔

موقع پر پہنچنے کے بعد کرنل رزاق نے چار جوانوں کو بلڈنگ کی چھت پر بھیجا تھا جو قبائلی لباس میں تھے اور وہاں پہنچنے کے بعد کرنل رزاق کے سگنل کا انتظار کر رہے تھے خود کرنل رزاق چھ جوانوں کے ساتھ سڑک کے راستے آگے بڑھا تھا سب کی گنیں ان کے لباس کے اندر چھپی تھیں اور سب سے آگے پوائنٹ مین تھا جسے وہ کور کر رہے تھے۔

جب وہ سب مکان کی سیڑھیوں کی دیوار تک پہنچ گئے تو کرنل نے اشارہ کیا اور جوانوں نے اپنی گنیں تیار کر لیں اور ٹیم مکان میں داخل ہوگئی چھت پر سے تین افراد تیزی سے نیچے آئے جبکہ چوتھا چھت پر ہی رک گیا تا کہ اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو وہ اسے روک سکے یہ سب کچھ اتنی پھرتی سے کیا گیا تھا کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا تھا۔

آپریشن میں حصہ لینے والے اسکواڈ کو اندازہ نہیں

تھا کہ گھر میں کتنے افراد موجود ہیں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ انہیں ایک مسلح مقابلے کا سامنا کرنا پڑے اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی فیملی ہی رہتی ہو۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گھر اندر سے کیسا بنا ہوا ہے۔ کس منزل میں کتنے کمرے ہیں وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ایک ریڈ فلیگ فون سے وہاں سے کال کی گئی تھی۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو ایک کمرے میں چار افراد بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ دو سیکنڈ کے لیے کرنل رزاق اور اس کی ٹیم کو یہ محسوس ہوا جیسے انہوں نے کسی بے قصور فیملی کے گھر پر حملہ کر دیا ہے پھر انہیں اندازہ ہوا کہ چاروں افراد کے چہرے پر گھنی سیاہ رنگ کی داڑھیاں تھیں چاروں پہاڑی قبائلی باشندے لگ رہے تھے جن میں سے ایک بہت تیز تھا اور اس نے ہی سب سے پہلے ردعمل کا اظہار کیا تھا اس نے اپنے لباس کے نیچے ہاتھ ڈال کر گن نکال لی تھی وہ عبدالٰہی تھا اور اپنی اس حرکت کے نتیجے میں موت کی نیند سو گیا تھا کیونکہ کرنل رزاق کے ایک ماتحت نے اس کے سینے میں ایم پی 5 کی چار گولیاں اتار دی تھیں باقی تین افراد نے مزاحمت نہیں کی تھی اور ہتھیار ڈال دیے تھے کرنل رزاق بھی انہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔

پانچویں شخص کی موجودگی کا احساس انہیں اس آواز سے ہوا تھا جو بیڈ روم سے آئی تھی اور ٹیم کے پوائنٹ مین نے دھکا دے کر بیڈ روم کا دروازہ توڑ دیا تھا اور دوسی ٹی سی کے جوان اندر داخل ہو گئے تھے ان کے پیچھے کرنل رزاق بھی تھا کمرے کے درمیان میں انہیں ایک درمیانی عمر کا شخص کھڑا ملا تھا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں نفرت جھانک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں توشیبا کا ایک لیپ ٹاپ تھا جسے لے کر شاید وہ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب اسے احساس ہوا کہ اب اس کے پاس وقت نہیں ہے تو اس نے لیپ ٹاپ فرش پر پھینکا اور کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

چوتھی منزل سے نیچے چھلانگ لگانے پر اس کی چیخ نکلی تھی اور پھر زمین پر جا گرا تھا اس کے گرنے کی آواز اور پھر فوجیوں کے باہر نکلنے پر وہاں ارد گرد کے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے گلی میں شور برپا ہو رہا تھا اور لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کرنل رزاق نے فوراً اپنی گاڑیوں پر تعینات فوجیوں کو کال کر کے وہاں بلایا تھا جو سادہ کپڑوں میں تھے اور تعداد میں پچاس تھے۔

وہ تیزی سے گلی میں آئے تھے اور صورت حال کو سنبھالا تھا انہوں نے اس گھر کو سیل کیا تھا اور کرنل رزاق کی خواہش تھی کہ ہر پڑوسی کا انٹرویو لیا جائے اور ان لوگوں کے بارے میں جو بھی معلومات ملیں انہیں ریکارڈ پر لیا جائے اور سب سے زیادہ اس نے مالک مکان کو اہمیت دی تھی جو ایک قالین فروش تھا۔

کچھ ہی دیر میں ایک ایمبولینس آئی تھی اور مرے ہوئے شخص کو اسٹریچر پر ڈال کر پشاور کے جنرل اسپتال کے مردہ خانے لے گئی تھی کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ مرنے والا کون تھا گرفتار قیدیوں کو گاڑیوں کی طرف لے جایا گیا تھا جنہیں مسلح افراد لے گئے تھے کیونکہ اس قبائلی علاقے میں یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جہاں لوگوں کا اپنا قانون ہو وہاں کرنل رزاق کو لوگوں کی طرف سے کوئی رعایت ملنے کا امکان نہیں تھا لاشوں اور قیدیوں کے جانے کے بعد اس نے عمارت سے جو بھی کام کی شے ملی جس سے اس کیس میں مدد مل سکتی تھی وہ ساتھ لے لی تھی اس میں لیپ ٹاپ، موبائل فونز، کاغذات، پاسپورٹ اور خاص طور سے ریڈ فلیگ موبائل بھی شامل تھے۔

عوام کو بتانے کے لیے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ

ایک مطلوب مجرم حراست کے دوران بلڈنگ سے کود کر جاں بحق ہو گیا۔

کرنل رزاق جب جائے وقوعہ سے واپس آیا تو اس کے ساتھ کئی بیگوں میں وہاں سے لایا ہوا سامان تھا اور موقع سے گرفتار ہونے والے تین افراد اس کی بلڈنگ کے تہہ خانہ میں قید کردیے گئے تھے وہ انہیں عام جیل میں بھیجنے کے حق میں نہیں تھا اس کا امکان زیادہ تھا کہ وہ یا تو فرار ہو جائیں گے یا پھر قید میں ہی خودکشی کرلیں گے ان کے نام مرکزی حکومت کو بھیج دیے گئے تھے اور حساس اداروں کو بھی انفارم کردیا گیا تھا۔ کرنل رزاق کو ان قیدیوں سے بہت سی معلومات حاصل ہونے کی توقع تھی۔ چھت سے گر کر مرنے والے شخص کا سر پھٹ چکا تھا اور چہرہ بالکل مسخ ہو گیا تھا لیکن کرنل رزاق نے شہر کے بہترین فیشل سرجن کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے اس کا چہرہ کافی حد تک درست کردیا تھا اور جب اس نے اپنا کام مکمل کیا تو اس لاش کے چہرے کی تصویر لے لی گئی اور ایک گھنٹے بعد کرنل رزاق کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے پتا چلا کہ سی ٹی سی پشاور میں موجود دہشت گردوں (جن کا تعلق القاعدہ سے ہے) یہ شخص ان میں سے ایک تھا اور حکومت کو مطلوب تھا اس نے تقریباً چالیس ملکوں کی شہریت حاصل کی ہوئی تھی موقع سے ملنے والے گیارہ پاسپورٹ بھی جعلی تھے جن میں اس شخص کی تصاویر مختلف قسم کے حلیوں میں لگی ہوئی تھیں یعنی وہ حلیے بدل کر بھی سفر کرتا تھا۔

اگلی صبح ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے کرنل رزاق کے قیدی اور جائے وقوعہ سے ملنے والا سامان پاکستان آرمی کو بھیج دیا گیا تھا جس کے ہاتھ میں اس آپریشن کی کمانڈ تھی۔

جیسے ہی پشاور سے قیدیوں کو پکڑا گیا تمام حساس ادارے حرکت میں آ گئے اور پھر چھت سے گر کر مرنے والے کی شناخت ہو گئی۔ اس کا اصلی نام بندے لال تھا اس کا مذہب ہندو تھا وہ پاکستان میں محمد صدیق خان کے نام سے جانا جاتا تھا اور القاعدہ کے لیے فنڈنگ کرتا تھا اور کئی زبانوں کا ماہر تھا۔

کرنل رزاق کو بہت امید تھی کہ مجرمین کی رہائش گاہ سے جو مواد انہیں ملا ہے وہ اور خاص طور سے ملنے والا لیپ ٹاپ ان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے ان چیزوں کی مدد اور قیدیوں کے بیانات سے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھے گا اور انہیں اپنے آپریشن ضرب عضب کے لیے دشمنوں تک رسائی کے کچھ نہ کچھ ثبوت ضرور مل جائیں گے اور پھر ہوا بھی یہی تھا۔

اس آپریشن اور اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں دہشت گردوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں جس قسم کے انکشافات ہوئے انہوں نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا عوام کو نقصان پہنچانے والی دہشت گرد تنظیموں کی خبریں بہت مضبوط تھیں وہ وارداتیں کرتے تھے بے گناہ عوام کو مارتے تھے اور شمالی علاقہ جات میں جا کر وزیرستان میں چھپ جاتے تھے جسے انہوں نے علاقہ غیر بنا دیا تھا وہ وہاں کے باشندوں کو یرغمال بنا لیتے تھے۔

اے پی ایس کے حملے کے بعد حکومت اور آرمی نے فیصلہ کیا کہ دہشت گردوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے عوام کا بھی یہی مطالبہ تھا 16 دسمبر 2014ء کو اے پی ایس پر ہونے والے واقعہ کے بعد صرف تین ماہ کی پلاننگ اور ٹریننگ کے بعد 15 فروری 2015ء کو آپریشن ضرب عضب کا آغاز کردیا گیا پاکستان کی بہادر افواج وزیرستان پہنچ گئیں آپریشن کرنے سے پہلے جو بچے کھچے لوگ ان علاقوں

میں رہائش پزیر تھے انہیں وہاں سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا تاکہ آپریشن کے دوران عام بے گناہ افراد کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔

وزیرستان میں دہشتگردوں کے ساتھ جس جگہ سب سے مشکل ترین مقابلہ ہوا وہ تیرہ کا علاقہ تھا اس علاقے کو اونچی اونچی پہاڑیوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے حد نگاہ تک بنجر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں یا پھر چٹیل میدان جن میں دور دور تک کہیں کوئی درخت نظر آ جاتا ہے یا لمبی لمبی سوکھی گھاس نظر آتی ہے۔

آپریشن کی ابتدا ہوئی تو فوج کے لیے سب سے مشکل کام تھا اس علاقے میں موجود پہاڑیوں کے دوسری طرف افغانستان بھارت سے ملنے والی سرحدوں کے راستوں کو سیل کرنا کیونکہ انہی راستوں سے دہشت گرد تنظیموں کو بھاری اسلحہ کی فراہمی کی جاتی تھی سب سے پہلے ان تمام راستوں کو سیل کیا گیا اور اس کے بعد آپریشن کا آغاز کیا گیا۔

ایسے میں ایک موقع پر جب پاک فوج کے جوان ایک علاقے میں کارروائی کر کے واپس آ رہے تھے تو راستے میں انہیں ایک سفید رنگ کی بڑی سی گاڑی آتی نظر آئی جوانوں نے بھانپ لیا کہ اس میں دہشت گرد سوار ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی فائر کھول دیا سفید گاڑی میں موجود دہشت گرد گاڑی سے اتر کر پہاڑوں میں محفوظ مقام میں چھپنا چاہتے تھے لیکن انہیں اس کا موقع نہیں ملا اور وہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

جس وقت آپریشن ضرب عضب کا آغاز ہوا پہاڑیوں پر برف جمی ہوئی تھی اور ان کی چڑھائی بہت مشکل تھی اس علاقے میں جو پہاڑ موجود ہیں ان کی اونچائی کم سے کم 5 ہزار فٹ اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار فٹ تک ہے اور دہشت گردوں کے ٹھکانے ان پہاڑوں میں اوپر کی طرف واقع تھے اور وہاں تک اس موسم میں فوجیوں کو چڑھ کر جانا تھا جبکہ اوپر سے دہشت گرد برابر مزاحمت کر رہے تھے یہ مشکل ترین مرحلہ بھی طے کر لیا گیا تھا پاکستانی فوج نے مورچے سنبھال لیے تھے ان کے عزم بلند تھے اور ہر فوجی نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ ہر حالت میں دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔

تمام علاقے میں جگہ جگہ ایسی ڈیوائسز لگی ہوئی تھیں جو اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھیں جس انداز میں سرنگیں بچھی ہوئی تھیں وہ کوئی غیر تربیت یافتہ یا غیر فوجی کا کام نہیں تھا۔

13 مارچ 2015ء کو باقاعدہ آپریشن کا آغاز ہوا رات کے دوران فوجی جوان اپنے آفیسرز کی ہدایات کے مطابق پہاڑیوں پر چڑھتے رہے اور دشمن کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے رہے جو پہاڑیوں پر اوپر اپنے مورچوں میں موجود تھا۔ صبح تقریباً تین بجے انہوں نے درست پوزیشن لینے کے لیے بعد دشمن کے مورچوں کی طرف فائر کھول دیا تھا دوسری طرف سے بھی اسی انداز میں جواب دیا گیا تھا دونوں طرف سے تابڑتوڑ گولیاں برسائی جا رہی تھیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کبھی طالبان کی طرف سے اور کبھی پاک فوج کے جوانوں کی طرف سے کسی شخص کی کراہ یا چیخ سنائی دیتی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ کسی کو گولی لگی ہے۔

فوجی آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے انہی میں کیپٹن بلال بھی تھا جو بہت پرجوش تھا اس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بازی لے جائے۔

"بلال ٹھہرو۔ دوسری طرف سے فائر ہو رہا ہے۔"

اس کے ساتھی ناصر نے اسے روکا وہ اٹھ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسری طرف سے جو فائر آ رہا ہے وہ کتنے فاصلے سے آ رہا ہے۔

''ناصر میں انہیں موقع نہیں دینا چاہتا کہیں وہ فائر کرتے ہوئے بھاگ نہ جائیں۔'' کیپٹن بلال نے کہا۔

''نہیں، وہ نہیں بھاگ سکتے۔'' ناصر نے جوابی فائرنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔''

''لیکن پھر بھی، میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' کیپٹن بلال نے کہا اور اسی لمحے قریب ہی کہیں زبردست بلاسٹ کی آواز آئی۔

''کوئی سرنگ پھٹی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں یہاں جگہ جگہ سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔'' کیپٹن بلال نے جواب دیا۔

''انہوں نے اپنی حفاظت کے سارے انتظامات کیے ہوئے ہیں تاکہ اگر کوئی یہاں تک پہنچ بھی جائے تب بھی ان تک نہ پہنچ سکے اور ان کی بچھائی ہوئی سرنگوں میں پھنس کر مر جائے۔'' ناصر نے کہا۔

''ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہوگا انہیں شکست ہوگی ہم نے زیادہ تر سرنگیں ہٹا دی ہیں۔'' کیپٹن بلال نے کہا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے تھوڑے ہی فاصلے پر ان کے چار ساتھی ایک پہاڑی ڈھلان پر پوزیشن لیے ہوئے اوپر کی طرف چڑھ رہے تھے ساتھ ساتھ وہ دشمن کے فائروں کا جواب بھی دے رہے تھے۔

اچانک دشمن کی طرف سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور ایک گولی کیپٹن بلال کے بازو میں لگ گئی۔ اس وقت وہ آگے جانے کی خواہش میں اپنے ساتھی میجر ناصر سے آگے نکل گیا تھا۔ ناصر نے چاہا کہ اس کے قریب پہنچے لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے سرگوشی کی اور میجر ناصر جہاں تھا وہیں رک گیا وہ جس پوزیشن میں تھا اس وقت اس کا حرکت کرنا خطرناک ہو سکتا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے کیپٹن بلال نے اپنے پاس موجود خنجر کی نوک سے اپنے بازو سے گولی نکال کر پھینک دی تھی اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا اسی وقت دشمن کی طرف سے ایک اور زبردست برسٹ مارا گیا اس بار ان کے سامنے موجود چار فوجیوں میں سے ایک کے سر پر گولی لگی تھی اور وہ ایک چیخ کے ساتھ پہاڑی سے نیچے گر گیا تھا پاکستانی فوجیوں نے بھی ایک ساتھ کئی فائر کیے تھے اور دوسری طرف سے کئی دہشت گردوں کی چیخیں سنائی دی تھیں پھر دونوں طرف سے فائر رک گیا تھا یہ لڑائی اسی طرح صبح کی روشنی پھیلنے تک جاری رہی تھی پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

فوجی اپنی اپنی جگہ مورچوں میں موجود تھے اور دشمن کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے دوسری طرف کسی قسم کی موومنٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔

اس پوائنٹ پر تقریباً ایک ہفتے تک آپریشن جاری تھا مغرب کے بعد لڑائی شروع ہو جاتی تھی اور صبح ہوتے ہوئے فائرنگ بند کر دی جاتی تھی آخر ساتویں دن صبح کے وقت فائر بند ہونے کے کچھ ہی دیر بعد کمیٹی کو پہاڑوں کی چوٹی پر واقع کچھ مکانات کی طرف پیش قدمی کا حکم ملا اور کمپنی کمانڈر نے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے پیش قدمی کا حکم دے دیا فوجیوں نے آگے پیش قدمی شروع کر دی دونوں طرف سے فائرنگ، شروع ہو گئی تھی لیکن دہشت گردوں کا زور کافی کم نظر آ رہا تھا اندازہ ہو رہا تھا کہ یا تو ان کے

پاس اسلحہ کی کمی ہوگئی ہے یا ان کے زیادہ ساتھی لقمہ اجل بن گئے ہیں پاکستان کے فوجیوں میں سے بھی کئی کو اس محاذ پر شہادتیں حاصل ہوئی تھیں اور جو زخمی ہوئے تھے انہیں پیچھے کے مورچوں میں بھیج دیا گیا تھا جہاں سے شدید زخمیوں کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا اور جو کم زخمی تھے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں محاذ سے پیچھے نہ بھیجا جائے وہ ٹھیک ہیں اور لڑائی میں حصہ لینا چاہتے ہیں انہیں طبی امداد دے دی گئی تھی لیکن کیپٹن بلال ان لوگوں میں سے تھا جس نے بازو میں لگی گولی خود ہی نکال کر ایک کپڑا باندھ لیا تھا اور پیچھے جانے سے انکار کر دیا تھا اس کے کمانڈر نے اس سے وائرلیس پر رابطہ کیا تھا۔

''ہیلو، کیپٹن بلال۔''

''یس سر۔'' کیپٹن بلال نے پر جوش انداز میں جواب دیا۔

''آپ پیچھے آ جاؤ آپ کو گولی لگی ہے۔''

''سر میں ٹھیک ہوں۔'' کیپٹن بلال نے جواب دیا۔

''تم کچھ طبی امداد لے لو۔'' پھر کہا گیا۔

''نو سر میں نے پٹی باندھ لی ہے، گولی نکال دی ہے۔'' کیپٹن بلال نے کہا اور ایئر پیس آف کر دیا وہ اسی جوش اور جذبے سے لڑتا رہا تھا۔

دو ڈھائی گھنٹوں کی کارروائی کے بعد دہشت گردوں کی طرف سے فائرنگ بالکل بند ہوگئی تھی۔ فوجی اپنی پوزیشن میں چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ پھر کمانڈر کے اشارے پر چار فوجی ہاتھوں میں گنیں لیے ہوئے سامنے کے گھر کی طرف بڑھے وہاں طالبان کی رہائش تھی سامنے ایک ہی لائن میں پانچ چھ کمرے نما گھر بنے ہوئے تھے ایک منٹ کے وقفے کے بعد اور فوجیوں میں سے بھی چار چار کی ٹولیوں میں فوجی آگے بڑھے تھے اور ایک ساتھ گھروں کے دروازوں کو دھکے مارتے ہوئے اندر داخل ہو گئے تھے۔

ان گھروں کی عجیب حالت تھی ہر گھر میں دو یا تین کمرے بنے ہوئے تھے اور ہر کمرہ میں جدید قسم کا اسلحہ موجود تھا اسلحہ بھاری تعداد میں تھا اس میں گولیاں بندوقیں، پستول، مشن گنیں، سرنگیں راکٹ لانچر اور راکٹ تک موجود تھے وہ تمام اسلحہ فوج نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا ان گھروں میں چھپ کر لڑنے والے تقریباً 50 کے قریب طالبان جگہ جگہ مرے پڑے تھے۔ ان کے قریب ان کا اسلحہ بھی موجود تھا اس پر بھی قبضہ کر لیا گیا تھا۔

اس چوکی کو فتح کرنے پر فوجی بہت خوش تھے۔ وہ جوش سے نعرے لگا رہے تھے۔

''اللہ اکبر۔''

''پاکستان...... زندہ باد۔''

''ہم ہر محاذ پر ان درندوں کو ایسے ہی شکست دیں گے۔'' کمپنی کمانڈر نے کہا۔

وہ رات انہوں نے سو کر نہیں گزاری تھی بلکہ انہیں اگلے مورچوں پر جانے کا حکم ملا تھا اور صبح ہوتے ہی انہیں روانہ ہونا تھا وہاں پہلے ہی سے کئی کمپنیاں کارروائی میں مصروف تھیں دہشت گرد بعض اوقات ایک ساتھ کئی مقامات پر کارروائی کا آغاز کر دیتے تھے۔ تاکہ پاکستانی فوج کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن پاکستانی جوان بھی ہمت ہارنے والے نہیں تھے ساری رات وہ پلاننگ کرتے رہے کہ اگلی پوسٹ پر دشمن سے مقابلہ کرنے کی ان کی اسٹریجڈی کیا ہوگی اور صبح ہوتے ہی وہ آگے روانہ ہو گئے تھے۔

انہیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ آگے کے سفر میں انہیں خاصی مشکلات پیش آئیں گی جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں جو دشمن نے انہیں نقصان پہنچانے

کے لیے لگائی ہیں اس کے علاوہ راستہ ناہموار ہے اس راستے میں گاڑیاں نہیں جاسکتیں چنانچہ اپنی ضرورت کے مطابق راستہ صاف بھی کرنا پڑے گا لیکن یہ آپریشن اس لحاظ سے زیادہ اہم ہوگا کہ اس میں ہیلی کاپٹرز کے ساتھ ساتھ ڈرون بھی استعمال کیے جائیں گے جو دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنائیں گے تاکہ وہ موقع پر بھاگ نہ سکیں۔

کچھ فرلانگ راستہ طے کرنے کے بعد وہ علاقہ شروع ہوگیا جس میں جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں اس کی خاص پہچان یہ تھی کہ سرنگیں بچھانے کے بعد ان کی تاروں کو چھپانے کے لیے ان پر پتھر رکھ دیے گئے تھے اس کے علاوہ اس کام کے لیے گرنیڈ بھی استعمال کیے گئے تھے جن پر بھاری پتھر رکھ کر چھپا بھی دیا گیا تھا اور اس پتھر کے ہٹتے ہی وہ گرنیڈ پھٹ بھی سکتے تھے۔

فوج کا ایک دستہ آگے آگے چل رہا تھا جو اس کام کا ماہر تھا اور اس کا کام ایسی بارودی سرنگوں کی نشاندہی کرنا تھا ان کے پاس ایسے آلات بھی تھے جو ان سرنگوں کو ڈیلیٹ کررہے تھے۔ فوج پیش قدمی تو کررہی تھی لیکن اس مقام پر آگے بڑھنے کی رفتار کچھ کم ہوگئی تھی جس کی بڑی وجہ یہ بارودی سرنگیں تھیں۔

آگے چلنے والے فوجی دستے کے پاس ایک ایم آر پی وہیکل بھی تھی جو سرنگوں کو ڈھونڈتی بھی ہے اور انہیں بیکار بھی کرتی ہے اور خدانخواستہ اگر ایم آر پی وہیکل کسی سرنگ پر آجائے تو الٹنے کی صورت میں بھی اس کے اندر بیٹھے ہوئے فوجی محفوظ رہتے ہیں۔

یہ کمپنی اس وقت ایک جنگلی پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ پہاڑوں پر بڑی تعداد میں لمبے لمبے درخت لگے ہوئے تھے فوجی راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک اتنی احتیاط کے باوجود ایک بارودی سرنگ جوان کی نظروں سے چھپی ہوئی تھی پھٹ گئی ایک زوردار دھماکا ہوا اور دو فوجی دھماکوں اور شعلوں کے ساتھ ساتھ فضا میں بلند ہوگئے اس کے ساتھ ہی پاکستانی فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا اور ان پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔

دشمن یہاں چھپا ہوا ہے وہ کہیں قریب ہی موجود ہیں کیپٹن ناصر نے اپنے ساتھی میجر فیضان سے کہا یہ دونوں ہی کمپنی کے آگے چلنے والے عملے میں تھے اور جرأت و بہادری کے لیے ان کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میجر فیضان نے جواب دیا۔

''انہوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے یوں لگتا ہے کہ وہ ٹریپ لگا کر ہمارا انتظار کررہے تھے اور ہمیں اس میں پھنسا کر مارنا چاہتے ہیں۔'' کیپٹن ناصر نے کہا۔

''ہاں لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوگی تو وہ نہیں جانتے کہ ان کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔'' میجر فیضان نے کہا۔

''اس صورت میں ہم کیا کرسکتے ہیں یہ تو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دے رہے۔'' کیپٹن ناصر نے کہا ان کے باقی ساتھی بھی زمین پر لیٹ گئے تھے اور چاروں طرف سے ہونے والی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' میجر فیضان نے کہا اور اپنے اردگرد فوجیوں کو اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ وہ اسے اور کیپٹن ناصر کو کور کریں پھر اس نے کیپٹن ناصر کی طرف دیکھا۔

''کیپٹن تم بائیں طرف سے لمبا چکر کاٹ کر دشمن کی پشت پر پہنچو اور میں دائیں طرف سے جاتا

ہوں جب تک ان کے پیچھے نہ پہنچ جاؤ فائر مت کرنا انہیں تمہاری موجودگی اور حرکت کا اندازہ نہ ہو۔'' میجر فیض نے کہا۔

''او کے سر۔'' کیپٹن ناصر نے جواب دیا۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمت مڑ کر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے قریبی جھاڑیوں میں گم ہوگئے تھے باقی ساتھیوں نے دہشت گردوں کو مصروف رکھنے کے لیے فائر بند نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کے فائروں کا جواب دیتے رہے تھے اور کیپٹن ناصر اور میجر فیضان تیزی سے رینگتے ہوئے ہاف دائرے کی صورت میں آہستہ دشمن کی پشت کی طرف جارہے تھے انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ تعداد میں دس سے زیادہ نہیں تھے لیکن وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔

دہشت گردوں کی پشت پر پہنچنے کے بعد میجر فیضان نے جائزہ لیا تھا انہوں نے مختلف رنگوں کے ڈھیلے اور لمبے شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے ان کے سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں زیادہ تر کے بال بڑھے ہوئے تھے چہروں سے وحشت جھانک رہی تھی ابھی انہیں میجر فیضان اور کیپٹن ناصر کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہوا تھا اور میجر فیضان نہیں چاہتا تھا کہ وہ انہیں سنبھلنے کا موقع دے چنانچہ اس نے وائرلیس پر اپنے کمانڈر سے رابطہ قائم کیا جو فضا میں موجود ہیلی کاپٹر میں بیٹھا تھا اور وقفے وقفے سے جائے وقوعہ کا جائزہ لے رہا تھا اس نے اپنی پوزیشن بتائی اور فضائی حملے کی درخواست کردی۔

''سر میں انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔ میں اور کیپٹن ناصر ان کی پشت پر موجود ہیں میں چاہتا ہوں جیسے ہی ہم ادھر سے حملہ کریں ان پر ہیلی کاپٹر سے بھی فائر کردیا جائے تاکہ ان کے بچنے کا کوئی امکان نہ رہے۔'' میجر فیضان نے کہا۔

پھر ایسا ہی ہوا تھا دہشت گردوں کو فرنٹ سے پاک آرمی کے نوجوانوں نے مصروف کیا ہوا تھا اور عقب سے میجر فیضان اور کیپٹن ناصر نے فائر کھول دیا تھا پھر جیسے ہی دہشت گردوں کو احساس ہوا تھا کہ وہ دونوں طرف سے گھر گئے ہیں تو انہوں نے اپنی پوزیشن بدلنا چاہی تھی لیکن ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی ہیلی کاپٹر نے شیلنگ شروع کردی تھی اور چند ہی لمحوں میں وہ دہشت گرد ایک ایک کرکے زمین پر ڈھیر ہوگئے تھے پاکستانی فوجیوں نے آگے بڑھ کر ان کا اسلحہ قبضے میں کرلیا تھا اور دہشت گردوں کو بھی چیک کیا تھا کہ کہیں ان میں کوئی زندہ نہ ہو ان میں ایک شخص زندہ تھا لیکن بری طرح زخمی تھا انہوں نے اسے قیدی بنالیا تھا۔

''چلو آگے بڑھتے ہیں ہمیں جس جگہ بیٹھنے کے لیے کہا گیا ہے وہ تھوڑی ہی دور رہ گئی ہے۔'' میجر فیضان نے کہا۔

پھر وہ لوگ اس زخمی دہشت گرد کو ساتھ لیے آگے بڑھنے لگے تھے دہشت گرد کے ہاتھ باندھ دیے تھے اور ایک فوجی کی ڈیوٹی تھی جو رائفل کے نشانے پر رکھ کر اسے سب کے ساتھ چلنے پر مجبور کررہا تھا۔

''چلو، سیدھا چلو......!'' فوجی نے غصے سے کہا اور دہشت گرد کی کمر میں رائفل کی نالی چبھوئی۔

''آہ۔'' دہشت گرد کراہا۔

''ہاں تکلیف ہوئی ہے، جب لوگوں کو زخمی کرتے ہو انہیں مارتے ہو تو انہیں بھی ایسے ہی تکلیف ہوتی ہے۔'' اس نے غصے سے کہا دہشت گرد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

راستے میں آنے والی جھاڑیوں اور بارودی سرنگوں کو اب بھی صاف کیا جارہا تھا۔ چند فرلانگ چلنے کے

بعد انہیں دور سے آتے ہوئے فائروں کی آواز سنائی دی فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آوازیں تو موجود ہی تھیں وہ تیرہ ایجنسی میں اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں دہشت گردوں کا ہیڈ کوارٹر قائم تھا۔

فضا سے ڈرون دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر فائر کر رہے تھے اور زمین پر پاک فوج نے ان کے لیے زندگی تنگ کردی تھی میجر فیضان کے ساتھ آنے والے فوجیوں نے بھی اس نئی پوزیشن میں اپنی اپنی جگہوں پر مورچے سنبھال لیے تھے سہ پہر کا وقت ہو رہا تھا چند گھنٹے لڑائی کے بعد فضا میں خاموشی چھا گئی تھی اور دونوں طرف سے فائر بند ہو گئے تھے۔

فوجی رات بھر اپنی اپنی پوزیشن پر جاگ رہے تھے ان کے کان چھوٹی سے چھوٹی آہٹ پر بھی کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ چونک کر پوزیشن کا جائزہ لیتے تھے اس پوسٹ پر ان کا کمانڈر میجر جنرل عابد ان کے ساتھ موجود تھا اور آنے والے دن کے لیے اپنے آپریشن کو آخری شکل دے رہا تھا انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کل اس ایجنسی کو دہشت گردوں سے پاک کر کے پاکستان کا پرچم لہرا دیں گے۔

رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی صبح پو پھٹنے کے ساتھ ساتھ درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ سنائی دینا شروع ہوگئی تھی۔ فوجیوں نے باری باری فجر کی نماز ادا کی تھی ابھی تمام فوجی نماز سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ کمپنی میں ہلکا سا شور سنائی دیا آوازیں اس سمت سے آ رہی تھیں جدھر قیدی بندھا پڑا تھا میجر فیضان دوڑ کر وہاں پہنچا جس فوجی کی ذمہ داری اس زخمی قیدی دہشت گرد پر تھی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور قریب ہی زخمی قیدی بے سدھ پڑا تھا اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میجر فیضان نے پوچھا۔

''پتا نہیں صاحب یہ فارغ ہونے کے لیے جھاڑی کے پیچھے گیا تھا جب اسے واپس آنے میں دیر لگی تو میں نے وہاں جا کر دیکھا یہ اس حالت میں وہیں پڑا تھا میں گھسیٹ کر ادھر لے آیا۔''

فوجی نے بتایا جو اس کی نگرانی پر مامور تھا۔

''ایسا لگتا ہے اس نے کوئی زہریلی چیز کھا کر خود کشی کی ہے۔'' کیپٹن ناصر نے کہا جو آوازیں سن کر وہاں آ گیا تھا۔

''چلو اپنے انجام کو پہنچ گیا اس نے اس ڈر سے خود کشی کرلی ہوگی کہ پتا نہیں ہم اس کے ساتھ اسے قیدی بنا کر کیا سلوک کریں یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اس سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں ضرور پوچھا جاتا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی راز چھپانا چاہتا ہے۔'' میجر فیضان نے کہا۔

سب لوگ آہستہ آہستہ وہاں سے ہٹ گئے تھے اور میجر فیضان کے حکم پر مردہ قیدی کو پیچھے بھجوا دیا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد پاکستانی فوجیوں نے اپنے مورچے سنبھال لیے تھے اور دہشت گردوں پر فائرنگ شروع کردی تھی ساتھ ہی ساتھ فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں کمانڈر میجر جنرل عابد نے ہر حالت میں آج اس آپریشن کو انجام تک پہنچانے کا حکم دے دیا تھا ان کے اندازے کے مطابق اس چیک پوسٹ پر اب مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی دشمن کمزور ہو گیا تھا اور وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد پاکستانی فوجی چڑھائی چڑھتے ہوئے پہاڑی کی بلندی پر پہنچ گئے تھے میجر فیضان نے پہاڑی کے کنارے سے اچک کر دوسری جانب کا جائزہ لیا تھا سامنے کافی بڑا سا میدان تھا

جہاں چند کمرے بنے نظر آرہے تھے جن میں سے کچھ کے دروازے بند تھے اور کچھ کے کھلے ہوئے تھے فائرنگ ان کمرے کی جانب سے نہیں کی جارہی تھی بلکہ جگہ جگہ لگے ہوئے درختوں کے پیچھے سے یا تین مقامات پر بنے ہوئے بنکروں سے ہورہی تھی جن میں دہشت گرد موجود تھے۔

کچھ دیر لڑنے کے بعد میجر فیضان نے فیصلہ کیا کہ بنکر میں موجود دہشت گردوں کو صرف فائر کر کے نہیں مارا جاسکتا اس کے لیے ضروری تھا کہ بنکر کو کسی راکٹ یا گرینیڈ سے نشانہ بنایا جائے چنانچہ اس نے اپنے ساتھ کیپٹن ناصر کو لیا اور چند گرینیڈ خود لیے اور کچھ کیپٹن ناصر کو دیے اور پھر اسے اپنے اگلے منصوبے کے بارے میں بتایا وہ دونوں میجر جنرل عابد کو آگاہ کرنے کے بعد اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے حرکت میں آگئے تھے۔

انہوں نے جھاڑیوں اور بڑے بڑے چٹانی پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے پہاڑی کے کنارے پر چڑھنے کے بعد ایک بنکر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا کوئی دہشت گرد کھلی ہوئی جگہ میں موجود نہیں تھا ان کے اوپر صرف بنکروں ہی سے فائر کیے جارہے تھے میجر فیضان نے کیپٹن ناصر کو اشارہ کیا اور کیپٹن ناصر دوسرے بنکر کی طرف بڑھ گیا وہ بنکروں کی پشت کی طرف پہنچے تھے اور خود کو دہشت گردوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے ہوئے بنکروں کے اس حصہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کررہے تھے جو کھلا ہوا حصہ تھا اور جہاں سے مسلسل فائرنگ کی جارہی تھی۔

جہاں وہ دونوں ایک ساتھ مطلوبہ پوزیشن میں آئے تھے میجر فیضان نے کیپٹن ناصر کو اشارہ کیا اور پھر دونوں نے ایک ساتھ گرینیڈ کو ایکٹیو کر کے بنکروں میں ڈال دیا۔ زوردار دھماکے ہوئے اور بنکروں سے

نہلا پہ دہلا

1۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کیسے وصول ہوتے ہیں؟
☆ جب خوبصورت بیوی کے ساتھ ڈھیر سارا جہیز بھی ہاتھ آئے۔
2۔ بہتی گنگا میں ہاتھ کیسے دھوئے جاسکتے ہیں؟
☆ جب سرراہ کسی منچلے کو جوتے پڑ رہے ہوں تو آپ بھی اپنا حصہ ڈال لیجیے۔
3۔ آج کل لوگ وعدہ ایفا کیوں نہیں کرتے؟
☆ ٹائم کی پرابلم کی وجہ سے۔
4۔ اگر کوئی کریم واقعی رنگ گورا کردے تو؟
☆ سمجھ لیجیے کہ یہ کریم جعلی ہے۔
5۔ اصل پھول اور مصنوعی پھول میں کیا فرق ہے؟
☆ صرف کانٹوں کا۔
6۔ آج کل بھولا بادشاہ کسے کہتے ہیں؟
☆ جو صرف مطلب کی بات سمجھے۔ کیا سمجھے۔

محمد ندیم عطاری...... کراچی

شعلے نکلنے لگے تھے اس کے ساتھ ہی دونوں نے مل کر تیسرے بنکر کو بھی نشانہ بنادیا تھا اور اس سے پہلے کہ ان دہشت گردوں کو صورت حال کا اندازہ ہو وہ دونوں اپنا کام دکھا چکے تھے انہوں نے تینوں بنکروں کو اڑا دیا تھا اب کمروں کی طرف سے مزاحمتی فائر ہورہے تھے لیکن وہ بھی وقفے وقفے سے چند فائر ہوئے تھے اور خاموشی چھا جاتی تھی اس کا مطلب تھا کہ دشمن پسپا ہورہا تھا۔ فائروں سے اندازہ ہورہا تھا کہ صرف دو کمروں سے مزاحمت ہورہی ہے اور مزاحمت کرنے والے بھی تعداد میں دو یا تین ہیں اس کے علاوہ اس جگہ پر تمام دہشت گردوں کا خاتمہ ہوچکا تھا جلد ہی اور فوجی بھی اوپر چڑھ کر ہموار سطح پر آگئے تھے میجر فیضان نے ایک ساتھی فوجی کو اشارہ کیا تھا جو ایک کمرے کے قریب تھا جس سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے فائر کیے جارہے تھے پھر اس فوجی نے ایک ساتھ ایک ایک کمرے کے

دروازے مارتے ہوئے اندر قدم رکھا تھا چند فائروں کی آوازیں آئی تھیں اور تھوڑی دیر میں میجر فیضان اور دوسرا فوجی جوان کمروں سے باہر آ گئے تھے۔
''ختم ہو گئے اس کمرے میں دو دہشت گرد تھے جن میں سے ایک زخمی تھا۔'' میجر فیضان نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے وہ باہر آیا تھا۔
''ادھر صرف ایک تھا۔'' دوسرے نوجوان نے کہا جو دوسرے کمرے سے باہر آیا تھا۔
''ہم نے کر دکھایا سر آج ہی ہم نے یہ پوسٹ دہشت گردوں سے حاصل کر لی ہے۔'' میجر فیضان نے جوشیلی آواز میں چیخ کر کہا اور میجر جنرل عابد اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔
''پاکستان۔'' میجر فیضان نے نعرہ لگایا۔
''زندہ باد۔'' سارے فوجیوں نے با آواز بلند جواب دیا پھر فضا اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی تھی پاک فوج کو وزیرستان میں تیراہ ایجنسی میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی یہ وہ مقام تھا جہاں سے دہشت گردوں کی تمام کارروائیوں کو مانیٹر کیا جاتا تھا یہ علاقہ ایک طرح سے پاکستان نے کھو دیا تھا یہاں مکمل طور پر دہشت گردوں کا ٹھکانہ تھا اس جگہ کا معائنہ کرنے سے پتا چلا کہ یہاں بھاری تعداد میں اسلحہ اور جدید قسم کے ہتھیار موجود تھے جو قبائلی لوگوں کے پاس ہونا اس وقت تک ممکن نہیں تھے جب تک انہیں بیرونی امداد نہ ملتی ہو اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ یہ بیرونی امداد انہیں بھارت اور افغانستان سے ملتی تھی جو وہاں کی دہشت گرد تنظیمیں انہیں دیتی تھیں۔
اس چیک پوسٹ پر پاک فوج کے جوانوں کا جوش وخروش اس لیے بھی دیکھنے والا تھا کہ اس پوسٹ پر آپریشن کے دوران چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل بھی ان کے درمیان موجود تھے انہوں نے ہر موقع پر ان کی حوصلہ افزائی کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے رمضان میں ان کے ساتھ افطاری میں بھی شرکت کے ساتھ ساتھ عید بھی ان کے ساتھ منائی تھی۔
آپریشن ضرب عضب کا پہلا حصہ تیراہ ایجنسی میں کامیابی سے اختتام پذیر ہوا تھا اور اس کے چند دن بعد ایک مشہور ٹی وی چینل کا نمائندہ وہاں پہنچا تھا اور اس نے میجر جنرل عابد سے ملاقات کی تھی اور اپنے ٹی وی کے لیے رپورٹ بنانا چاہی تھی جس پر میجر جنرل عابد نے اس کی ہر ممکن مدد کی تھی اور اس آپریشن کے بارے میں پوری تفصیلات فراہم کی تھیں۔
''یہ دیکھیں ہم جہاں کھڑے ہیں اس کے چاروں طرف نظر کریں آپ کو دور دور تک چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ نظر آئیں گے اس طرف ہماری سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں۔'' جنرل عابد نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے ٹی وی رپورٹر سے کہا۔
''اور اس طرف ہماری سرحد یہ انڈیا سے ملتی ہیں۔'' انہوں نے دوسری طرف اشارہ کیا۔
''یہ آپریشن شروع کرنے سے پہلے ہم نے ان سرحدوں کو سیل کیا تاکہ دشمن کی مدد بھی نہ ہو سکے اور یہاں سے دشمن فرار بھی نہ ہو سکے اس کے لیے ہم نے افغانستان سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اس آپریشن ضرب عضب میں ہماری مدد کرے اور اپنی سرحدوں پر سخت پہرہ لگائے کہ کوئی بھاگ کر ادھر سے ادھر نہ جا سکے۔ انہوں نے ہماری درخواست قبول کی اور ہماری مدد کی ہے۔'' جنرل عابد نے کہا۔
''جناب یہ ہماری فوج کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔'' ٹی وی رپورٹر نے کہا۔
''جی ہاں اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی مدد اور پھر ہمارے جوانوں کی بہادری اور حوصلہ شامل

ہے۔ وہ بڑے جگرے سے لڑے ہیں۔'' جنرل عابد نے فخریہ انداز میں کہا۔

''سر ہم نے دیکھا ہے کہ یہاں بارودی سرنگیں بھی لگائی گئی تھیں۔'' ٹی وی رپورٹر نے پوچھا۔

''ڈیوائسز........ جی ہاں وہ بھی لگائی گئی تھیں اور اتنی جدید بارودی سرنگیں میں نے اپنی دس سالہ زندگی میں نہیں دیکھیں جو اس علاقے میں لگائی گئی تھیں اور انہیں کوئی معمولی آدمی نہیں لگا سکتا جس طرح وہ لگی ہوئی تھیں وہ کوئی ماہر ہی لگا سکتا ہے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کام کے لیے کسی نہ کسی سے مدد لی ہے اور ہمیں اندازہ ہے کہ یہ مدد کس نے کی ہے۔ ہماری اس پر بھی نظر ہے، ہم اس کا بھی خاتمہ کریں گے۔''

''جناب یہ بتائیں کہ ہمارا جانی نقصان کتنا ہوا ہے۔''

''الحمدللہ لوگوں نے کام کیا ہے قربانیاں دی ہیں بہت بہادری سے جوان لڑے ہیں ہمارے 44 جوان شہید ہوئے ہیں اور 100 کے قریب زخمی ہوئے ہیں جبکہ 1000 دہشت گرد مارے گئے ہیں یہ بڑی کامیابی ہے۔'' جنرل عابد نے بتایا۔

''اس جنگ عضب کے پیچھے پوری فلاسفی ہے، ہم نے کوئی علاقہ بغیر لڑے نہیں لیا ہمارے جوانوں میں بہت ول پاور ہے۔ بہادری ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارے چیف آف آرمی اسٹاف لڑائی کے دوران ہمارے ساتھ کھڑے تھے ایسی فوج کو کیسے شکست ہوسکتی ہے جس کا چیف آف آرمی اسٹاف اگلے مورچوں میں اپنے جوانوں کے ساتھ ہو۔'' جنرل عابد نے فخریہ انداز میں کہا۔

''بے شک جناب پوری قوم جنرل راحیل اور فوج کے ساتھ ہے۔'' رپورٹر نے کہا۔

''ہمیں اندازہ ہے ہمارا میڈیا اور پوری قوم ہمارے ساتھ ہے اسی لیے ہمارے حوصلے بلند ہیں یہ حق اور باطل کی جنگ ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔'' جنرل عابد نے کہا۔

''یہاں باجوڑ ایجنسی سے زیادہ چیلنجز تھے یہاں 5 ہزار سے دس ہزار فٹ تک اونچی پہاڑی چٹانیں موجود ہیں جہاں تک پہنچنے کے لیے بارڈر بھی سیل کرنا پڑا تھا اس کے علاوہ پہاڑوں پر برف بھی جمی ہوئی تھی جو اوپر چڑھنے میں ہمارے جوانوں کے لیے مشکل پیدا کررہی تھی راستے بھی جھاڑیوں سے بھرے تھے انہیں بھی صاف کرنا تھا راستہ میں چھپی ہوئی بارودی سرنگیں تھیں انہیں بھی صاف کرنا تھا یہاں ہر کلومیٹر پر ہماری ایک شہادت ہوئی ہے۔''

''آئیں میں آپ کو دکھاتا ہوں کہ یہاں ہمیں کیا ملا ہے۔'' کرنل عابد نے رپورٹر سے کہا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ ان کمروں کی طرف بڑھے جو پہاڑی چوٹی پر بنے ہوئے تھے۔

جھوٹ کی سزائیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو (رحمت) کے فرشتے اس سے ایک میل دور ہوجاتے ہیں' اس بدبو کے باعث جو جھوٹ بولنے سے پیدا ہوتی ہے (جامع ترمذی)۔

- جھوٹ بولنے والے کا دل سیاہ ہوجاتا ہے اور وہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھا جاتا ہے (موطا امام مالک)۔
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس شخص کے لیے ویل (یعنی جہنم) ہے جو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹی باتیں سناتا ہے' اس کے لیے ویل ہے۔'' (ابوداؤد' ترمذی)
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے (بخاری و مسلم)۔

نورالدین...... کراچی

”دیکھیں بظاہر آپ کو یہ کمرے نظر آرہے ہیں۔ لیکن ان کے اندر چل کر دیکھیں یہ غار ہیں جن میں سرنگیں بنی ہوئی ہیں۔“ کرنل عابد نے بتایا اور رپورٹر کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے جس کا پچھلا حصہ ایک غار کا دہانہ تھا وہ اس میں داخل ہوگئے۔

”یہ دیکھیں یہاں ہر طرح کا اسلحہ بھاری تعداد میں موجود ہے۔“ جنرل عابد نے وہاں رکھے ہوئے اسلحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں روشنی کا بھی انتظام ہے۔“ رپورٹر نے بلب روشن دیکھ کر کہا۔

”نہیں یہاں لائٹ نہیں تھی یہ ہم نے خاص طور سے لگوائی ہے جب آپ کی آمد کی اطلاع ملی تا کہ آپ آسانی سے کورنگ کرسکیں۔“ جنرل عابد نے کہا۔

”اور یہ دیکھیں غار کا یہ حصہ جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا یہاں پر یہ سیدھے سادھے لوگوں کو لا کر قید کرتے تھے اور انہیں یرغمال بنا کر ان سے بھاری رقمیں وصول کرتے تھے۔“

”آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں آہنی دروازے لگے ہوئے ہیں یہاں قید ہونے والے ان کے چنگل سے رہا نہیں ہوسکتے تھے۔“ جنرل عابد نے بتایا۔

غار کے کئی حصے دکھانے کے بعد وہ پھر رپورٹر کے ساتھ غار سے باہر آگئے تھے۔

”آئیں اب آپ کو وہ اسلحہ دکھاؤں جو یہاں سے ہمیں ملا ہے۔“ انہوں نے کہا اور ایک کمرے میں لے گئے جہاں اسلحہ رکھا ہوا تھا۔

”یہ دیکھیں ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے گنیں، رائفل، پستول، اینٹی کرافٹ گنیں، مشین گنیں ایسا اسلحہ پاکستان میں نہیں ہے یہ غیر ملکی ساخت کا ہے اور اسمگل ہو کر یہاں آتا ہے۔ یہ دیکھیں ماڈرن قسم کے وائرلیس سیٹ، ٹرانسمیٹر، ریسیور سب کچھ موجود ہے۔“

”اتنے جدید اسلحہ کے ساتھ دہشت گردوں نے آپ سے مقابلہ کیا اور مشکلات تو ہوتی ہوں گی۔“ رپورٹر نے کہا۔

”یہ وہ علاقہ ہے جو انگریز بھی فتح نہیں کرسکے تھے لیکن ایمان کی قوت اسے ہم نے فتح کیا ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے اس کے چپے چپے پر پاکستانیوں کا حق ہے۔ یہ علاقہ ہم نے دشمن سے خالی کرانا ہی تھا۔“ جنرل عابد نے کہا۔

”لڑائی زیادہ تر کس وقت میں ہوتی تھی۔“ رپورٹر نے سوال کیا۔

”دہشت گرد رات کو مغرب کے وقت حملہ کرتے تھے اندھا دھند چاروں طرف سے فائرنگ کرتے تھے پھر فوج جواب دیتی تھی باری باری فائر ہوتا تھا بعض اوقات ایک ہی وقت میں کئی لوکیشن پر حملہ کرتے تھے۔“ جنرل عابد نے بتایا پھر وہ کمرے سے باہر آگئے تھے سامنے کھلے پہاڑی میدان میں فوجی کمانڈوز پریڈ کررہے تھے۔

”حق ہو، اللہ ھو۔“

اللہ ھو، اللہ ھو۔“

”وہ سب پریڈ کے دوران نعرہ لگا رہے تھے وہ لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کی جگہ کہہ رہے تھے۔

”جو فوج لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کی جگہ حق اللہ اور اللہ ھو کا نعرہ لگاتی ہو اور جو فوج اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر دشمن پر حملہ آور ہوتی ہو اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا جناب۔“ ٹی وی رپورٹر نے کہا۔

”بے شک ہمارے ساتھ اللہ کی رضا، ماں باپ کی دعائیں، اور قوم کی وفائیں ہیں ہم کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“ جنرل عابد نے کہا۔

”ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا۔“ رپورٹر نے کہا۔

"جناب کیا میں زخمی ہونے والے فوجیوں سے مل سکتا ہوں۔" رپورٹر نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں، آپ جائیں ڈیوٹی آفیسر آپ کو پچھلے مورچوں پر لے جائیں گے جہاں آپ کی ملاقات زخمیوں سے ہو سکتی ہے۔" جنرل عابد نے کہا اور پھر ٹی وی رپورٹران سے رخصت ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پچھلے مورچوں میں زخمی فوجیوں کے درمیان موجود تھا یہاں ایک کیمپ لگا ہوا تھا۔ جہاں زخمی فوجیوں کے لیے طبی امداد کا انتظار تھا جن فوجیوں کی حالت زیادہ نازک تھی انہیں اسپتال بھیج دیا گیا تھا رپورٹر ایک فوجی کی طرف بڑھا۔

"آپ اس آپریشن ضرب عضب میں زخمی ہوئے ہیں آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہی کہوں گا کہ میرا زخمی ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم نے دہشت گردوں کو شکست دے دی ہے۔" زخمی فوجی نے بتایا۔

"اچھا ایک عید تو گزر چکی ہے اب عید الاضحیٰ آ رہی ہے یہ کیسے منائیں گے؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"ابھی آپریشن ضرب عضب دوسری جگہوں پر جاری ہے ممکن ہے ہمیں گھر جانا نصیب نہ ہو تو ہم اپنی کمپنی کے ساتھ ہی عید منائیں گے۔"

"عید پر گھر والوں کی یاد آتی ہے؟"

"جی ہاں آتی ہے لیکن ہم اس بات پر مطمئن ہوتے ہیں کہ ہماری وجہ سے ہمارے وطن کا ہر گھر محفوظ ہے تو گھر سے دوری کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔" زخمی فوجی نے جواب دیا تو رپورٹر دوسرے فوجی کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ کے گھر پر پیچھے کون کون ہے؟"

"میری ماں اور میرے والد ہیں۔"

"عید پر ماں کی یاد آئے گی؟"

"عید پر میں ماں سے دور تو ہوں گا لیکن دھرتی ماں کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے دور ہوں گا یہ دوری قسمت والوں کو ملتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایک اور زخمی فوجی جو لیٹا ہوا تھا اور اس کے ایک پاؤں اور ایک ہاتھ پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔

"آپ کیسے زخمی ہوئے تھے کچھ بتائیں گے۔" رپورٹر نے اس سے پوچھا۔

"جی، میرا نام صوبیدار عابد ہے طالبان کی ایک پوسٹ پر ہمیں آگے جانے کا حکم ملا ہم نے ان کے مکان پر قبضہ کر لیا طالبان نے دوبارہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کی ہم ان کا مقابلہ کر رہے تھے ایک جگہ سے گزرتے ہوئے راستے میں لگی ایک بارودی سرنگ بلاسٹ ہو گئی اور میں زخمی ہو گیا۔"

"آپ اپنے ساتھیوں سے کیا کہنا چاہیں گے۔" رپورٹر نے پوچھا۔

"میرے جو ساتھی اب بھی آگے محاذوں پر لڑ رہے ہیں میرا ان سے یہی کہنا ہے کہ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اللہ ان کے ساتھ ہے اور ہماری خواہش ہے کہ ہم بھی جلد ٹھیک ہو کر پھر دوبارہ جائیں اور اپنے وطن کے لیے اور اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جان قربان کر دیں جب تک ایک دشمن بھی زندہ ہے یہ لڑائی جاری رہے گی ہم انہیں نیست و نابود کر دیں گے۔"

"عید الاضحیٰ آ رہی ہے آپ کیسے منائیں گے؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"ویسے ہی جیسے گھر پر مناتے ہیں یہاں اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ منائیں گے یونٹ بھی ہمارا گھر ہوتا ہے، ہمارے غم اور خوشیاں سانجھی ہوتی ہیں۔" اس

زخمی کا حوصلہ بلند تھا۔ واقعی اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

ایک اور فوجی جو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے اس سے جب رپورٹر نے یہ سوال کیا کہ کیا عید پر آپ کو آپ کے بچوں کی یاد آئے گی تو آپ کیا کریں گے؟"

"ہمارے بچے اور گھر والے ہمیں خط لکھتے رہتے ہیں ہم تک پہنچائے جاتے ہیں ہم ان کے جواب بھی دیتے ہیں آپ کو پتا ہے کہ خط آدھی ملاقات ہوتی ہے اب بھی یقیناً ہمارے بچے خط بھی لکھیں گے اور عید کارڈ بھی بھیجیں گے ہماری آدھی عید تو یہ ہوگی باقی ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ منائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

میران شاہ فرنٹ یونٹ سے تعلق رکھنے والے ایک فوجی عبدالرشید نے بھی اپنے ساتھیوں سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔

"بچے یاد آتے ہیں لیکن ہمارے یونٹ کے ساتھی بھی ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں پھر ہمارے کمانڈر بھی ہمارے ساتھ عید مناتے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف نے بھی عید الفطر سب فوجیوں کے ساتھ ہی منائی ان کے ساتھ ہی عید کی نماز ادا کی جب ہمارا چیف ہمارے ساتھ ہے تو ہمیں پھر کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیں تو کم ہے۔"

خیبر ایجنسی تیراہ کے بریگیڈیئر کامران نے کہا کہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد طمانیت حاصل ہوتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے وہ کہیں اور حاصل نہیں ہوتی اور پھر کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہی یونٹ کے ساتھیوں کے ساتھ اگر عید بھی منانے کو مل جائے تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔"

"جی آپ درست کہتے ہیں ٹی وی رپورٹر نے کہا پھر وہ اپنے پروگرام کی کوورنگ کرنے کے بعد واپس آ گیا تھا۔

اگلے روز شام کے وقت پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا جو لوگوں میں بہت پسند کیا گیا عوام کو محاذ جنگ کی خبریں اور آنکھوں دیکھا حال پھر خاص طور سے دشمن کے ساتھ ہونے والے معرکوں کی ویڈیوز ہی عوام کو صحیح صورت حال سے باخبر کرتی ہیں۔

ہمارے بہادر جوانوں ہی کے خون کی بدولت آج پاکستان کے گھر گھر میں چراغ روشن ہیں پاک فوج ہمارا حوصلہ ہمارا وقار ہے وہ تمام تر خطرات اور دشواریوں کے باوجود اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرنے میں مصروف ہے اور ہر محاذ پر ملک کا دفاع کر رہی ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ خالد بن ولید، طارق بن زیاد اور ٹیپو سلطان اسی قوم کے فرزند تھے جنہوں نے دشمنوں کو شکست فاش دی تھی ہم وقت کے دھارے میں بہہ رہے تھے شاید کچھ دیر کے لیے غافل ہو گئے تھے لیکن آج بھی ہمارے درمیان خالد بن ولید طارق بن زیاد اور ٹیپو سلطان موجود ہیں جو اسلام اور وطن کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری پاک فوج اس منجدھار سے بھی ملک کو نکال کر لے جائے گی اور آپریشن ضرب عضب کامیاب ہوگا۔

لڈی بارکے

مشتاق احمد قریشی

یوں تو ان کا نام آپا فاطمہ تھا لیکن شاید ان کے بزرگوں نے انہیں پیار سے فطو کہہ کر پکارا ہوگا تو اب وہ جگت آپا فطو ہوگئی تھیں۔ محلہ بھر میں ان کی بڑی پرسش اور عزت تھی وہ ہر کسی کے دکھ درد میں تو کام آتی ہی تھیں کسی دکھ کی گھڑی میں بھی سراپا شفقت بن جاتیں حالانکہ ان کے شوہر بھائی فیضو (جن کا نام فیض محمد تھا) ان کی ان سرگرمیوں کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ سو ان کے گھر میں ہر روز تُو تُو میں میں رہتی، بھائی فیض کو شکوہ تھا کہ جتنا وخت تم دوسروں کے کام کرتی ہو اگر اس کا آدھا وخت اپنے گھر کو دو تو گھر جنت بن جائے لیکن ان کے کان پر تو جوں تک نہیں رینگتی تھی بس وہ دنیا بھر کا درد اپنے سینے میں سمیٹے رہتیں اپنے گھر کا گھروایا انہیں نظر ہی نہ آتا۔ بھائی فیضو ہمیشہ انہیں روکتے ٹوکتے رہتے محلے میں ان کی بڑی عزت تھی ہر کوئی انہیں آپا فطو کے میاں کی حیثیت سے جانتا تھا۔ یہ بات بھی ان کے لیے کسی گالی سے کم نہیں تھی کہ لوگ ان کی شناخت ان کی اہلیت کے حوالے سے نہ کریں۔ بالآخر ایک روز وہ پھٹ پڑے اور آپا فطو کے وہ لتے لیے کہ اللہ کی پناہ، کیا خوب چخ چخ ہوئی جب بھائی فیض کا چیخ چیخ کر گلا جواب دے گیا تو غصے سے پیر پٹختے باہر چل دے۔ آپا فطو پہلے تو خاموشی سے میاں کی گل افشانی سنتی رہیں پھر سوچنے لگیں کہ آخر میاں جی نے ایسی کون سی مرچیں چبار کھی تھیں کہ جامے سے ہی باہر ہوئے چلے جارہے تھے۔ یوں آپا فطو بھی بولنے میں اور چلانے میں کسی سے کم نہ تھیں لیکن آج جانے کیوں میاں کے سامنے بولتی بند ہوگئی تھی یا تو یہ بات کہ اب تک ہمیشہ وہی بولتی رہتی تھیں شاید پہلی بار آج میاں کو غصہ آیا تھا تو وہ خاموشی سے سنتی رہیں ویسے بھی ان کا قول تھا کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔ میاں جب رات گئے لوٹے تو ایک ہاتھ میں موتیے کا گجرا تھا اور دوسرے میں دودھ کا اخورہ جس پر موٹی ملائی کی تہہ تیر رہی تھی۔ انہوں نے بھی میاں کو راضی کرنے کے لیے قورمہ جو ان کو بہت ہی پسند تھا تیار کر رکھا تھا یعنی دونوں طرف صلح کی جھنڈی لہرا رہی تھی۔ بھائی فیضو ابھی آکر بیٹھے ہی تھے کہ ان کی ناک میں قورمے کی خوشبو ان کے مزاج میں شگفتگی پیدا کررہی تھی انہوں

نے پوری طرح دم بھی نہیں لیا تھا کہ محلہ سے بھائی غلاموں (ان کا نام غلام احمد تھا) کے گھر سے ان کا لونڈا شدّن (غالباً اس کا نام شاہد رہا ہوگا) لیکن اسے خود بھی اپنے نام کی خبر نہیں تھی۔ وہ خود بھی اپنا نام شدّن ہی بتایا کرتا تھا آتے ہی زور زور سے بولنے لگا اے بی خالہ ذلدی چلو اماں کی طبیعت خراب ہو رہی ہے، آپا نے کہا ہے کہ ذلدی سے دائی جنائی کو لے کر لپکتے ہوئے پہنچو۔ آپا فطو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ برقع چندیا پر ڈال دروازے کی طرف دوڑ پڑیں میاں فیضو لاکھ چلاتے رہے ارے نیک بخت یہ دودھ کا اخورہ تو پیتی جا جانے کب تلک تیری جان نہ چھوڑے، آپا فطو نے سنی ان سنی کرتے ہوئے قدم دروازے سے باہر رکھا اور شدّن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بولیں ارے جا ذلدی سے دائی سعیدن کو لے کر اپنے گھر پہنچ، میں تیرے گھر پہنچ جاؤں گی چل ذلدی دوڑ کر جا شاباس اور خود لپک چھپک بھائی غلاموں کے گھر کی طرف چل دیں ساتھ ساتھ بڑبڑاتی بھی جا رہی تھی اللہ خیر کرے۔ اب کے سکینہ کے ہاں تیئں تڑا بچہ ہے (تیسرا) اللہ خیر کرے پہلے بھی اس کی ایک بہن ہٹ چکی ہے۔

ادھر گھر میں بیٹھے بھائی فیضو بل کھا رہے تھے وہ دن بھر منصوبہ بندی کرتے رہے تھے کہ گھر پہنچ کر اپنی جوجا (زوجہ) کو کس طریوں منانا ہے۔ اس سبب سے ہی وہ گلو پھولن والے سے موتیا کا گجرا اور نامن دودھ والے سے دودھ کا اخورہ لیتے آئے تھے لیکن سب کیے کرائے پر غلامو کی گھر والی نے پانی پھیر دیا اسے بھی ابھی درد اٹھنے تھے سارا منہ ہی کر کرا کر دیا تھا۔ پھر ان کی سوچ کا دھارا اپنی بیگم کی طرف مڑ گیا جس کی گود چالیس سال گزرنے پر بھی اب تک ہری نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کی اس تنہائی نے ہی اسے یوں در بدر کر رکھا تھا۔ اس نے بھی دنیا جہاں کا درد اپنے سینے میں پال رکھا تھا شاید یونہی وہ اپنی اولاد نہ ہونے کے غم کو کم کرتی ہو ایک ٹھنڈی لمبی سانس کھینچ کر بھائی فیضوں نے چارپائی پر پاؤں پسارے اور نیند کی وادی میں کھوتے چلے گئے وہ یہی سوچتے رہے کہ اور بھی غم ہے زمانے میں۔